مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، یونیورسٹی آف جموں، جموں

خودآموز مواد

ایم۔اے اردو

سمسٹر سوم

مضمون: مطالعہ نظم جدید

یونٹ: I - IV

کورس نمبر:303

اسباق: 1۔19

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک

کورس کوآرڈی نیٹر، ایم اے اردو، سی، ڈی، او، ای

صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ اسسٹنٹ پروفیسر

انچارج ٹیچر، اردو

سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں

© جملہ حقوق محفوظ ہیں۔اس کتاب کا کوئی حصہ کسی شکل میں جموں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

زیر اہتمام مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ پی جی کالج راجوری

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموّں

اڈیٹنگ/ پروف ریڈنگ

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں۔

استقبالیہ پیغام

عزیز متعلّم!

سمسٹر سوم کے کورس ''مطالعہ نظم جدید'' میں آپ کا خیر مقدم ہے۔ یہ کورس آپ کو اردو نظم کی جدید روایت، اس کے فکری وفنی ارتقا اور بدلتے ہوئے ادبی رجحانات سے روشناس کرانے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے کے ذریعے آپ جدید اردو نظم کے پس منظر، اہم شعرا اور ان کی شعری خصوصیات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ اس کورس میں جدید نظم کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے جدید نظم کے مختلف ادوار اور رجحانات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ جدید نظم کی تشکیل میں بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور فکری حالات کے اثرات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ جدید نظم کے اسلوب، موضوعات اور ہیئت میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ اس کتاب کے ذریعے آپ جدید اردو نظم کے اہم شعرا اور ان کے کلام سے واقف ہوں گے۔ حالی، محمد حسین آزاد، اقبال، اکبر الہ آبادی، چکبست، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دیگر اہم شعرا کی نظموں کے مطالعے کے ذریعے جدید نظم کے مختلف فکری اور فنی پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ یہ کورس آپ کو جدید نظم میں قومی، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور انسانی مسائل کی عکاسی سے بھی روشناس کرائے گا۔ ساتھ ہی جدید نظم کی مختلف ہیئتی اور فنی خصوصیات، علامت، تشبیہ، استعارہ، پیکر تراشی اور دیگر شعری وسائل کے مطالعے کے ذریعے آپ جدید نظم کی معنوی گہرائی اور فنی ساخت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

مجھے امید ہے کہ اس خود آموز مواد (Self Learning Material) کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے آپ جدید اردو نظم کے تاریخی پس منظر، اہم شعرا، نصاب میں شامل نظموں کے متن کی تدریس، فکری رجحانات اور فنی خصوصیات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ مزید معلومات اور بہتر تفہیم کے لیے متعلقہ حوالہ جاتی کتب کے ساتھ ساتھ، مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم کے کتب خانے میں موجود مواد سے متعلقہ تنقیدی وتحقیقی ادبیات سے بھی استفادہ کریں۔

آپ کی علمی ترقی اور کامیابی کے لیے نیک خواہشات۔

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم
جموں یونیورسٹی، جموں

Syllabus and Courses of Studyin the Subject of Urdu under NON-CBCS Scheme (CDOE)

SEMESTER- III

COURSE CODE URD-303

Examination to be held in December 2025,2026 and 2027

Title: Study of Nazm-E-Jadeed مطالعہ نظم جدید
Duration of Examination: 2:30 hours

Credits:4
Maximum Marks: 100
(a) Semester Exam: 70
(b) Internal Assessment: 30

Objectives:

The purpose of this course is to make the students familiar with thematic and formative experiments that draw a line of demarcation between the pre and post mutiny (1857) Urdu Poetry. An effort shall particularly be made to acquaint them with the entire process of its development taken place during the post mutiny period.

UNIT-I

نظم جدید اور تحریکات

۱۔ جدید نظم کا ارتقاء

۲۔ انجمن پنجاب اور نظم جدید

۳۔ ترقی پسند تحریک اور نظم جدید

UNIT-II

نظموں کے متن کی تدریس

۱۔ آدمی نامہ۔نظیر اکبرآبادی

۲۔ مناجات بیوہ۔حالی

۳۔ کرزن سبھا۔اکبرالہ آبادی

۴۔ خضرِ راہ۔علامہ اقبال

۵۔ کسان۔جوش

۶۔ علم۔تلوک چند محروم

UNIT-III

نظمِ جدید اور نئے رجحانات

۱۔ حلقۂ ارباب ذوق اور نظمِ جدید

۲۔ جدیدیت اور نظمِ جدید

۳۔ مابعد جدیدیت اور نظمِ جدید

۴۔ اُردو نظم۔ہیئت کے تجربے (آزاد نظم، نظمِ معریٰ، ہائیکو، ترائیلے، ترویٰنی)

UNIT-IV

نظموں کے متن کی تدریس

۱۔ صبح آزادی۔فیض احمد فیض

۲۔ چارہ گر۔مخدوم محی الدین

۳۔ سمندر کا بلاوا۔میراں جی

۴۔ حسن کوزہ گر۔ن۔م۔راشد

۵۔ بازِ آمد۔اختر الایمان

۶۔ عہدِ حاضر کی دلرُبا مخلوق۔شہریار

Internal Assessment carry 30% marks in each course. The format of the Internal Assessment Assignments is given below:

ASSIGNMENT 1: Long Answer Questions

Two questions: one each from Unit I and Unit II shall be given. And the learner has to attempt any one question in 800-1000 words. (15 marks)

Assignment 2: Short Answer Questions

Three questions: one each from Unit III, Unit IV and unit V shall be given. And the learner has to attempt any two questions one from unit III, Unit IV and one from unit V in 350-450 words. (7.5x2=15)

Mode of Examination:-

There are four units in the course No:-303

Mode of the examination:-The term end examination shall carry 70% marks in each course the format of the question paper is given below.

Term End Examination would be of 70 marks. Two short type questions from Unit I and II having 7 marks each be asked. Two descriptive type questions from Unit III and IV of 14 marks each be asked. Two short type questions from Unit III and IV having 7 marks each be asked. 14 objectives type questions of 14 marks carrying 1 mark each be also asked from Unit III and IV.

Books Recommended. امدادی کُتب

۱۔ انتخاب نظیر اکبر آبادی۔مرتبہ رشید حسن خاں۔مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ

۲۔ مجموعہ نظم حالی۔مرتبہ ظہیر احمد صدیقی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ

۳۔ بانگ درا۔اقبال۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ

۴۔ گنج معانی،تلوک چند محروم۔مرتبہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔انجمن ترقی اُردو ہند اُردو گھر

۵۔ سیف وسبو۔جوش ملیح آبادی۔جوش ملیح آبادی۔مرتبہ پروفیسر فضل امام۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ

۶۔ انتخاب اکبر الہ آبادی۔مرتبہ۔صدیق الرحمٰن قدوائی۔جیبی کتابیں۔جامعہ نگر نئی دہلی۔

۷۔ کُلیات اکبر۔اکبر الہ آبادی

۷۔ کلامِ فیض۔فیض احمد فیض۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

۸۔ کلیاتِ مخدوم محی الدین۔مرتبہ۔فاروق ارگلی۔فرید بُکڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دہلی

۹۔ کُلیاتِ میراجی۔مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔بسمہ کتاب گھر دہلی

۱۰۔ انتخاب کلیاتِ ن۔م۔راشد۔مرتبہ۔مرغوب علی۔تخلیق کار پبلشرز۔دہلی

۱۱۔ اختر الایمان مقام اور کلام۔مرتبہ۔ڈاکٹر محمد فیروز۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

۱۲۔ آزادی کے بعد اُردو نظم (ایک انتخاب)۔مرتب۔شمیم حنفی، مظہر مہدی۔قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

Books Recommended.

۱۔ اُردو شاعری کا مزاج۔ڈاکٹر وزیر آغا

۲۔ جدید اُردو نظم اور یوروپی اثرات۔پروفیسر حامدی کشمیری

۳۔ نظم جدید کی کروٹیں۔ڈاکٹر وزیر آغا

۴۔ اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے۔ڈاکٹر عنوان چشتی

۵۔ فیض احمد فیض روایت اور انفرادیت۔پروفیسر نصرت چوہدری

فہرست ابواب

باب۔I نظم جدید اور تحریکات

سبق1۔ جدید نظم کا ارتقاء 9

سبق2۔ انجمن پنجاب اور نظم جدید 30

سبق3۔ ترقی پسند تحریک اور نظم جدید 50

باب۔II نظموں کے متن کی تدریس

سبق4۔ آدمی نامہ۔ نظیر اکبرآبادی 75

سبق5۔ مناجات بیوہ۔ حالی 98

سبق6۔ کرزن سبھا۔ اکبرالہ آبادی 132

سبق7۔ خضر راہ۔ علامہ اقبال 146

سبق8۔ کسان جوش 169

سبق9۔ علم تلوک چند محروم 190

باب۔III نظم جدید اور نئے رجحانات

سبق10۔ حلقہ ارباب ذوق اور نظم جدید 212

سبق11۔ جدیدیت اور نظم جدید 232

سبق12۔ مابعد جدیدیت اور نظم جدید 250

سبق13۔ اردو نظم۔ہئیت کے تجربے-آزادنظم،نظم معرٰی، ہائیکو،ترائیلے،ترو ینی) 269

باب۔IV نظموں کے متن کی تدریس

سبق14۔ صبح آزادی فیض احمد فیض 288

سبق15۔ چارہ گر مخدوم محی الدین 303

سبق16۔ سمندر کا بلاوہ میراں جی 317

سبق17۔ حسن کوزہ گر ن۔م۔راشد 334

سبق18۔ بازآمد اختر الایمان 361

سبق19۔ عہد حاضر کی دلربا مخلوق شہریار 382

سبق نمبر 1 جدید نظم کا آغاز وارتقاء

ساخت

1.0 اغراض ومقاصد

1.1 تعارف

1.2 نظم:تعریف اور اقسام

1.2.1 جدید نظم سے قبل اردو نظم

1.2.2 جدید نظم کا آغاز وارتقاء

1.2.3 سرگرمی:1 آؤ اپنی معلومات جانچیں

1.3 عمومی جائزہ

1.4 فرہنگ

1.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1.6 مشقی سوالات

1.7 مشقی سوالات کے جوابات

1.8 جوابات سرگرمی اور

1.9 امدای کتب

1.0: اغراض ومقاصد

عزیز متعلم! جدید نظم کے ارتقاء کے مطالعے کا بنیادی مقصد اردو شاعری میں رونما ہونے والی فکری، فنی اور اسلوبی تبدیلیوں کو سمجھنا ہے۔ ہمارا اس سبق کے ذریعے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اردو نظم نے کس طرح روایتی شعری تصورات اور کلاسیکی اسالیب سے آگے بڑھ کر جدید زندگی کے مسائل، بدلتے ہوئے سماجی حالات، سیاسی شعور، معاشرتی کشمکش اور انسانی جذبات واحساسات کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس مطالعے کا ایک اہم مقصد جدید نظم کے مختلف ارتقائی مراحل، اس کے نمایاں رجحانات اور اہم شعرا کے فنی وفکری کارناموں کا جائزہ لینا بھی ہے۔ اس کے ساتھ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ مغربی افکار، جدید تعلیم، سائنسی ترقی، صنعتی انقلاب، قومی تحریکوں اور برصغیر کے بدلتے ہوئے سیاسی وسماجی حالات نے اردو نظم کی ہیئت، موضوعات اور طرزِ اظہار کو کس طرح متاثر کیا۔ جدید نظم کے مطالعے سے طلبہ میں تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ نظم کو صرف شعری اظہار کے بجائے اپنے عہد کے فکری اور تہذیبی شعور کی ترجمان کے طور پر سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

1.1: تعارف

عزیز متعلم! اردو شاعری کی طویل روایت میں نظم کو ایک اہم اور مؤثر صنفِ سخن کی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ اردو شاعری میں ابتدا ہی سے مختلف موضوعات کو نظم کی صورت میں پیش کرنے کی روایت موجود رہی ہے، لیکن جدید دور میں نظم نے ایک نئی فکری اور فنی صورت اختیار کی۔ جدید نظم دراصل اس شعری شعور کی نمائندہ ہے جو بدلتے ہوئے زمانے، نئے سماجی مسائل، سیاسی حالات، معاشرتی تبدیلیوں اور انسان کے باطن میں پیدا ہونے والی نئی کیفیات کے اظہار کی ضرورت سے وجود میں آیا۔ اس دور کے شاعر نے فقط ماضی کے تجربات اور روایتی موضوعات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور زندگی کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔

اردو میں جدید نظم کے ارتقاء کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہونے والی سماجی، سیاسی اور تعلیمی تبدیلیوں کے پس منظر میں ہوا۔ سرسید تحریک، جدید تعلیم، مغربی افکار اور قومی ومعاشرتی بیداری نے اردو ادب کی فکری سمت کو تبدیل کیا۔ اس تبدیلی کا گہرا اثر نظم پر بھی پڑا۔ الطاف حسین حالؔی نے نظم کو زندگی، اخلاق، اصلاحِ معاشرہ اور قومی شعور سے وابستہ کیا اور اردو نظم کو ایک نئے مقصد اور سمت سے آشنا کیا۔ ان کے بعد محمد حسین آزادؔ اور دیگر شعراء نے بھی نظم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی میں اقبالؔ، چکبستؔ، جوشؔ، فیضؔ، ن۔م۔ راشدؔ، میراجیؔ اور دیگر شعراء نے جدید نظم کو مزید وسعت دی اور اس میں قومی، انقلابی، سماجی، رومانوی، فلسفیانہ اور نفسیاتی موضوعات شامل کیے۔

وقت گزرنے کے ساتھ جدید نظم نے روایتی پابندیوں سے آزادی حاصل کی اور نظمِ معرّیٰ، آزاد نظم اور نثری نظم جیسی نئی صورتیں وجود میں آئیں۔ اس طرح جدید نظم صرف موضوع کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ہیئت، زبان، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے بھی مسلسل تبدیلی سے گزرتی رہی۔ یہی ارتقائی عمل جدید نظم کو اردو ادب کی ایک زندہ، متحرک اور ہمہ گیر صنف بناتا ہے، جو اپنے عہد کے انسان کے احساسات، مسائل، خوابوں، محرومیوں اور فکری کشمکش کی مؤثر ترجمانی کرتی ہے۔

1.2: نظم: تعریف اور اقسام

نظم اردو شاعری کی ایک نہایت اہم، قدیم اور ہمہ گیر صنف ہے۔ اردو ادب میں نظم نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں، جذبات و احساسات، فطرت، معاشرت، سیاست، فلسفہ، اخلاق، مذہب، قوم اور وطن کے مسائل کے اظہار کے لیے ایک مؤثر وسیلہ فراہم کیا ہے۔ غزل کے مقابلے میں نظم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاعر کسی ایک مرکزی خیال یا موضوع کو تسلسل اور ربط کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ نظم کے تمام اشعار یا مصرعے ایک دوسرے سے معنوی طور پر مربوط ہوتے ہیں اور پوری نظم مل کر ایک مکمل تاثر پیدا کرتی ہے۔ لغوی اعتبار سے لفظ ''نظم'' عربی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی موتیوں کو ایک دھاگے میں پرونے، ترتیب دینے اور باہم مربوط کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شاعری میں نظم سے مراد ایسی شاعری ہے جس میں کسی خاص خیال، موضوع، واقعے، جذبے یا تجربے کو ایک مربوط اور مسلسل انداز میں شعری قالب میں پیش کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں کسی مرکزی خیال کو شعری ترتیب، تسلسل، ربط اور وحدتِ تاثر کے ساتھ بیان کرنا نظم کہلاتا ہے۔ نظم میں شاعر کے خیالات منتشر نہیں ہوتے بلکہ ایک بنیادی نقطۂ نظر کے تحت آگے بڑھتے ہیں اور اختتام تک ایک مکمل معنوی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت ''وحدتِ خیال'' ہے۔ شاعر پوری نظم میں ایک بنیادی خیال کو مرکز بناتا ہے اور اسی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ''تسلسل'' اور ''ربط'' بھی نظم کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ نظم کے ایک شعر یا بند کا تعلق دوسرے شعر یا بند سے قائم رہتا ہے۔ یہی باہمی تعلق نظم کو ایک مربوط وحدت بناتا ہے۔ نظم کا مقصد محض چند خوب صورت اشعار پیش کرنا نہیں بلکہ ایک مکمل خیال یا کیفیت کو قاری تک مؤثر انداز میں پہنچانا ہوتا ہے۔ نظم کا فن دراصل فکر، جذبے اور تخیل کو ایک مربوط اور خوب صورت شعری پیکر میں ڈھالنے کا فن ہے۔ شاعر کسی موضوع کا انتخاب کرتا ہے اور پھر اپنے تخیل، مشاہدے اور تجربے کی مدد سے اسے شعری صورت عطا کرتا ہے۔ ایک کامیاب نظم میں موضوع اور اظہار کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ شاعر موضوع کی نوعیت کے مطابق زبان، اسلوب، آہنگ، تشبیہ، استعارہ، علامت اور پیکر

تراشی سے کام لیتا ہے۔ اگر نظم کا موضوع قومی یا ملی ہو تو اس میں جوش اور ولولہ پیدا کیا جا سکتا ہے، اگر موضوع فطرت ہو تو منظر نگاری اور پیکر تراشی اہم ہو جاتی ہے، اور اگر موضوع فلسفیانہ ہو تو فکر و استدلال کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

نظم کے فنی حسن میں زبان و بیان کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ ایسی زبان استعمال کرے جو موضوع اور جذبات کے مطابق ہو۔ بعض نظموں میں سادہ اور عام فہم زبان کے ذریعے گہری بات کہی جاتی ہے، جب کہ بعض نظموں میں علامتی، استعاراتی اور فلسفیانہ زبان استعمال ہوتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ساخت، صوتی آہنگ اور شعری پیکر نظم کی تاثیر میں اضافہ کرتے ہیں۔ نظم کا اسلوب بھی شاعر کی انفرادیت کا مظہر ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے ایک شاعر دوسرے شاعر سے ممتاز ہوتا ہے۔

نظم میں تخیل اور پیکر تراشی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ شاعر اپنے خیال کو محض براہِ راست بیان کرنے کے بجائے اسے تشبیہ، استعارے، علامت اور تصویری کیفیت کے ذریعے زیادہ مؤثر بنا سکتا ہے۔ ایک اچھا شاعر مجرد خیال کو بھی اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ قاری کے ذہن میں ایک واضح تصویر یا کیفیت پیدا کر دے۔ اسی طرح منظر نگاری نظم میں فطرت، معاشرے یا کسی واقعے کو جیتی جاگتی تصویر میں تبدیل کر دیتی ہے۔

موسیقیت اور آہنگ بھی نظم کے فنی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ پابند نظم میں شاعر بحر، وزن، قافیہ اور ردیف کی پابندی کرتا ہے، جس سے نظم میں صوتی حسن پیدا ہوتا ہے۔ تاہم جدید دور میں نظم نے ہیئتی اعتبار سے بڑی وسعت اختیار کی ہے۔ آزاد نظم میں شاعر کو قافیہ اور ردیف کی پابندی سے بڑی حد تک آزادی حاصل ہوتی ہے، جب کہ نثری نظم میں وزن اور روایتی شعری ہیئت کی پابندی بھی ضروری نہیں رہتی۔ اس کے باوجود اچھی نظم میں داخلی آہنگ، لفظوں کی موسیقیت اور معنوی ربط موجود رہتا ہے۔

اردو نظم کی تاریخ بہت وسیع اور ارتقائی نوعیت کی ہے۔ ابتدائی اردو شاعری میں نظم کی مختلف صورتیں موجود تھیں، لیکن جدید اردو نظم کو باقاعدہ فروغ انیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ اردو نظم کی جدید تشکیل میں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالؔی کا کردار نہایت اہم ہے۔ حالؔی نے شاعری کو زندگی، معاشرے، اخلاق اور قومی مسائل سے جوڑنے کی کوشش کی اور اردو نظم کو ایک نئے مقصد اور شعور سے آشنا کیا۔ اس کے بعد اقبالؔ نے نظم کو فلسفیانہ، قومی، ملی اور روحانی افکار کے اظہار کا مؤثر وسیلہ بنایا۔ اکبر الہ آبادی نے سیاسی اور معاشرتی طنز کو نظم کا موضوع بنایا، جب کہ جوش ملیح آبادی نے جوش، ولولے اور انقلابی جذبات کو شعری اظہار عطا کیا۔ بعد میں ن۔م۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان جیسے شعراء نے جدید نظم کو نئے موضوعات، نئے اسلوب اور نئی ہیئتوں سے مالا مال کیا۔

موضوع کے اعتبار سے نظم کی کئی اقسام ہیں۔ قومی نظم میں قوم، قومی شعور، قومی وحدت اور قومی مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ وطنی نظم

میں وطن سے محبت، وطن کی خوب صورتی، آزادی اور قومی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ عشقیہ نظم میں محبت اور عشق کے مختلف جذبات و کیفیات بیان کیے جاتے ہیں۔ فطری نظم میں قدرت، موسموں، پھولوں، پہاڑوں، دریاؤں، بارش، سورج، چاند اور فطرت کے دوسرے مظاہر کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ اخلاقی نظم میں اخلاقی اقدار، نیکی، سچائی، انسان دوستی اور کردار سازی پر زور دیا جاتا ہے۔ فلسفیانہ نظم میں زندگی، موت، وجود، کائنات، انسان اور حقیقت جیسے بنیادی سوالات پر غور کیا جاتا ہے۔ سیاسی اور سماجی نظموں میں معاشرے کے مسائل، سیاسی حالات، ظلم، استحصال، غربت، طبقاتی فرق اور انسانی حقوق جیسے موضوعات کو شعری انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ مذہبی اور صوفیانہ نظموں میں خدا، رسولِ اکرم ﷺ، روحانیت، تصوف اور اخلاقی و روحانی اقدار کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح رزمیہ نظم میں جنگ، بہادری، شجاعت اور قومی کارناموں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے بھی اردو نظم کی مختلف صورتیں ہیں۔ پابند نظم وہ نظم ہے جس میں شاعر بحر، وزن، قافیہ اور بعض اوقات ردیف کی پابندی کرتا ہے۔ ایسی نظم میں روایتی شعری اصولوں کی پابندی نمایاں ہوتی ہے۔ آزاد نظم جدید اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے جس میں شاعر کو قافیہ اور ردیف کی پابندی سے آزادی حاصل ہوتی ہے، تاہم نظم میں ایک داخلی آہنگ اور شعری وحدت موجود رہتی ہے۔ نثری نظم میں روایتی وزن اور بحر کی پابندی نہیں ہوتی اور شاعر نثر کے قریب زبان میں شعری کیفیت، تخیل، علامت اور تاثر پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی، مسدس، مخمس، ترجیع بند، ترکیب بند، رباعی اور دیگر شعری ہیئتیں بھی نظم کی مختلف صورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

مثنوی میں عام طور پر کسی قصے، داستان، عشق یا واقعے کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، جب کہ اگلے شعر کا قافیہ بدل جاتا ہے۔ مسدس میں ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اردو میں حالی کی ''مدوجزرِ اسلام'' یا ''مسدسِ حالی'' اس ہیئت کی ایک مشہور مثال ہے۔ ترجیع بند میں ہر بند کے بعد ایک ہی شعر یا مصرعے کی تکرار ہوتی ہے، جب کہ ترکیب بند میں ہر بند کے آخر میں مختلف شعر آتا ہے۔ اس طرح مختلف ہیئتوں نے اردو نظم کے اظہار کو وسعت اور تنوع عطا کیا ہے۔

نظم اور غزل میں بنیادی فرق بھی قابلِ ذکر ہے۔ غزل میں ہر شعر عموماً اپنی جگہ ایک مکمل خیال یا مضمون پیش کرتا ہے، جب کہ نظم میں تمام اشعار کسی مرکزی خیال سے وابستہ ہوتے ہیں۔ غزل میں حسن، عشق، ہجر، وصال، تصوف اور زندگی کے مختلف تجربات الگ الگ اشعار میں سامنے آ سکتے ہیں، لیکن نظم میں شاعر کسی ایک موضوع یا خیال کو ابتدا سے انتہا تک ترقی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے نظم میں وحدتِ خیال، تسلسل اور ربط زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ جدید دور میں نظم کے موضوعات اور فنی امکانات میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوئی ہے۔ جدید شاعر نے صرف عشق اور فطرت کو موضوع نہیں بنایا بلکہ فرد کی تنہائی، شہری زندگی، سیاسی جبر، طبقاتی کشمکش، جنگ، غربت، بے روزگاری، معاشرتی بے حسی، عورت کے

مسائل، انسانی آزادی، وجودی بحران اور تہذیبی زوال جیسے مسائل کو بھی نظم کا حصہ بنایا۔ جدید نظم میں علامت اور استعارے کا استعمال بھی بڑھا ہے اور شاعر بعض اوقات براہِ راست بات کہنے کے بجائے علامتی انداز اختیار کرتا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظم اردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں شاعر کسی مرکزی خیال، موضوع، جذبے یا تجربے کو ربط، تسلسل اور وحدتِ تاثر کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ نظم کا فنی حسن صرف الفاظ کی خوب صورتی میں نہیں بلکہ خیال کی گہرائی، جذبے کی شدت، تخیل کی بلندی، زبان کی شائستگی، اسلوب کی انفرادیت، پیکر تراشی، علامت، آہنگ اور فنی ربط میں پوشیدہ ہے۔ اردو نظم نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی ہیئت اور موضوعات دونوں میں تبدیلیاں قبول کی ہیں اور آج یہ انسانی زندگی کے تقریباً ہر پہلو کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وسعت اور ہمہ گیری نظم کو اردو ادب کی ایک اہم، مؤثر اور زندہ صنف بناتی ہے۔

1.2.1: جدید نظم سے قبل اردو نظم

اردو شاعری کی تاریخ میں نظم کو ایک بنیادی اور اہم صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ غزل نے اردو شاعری میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور طویل عرصے تک اردو شعری مزاج پر غالب رہی، تاہم نظم بھی ابتدا ہی سے اردو شاعری کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ اردو نظم نے مختلف ادوار میں اپنے موضوعات، اسلوب، ہیئت اور فکری رجحانات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ جدید نظم کے ظہور سے قبل اردو نظم ایک طویل ارتقائی سفر طے کر چکی تھی۔ اس سفر میں مذہبی، اخلاقی، عشقیہ، صوفیانہ، رزمیہ، داستانوی، قومی اور اصلاحی موضوعات کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو شعری اظہار کا وسیلہ بنایا گیا۔ اردو نظم کی ابتدائی صورتیں دکنی دور میں نمایاں ہوتی ہیں۔ دکن میں اردو شاعری نے جب باقاعدہ ادبی صورت اختیار کی تو اس میں مذہبی اور صوفیانہ موضوعات کے ساتھ داستانوی اور عشقیہ عناصر بھی شامل تھے۔ اس دور کے شعراء نے مثنوی کی صنف کو خاص طور پر فروغ دیا۔ مثنوی چونکہ طویل داستان، عشق، تصوف اور مختلف واقعات کو بیان کرنے کے لیے موزوں تھی، اس لیے دکنی شعرا نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ ملا وجہی کی ''قطب مشتری''، نصرتی کی ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' اور دیگر مثنویاں اس دور کی نظم کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان تخلیقات میں قصہ گوئی، منظر نگاری، عشق، تصوف اور تہذیبی زندگی کے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یوں اردو نظم کے ابتدائی دور میں بیانیہ اور داستانوی انداز بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔

شمالی ہند میں اردو ادب کے فروغ کے ساتھ نظم کے موضوعات اور ہیئتوں میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اٹھارہویں صدی میں اردو شاعری

پر فارسی شعری روایت کا گہرا اثر تھا۔ اس زمانے میں غزل کو اگرچہ مرکزی مقام حاصل تھا، لیکن قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، شہر آشوب، ہجو اور دیگر اصناف بھی شعری اظہار کا اہم ذریعہ تھیں۔ خصوصاً شہر آشوب نے معاشرتی اور سیاسی حالات کی عکاسی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس صنف میں شہر کی تباہ حالی، معاشی بدحالی، سیاسی انتشار اور معاشرتی زوال کو موضوع بنایا گیا۔ یوں نظم محض عشقیہ اور داستانوی اظہار تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں اجتماعی زندگی کے مسائل بھی جگہ بنانے لگے۔

انیسویں صدی میں اردو نظم نے ایک نئی سمت اختیار کی۔ اس دور میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال، برطانوی اقتدار کا استحکام، 1857ء کی جنگ آزادی اور اس کے بعد پیدا ہونے والی سیاسی و معاشرتی صورتِ حال نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان حالات نے شاعروں کو زندگی کے حقیقی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ نظم میں قومی، سیاسی اور معاشرتی شعور پیدا ہونے لگا۔ اس دور میں مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ جیسی قدیم اصناف کے ساتھ ساتھ ایسی شاعری بھی سامنے آئی جس میں بدلتے ہوئے معاشرے کی ترجمانی کا رجحان نمایاں تھا۔ اردو نظم کی تاریخ میں نظیر اکبرآبادی کا مقام نہایت اہم ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو زندگی کے عام اور روزمرہ موضوعات سے جوڑا۔ ان کی شاعری میں عام انسان، اس کی خوشیاں، غم، ضروریات، تہوار، میلوں، بازاروں اور معاشرتی زندگی کے مختلف مظاہر نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ''آدمی نامہ''، ''بنجارہ نامہ''، ''روٹیاں''، ''مفلسی'' اور ہولی، دیوالی وغیرہ سے متعلق ان کی نظمیں اردو نظم کو روایتی عشقیہ اور خیالی دنیا سے نکال کر زندگی کی حقیقی دنیا میں لے آتی ہیں۔ نظیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے موضوعات کو محدود طبقے کے تجربات سے نکال کر عام انسان کی زندگی سے وابستہ کیا۔ اسی اعتبار سے انہیں جدید اردو نظم کا پیش رو بھی قرار دیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اردو ادب میں اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں کا اثر بڑھا۔ سرسید احمد خان کی تحریک نے مسلمانوں میں جدید تعلیم، سائنسی شعور اور سماجی اصلاح کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ اس ماحول میں ادب بھی اصلاح معاشرہ کا ذریعہ بننے لگا۔ حالی نے اردو نظم کو اس نئے فکری شعور سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی ''مسدس مدوجزر اسلام'' اردو نظم کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالی نے شاعری کو زندگی، اخلاق، قوم اور معاشرے سے وابستہ کرنے پر زور دیا۔ ان کے نزدیک شاعری محض الفاظ کی آرائش یا جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ انسانی اور قومی زندگی کی اصلاح کا وسیلہ بھی ہے۔

حالی کی نظموں میں حقیقت نگاری، مقصدیت، قومی شعور، اخلاقی اصلاح اور انسانی ہمدردی نمایاں ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو محض روایتی عشقیہ مضامین سے نکال کر زندگی کے حقیقی مسائل سے جوڑنے کی کوشش کی۔ ''حب وطن''، ''برکھارت''، ''مناظرہ رحم وانصاف'' اور ''چپ

کی داد'' جیسی نظموں میں مختلف موضوعات اور فکری پہلو سامنے آتے ہیں۔ حالی کی کوششوں سے اردو نظم میں مقصدیت اور اصلاحی شعور کو مضبوط بنیاد حاصل ہوئی۔

حالی کے بعد محمد حسین آزاد نے بھی اردو نظم کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ آزاد نے اردو شاعری میں فطرت نگاری، منظر نگاری اور سادہ و رواں زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعے انہوں نے اردو شاعری کو روایتی موضوعات اور مخصوص شعری ہیئتوں کی پابندی سے نکال کر فطرت اور زندگی کے قریب لانے کی کوشش کی۔ ان مشاعروں میں ایسی نظموں کی حوصلہ افزائی کی گئی جن میں فطرت، معاشرت اور حقیقی زندگی کی عکاسی ہو۔ اس طرح آزاد اور حالی کی کوششوں نے اردو نظم کے لیے ایک نئے راستے کی بنیاد فراہم کی۔

اردو نظم کے ارتقائی سفر میں اکبر الہ آبادی کا کردار بھی اہم ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں جدید تہذیب، مغربی تقلید، تعلیمی نظام، سیاسی صورتِ حال اور معاشرتی تبدیلیوں کو موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں روایتی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کے تصادم کی کیفیت نمایاں ہے۔ اکبر نے نظم کو طنز و مزاح کے ذریعے سماجی تنقید کا مؤثر وسیلہ بنایا۔ ان کے ہاں بدلتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کی تصویر بڑی شدت سے سامنے آتی ہے۔ اسی دور میں علامہ اقبال نے اردو نظم کو ایک بلند فکری اور فلسفیانہ سطح عطا کی۔ اقبال کی شاعری میں خودی، عمل، عشق، ملت، انسان، آزادی، حریت، اسلامی تہذیب اور مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''ترانہ ہندی''، ''ترانہ ملی''، ''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' جیسی نظموں نے اردو نظم کے دائرۂ فکر کو وسیع کیا۔ اقبال نے نظم کو محض کسی ایک واقعے یا جذبے کی ترجمانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے فلسفیانہ افکار اور اجتماعی شعور کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

جدید نظم کے ظہور سے پہلے اردو نظم میں ایک طرف کلاسیکی شعری روایت کی مضبوط گرفت موجود تھی تو دوسری طرف نئے فکری اور سماجی تقاضے بھی شدت سے محسوس کیے جا رہے تھے۔ ایک طرف مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب اور پابند نظم جیسی روایتی صورتیں موجود تھیں، دوسری طرف شاعر زندگی کے بدلتے ہوئے مسائل، قومی آزادی، سماجی اصلاح، فطرت، فرد کی داخلی کیفیت اور معاشرتی کشمکش کو شعری موضوع بنانے لگے تھے۔ اس طرح اردو نظم رفتہ رفتہ روایتی موضوعات اور اسالیب سے نکل کر نئے عہد کے شعور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک اردو نظم میں مقصدیت، قومی شعور، اصلاحی فکر، فطرت نگاری اور سماجی حقیقت نگاری کے رجحانات مضبوط ہو چکے تھے۔ اقبال کی بلند فکری شاعری نے نظم کو فلسفیانہ وسعت عطا کی، جبکہ حالی، آزاد اور ان کے رفقا نے نظم کو اصلاح معاشرہ اور حقیقت پسندانہ اظہار سے وابستہ کیا۔ اسی دوران مغربی ادب کے مطالعے، جدید تعلیم، سیاسی بیداری، صنعتی اور شہری زندگی کے فروغ اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں نے اردو

شاعری کے مزاج کو بھی متاثر کیا۔

یہ تمام عوامل آگے چل کر جدید اردو نظم کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں۔ چنانچہ جدید نظم اچانک وجود میں آنے والی کوئی بالکل نئی شعری صورت نہیں تھی بلکہ اردو نظم کے اسی مسلسل ارتقائی عمل کا اگلا مرحلہ تھی۔ نظیر اکبر آبادی کی عوامی زندگی سے وابستگی، حالی کی اصلاحی اور مقصدی شاعری، آزاد کی فطرت نگاری، اکبر کی سماجی طنز نگاری اور اقبال کی فکری و فلسفیانہ نظم گوئی نے جدید نظم کے لیے مختلف سطحوں پر بنیاد فراہم کی۔ بعد ازاں جدید نظم نے انہی تجربات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرد کی داخلی دنیا، نفسیاتی پیچیدگیوں، عصری مسائل، علامت، استعارے، ابہام اور نئے شعری اسلوب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

اس طرح جدید نظم سے قبل اردو نظم کی صورت حال کو ایک ایسے عبوری دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں قدیم شعری روایت اور جدید زندگی کے تقاضے باہم متصادم بھی تھے اور ایک دوسرے کو متاثر بھی کر رہے تھے۔ اردو نظم نے اس مرحلے میں اپنے موضوعات کا دائرہ وسیع کیا، عام انسانی زندگی کو اہمیت دی، قومی و سماجی شعور پیدا کیا، فطرت اور معاشرے کو موضوع بنایا اور فرد و ملت کے مسائل پر غور کیا۔ یہی ارتقائی سفر آگے چل کر جدید نظم کی تشکیل کا سبب بنا اور اردو شاعری کو ایک ایسے نئے عہد میں داخل کیا جہاں نظم انسانی زندگی کے خارجی مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے باطن، نفسیات اور پیچیدہ عصری تجربات کی بھی ترجمان بن گئی۔

1.2.2: جدید نظم کا آغاز و ارتقاء

اردو شاعری کی تاریخ میں جدید نظم کا آغاز ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن ادبی واقعہ ہے۔ اردو شاعری کی روایت اگرچہ صدیوں پر محیط ہے اور اس میں قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، غزل، واسوخت، شہر آشوب اور دوسری متعدد اصناف نے مختلف ادوار میں فروغ پایا، لیکن انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں شاعری کے مزاج، موضوعات اور فنی رویّوں میں جو بنیادی تبدیلی رونما ہوئی، اسی نے اردو میں جدید نظم کی بنیاد فراہم کی۔ جدید نظم دراصل کسی ایک ہیئت یا مخصوص فنی سانچے کا نام نہیں بلکہ ایک نئے شعور، نئے طرزِ احساس اور زندگی کے نئے تقاضوں سے پیدا ہونے والے شعری رجحان کا نام ہے۔ اس نظم نے شاعری کو روایتی مضامین، مخصوص استعارات اور تقلیدی انداز سے نکال کر فطرت، معاشرت، قوم، اخلاق، وطن، انسانی زندگی اور عصری مسائل سے وابستہ کیا۔

اردو کی جدید نظم کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے انجمنِ پنجاب لاہور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی جدید نظم کی باقاعدہ

بنیاد انجمنِ پنجاب کی ادبی سرگرمیوں سے مستحکم ہوئی۔ انجمنِ پنجاب لاہور کا قیام 21 جنوری 1865ء کو عمل میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی ایک عظیم تبدیلی کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد ہندوستانی معاشرہ، بالخصوص مسلمانانِ ہند، شدید سیاسی اور تہذیبی بحران کا شکار تھے۔ ایک طرف صدیوں پرانی تہذیبی روایت تھی اور دوسری طرف مغربی تہذیب، انگریزی تعلیم اور جدید سائنسی علوم کے اثرات تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ایسے حالات میں نئی تعلیم، نئی فکر اور نئے علمی و ادبی اداروں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ انجمنِ پنجاب لاہور کا قیام بھی اسی نئے عہد کی علمی اور تہذیبی ضرورتوں کے تحت ہوا۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد محض ادبی مشاعروں کا انعقاد نہیں تھا بلکہ اس کے مقاصد بہت وسیع تھے۔ انجمن قدیم مشرقی علوم کی ترویج و اشاعت کی خواہاں تھی تاکہ برصغیر کے علمی اور تہذیبی ورثے کو محفوظ اور فروغ دیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں کے ذریعے عوام میں تعلیم کے فروغ کو بھی اہمیت دی گئی۔ انجمن کے پیشِ نظر صنعت اور تجارت کی ترقی بھی ایک بنیادی مقصد تھا۔ اس طرح انجمنِ پنجاب ایک ایسا علمی اور سماجی ادارہ تھا جس کے مقاصد تعلیم، تہذیب، معاشرت اور اقتصادی ترقی کے مختلف پہلوؤں سے وابستہ تھے۔

انجمنِ پنجاب کے ابتدائی انتظامی ڈھانچے میں بھی مختلف علمی اور سرکاری شخصیات نے کردار ادا کیا۔ انجمن کے پہلے صدر پنڈت من پھول تھے، بعد میں ڈاکٹر لائٹر اس کے صدر بنے۔ انجمن کے سرپرستوں میں پہلے میجر فلر شامل تھے اور بعد میں کرنل ہالرائیڈ اس کے سرپرست بنے۔ کرنل ہالرائیڈ اور ان کے رفقا نے انجمن کے قیام اور اس کی علمی سرگرمیوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ انگریزی حکومت کے بعض تعلیم یافتہ اہلکاروں کی سرپرستی اور ہندوستانی اہلِ علم کی شرکت نے انجمن کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کیا جہاں مشرقی روایت اور مغربی جدید شعور کے درمیان ایک نئے مکالمے کا آغاز ہوا۔ انجمنِ پنجاب کے ساتھ محمد حسین آزاد کا تعلق اردو ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ محمد حسین آزاد ایک ایسے ادیب، شاعر، نقاد اور دانش ور تھے جنھوں نے اردو ادب میں نئے شعور کی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انجمن کے قیام کے کچھ ہی عرصے بعد 16 فروری 1865ء کو منعقد ہونے والے انجمنِ پنجاب کے جلسے میں محمد حسین آزاد نے اپنا پہلا مضمون ''در باب رفعِ افلاس'' کے عنوان سے پڑھا۔ یہ واقعہ اس بات کی علامت تھا کہ آزاد ابتدا ہی سے انجمن کی علمی اور سماجی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

محمد حسین آزاد کی انجمنِ پنجاب سے وابستگی وقت گزرنے کے ساتھ مزید مضبوط ہوتی گئی۔ 1867ء میں انہیں انجمن کا سکریٹری اور لیکچرر مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت سے آزاد کو انجمن کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو منظّم کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب انجمنِ پنجاب کی سرگرمیوں نے اردو ادب، خصوصاً اردو شاعری، کی تاریخ میں ایک نئے دور کی بنیاد رکھنی شروع کی۔ محمد حسین آزاد کے ذہن میں اردو شاعری کے

بارے میں ایک نیا تصور موجود تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اردو شاعری کو محض ماضی کے مخصوص مضامین اور روایتی اسالیب تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے زندگی، فطرت اور گردوپیش کی حقیقتوں سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔

اس دور کے روایتی مشاعروں کا عمومی طریقہ یہ تھا کہ کسی مشاعرے کے لیے ایک مصرعِ طرح دیا جاتا تھا اور شعرا اس مصرع پر غزلیں کہتے تھے۔ اس طرزِ مشاعرے میں شاعر کی توجہ زیادہ تر مصرعِ طرح، قافیہ، ردیف اور روایتی غزل کے مضامین کی طرف رہتی تھی۔ نتیجتاً شاعری میں محبوب، عشق، ہجر و وصال، گل و بلبل، مے و مینا اور دوسرے روایتی مضامین بار بار دہرائے جاتے تھے۔ محمد حسین آزاد اور ان کے ہم خیال اہلِ علم کے نزدیک اردو شاعری کو اس محدود دائرے سے نکالنا ضروری تھا۔ اسی مقصد کے تحت انجمنِ پنجاب نے 20 مئی 1873ء کو ایک نہایت اہم اعلان کیا۔ انجمن نے فیصلہ کیا کہ اب مشاعروں میں مصرعِ طرح کے بجائے ایک مخصوص موضوع دیا جائے گا اور شعرا اسی موضوع پر نظمیں لکھ کر مشاعرے میں شرکت کریں گے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں یہ فیصلہ جدید نظم کے آغاز کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس فیصلے نے شاعر کو محض ایک مصرع کی پابندی سے آزاد کر کے ایک مکمل موضوع پر غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کیا۔

موضوعاتی مشاعروں کے اس طریقے نے اردو نظم کی ساخت اور مزاج دونوں کو تبدیل کیا۔ شاعر کو ایک مخصوص موضوع دیا جاتا اور وہ اسی موضوع کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے ایک مربوط نظم تخلیق کرتا۔ اس طریقے سے شاعری میں وحدتِ موضوع پیدا ہوئی، نظم کے مختلف حصوں کے درمیان ربط و تسلسل پیدا ہوا اور شاعر کو زندگی کے حقیقی مسائل سے وابستہ ہونے کا موقع ملا۔ یہی وہ بنیادی تبدیلی تھی جس نے اردو کی جدید نظم کی راہ ہموار کی۔ انجمنِ پنجاب لاہور کے زیرِ اہتمام پہلا موضوعاتی مشاعرہ 19 اپریل 1874ء کو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کا موضوع ''برسات'' تھا۔ اردو نظم کی تاریخ میں اس مشاعرے کی خصوصی اہمیت ہے کیونکہ یہاں سے جدید موضوعاتی نظم کا عملی آغاز ہوا۔ اس مشاعرے میں محمد حسین آزاد نے صرف شاعری ہی پیش نہیں کی بلکہ انہوں نے ''خیالات در بابِ نظم'' کے عنوان سے ایک اہم مضمون بھی پڑھا۔ اس مضمون میں آزاد نے نظم کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے اور شاعری کو فطرت اور زندگی سے قریب کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اسی مشاعرے میں انہوں نے ''شبِ قدر'' کے عنوان سے اپنی مثنوی بھی پیش کی۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ محمد حسین آزاد کا نظریہ نظم محض عملی تجربے تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ اس کے پسِ پشت ایک واضح فکری تصور بھی رکھتے تھے۔ وہ شاعری میں فطرت نگاری اور حقیقت نگاری کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک شاعر کو اپنے گردوپیش کی دنیا کو غور سے دیکھنا چاہیے اور اس کے مناظر، واقعات اور احساسات کو شاعری کا حصہ بنانا چاہیے۔ ان کے اس تصور نے اردو شاعری کو ایک نئے زاویۂ نظر سے روشناس

کرایا۔انجمنِ پنجاب کا دوسرا موضوعاتی مشاعرہ 30 مئی 1874ء کو منعقد ہوا جس کا موضوع ''ابرِ کرم'' تھا۔اس مشاعرے نے موضوعاتی نظم کے اس نئے سلسلے کو آگے بڑھایا۔شاعر اب کسی روایتی مصرعِ طرح کی پابندی کے بجائے ایک متعین موضوع پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگے۔''ابرِ کرم'' جیسے موضوع میں فطرت کے ایک منظر کو شعری اظہار کا مرکز بنایا گیا۔اس طرح اردو شاعری فطرت کے براہِ راست مشاہدے کی طرف متوجہ ہوئی۔

انجمن کا تیسرا مشاعرہ 30 جون 1874ء کو ''امید'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔یہ موضوع فطرت کے کسی خارجی منظر سے زیادہ انسانی جذبات اور داخلی کیفیت سے تعلق رکھتا تھا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انجمن کے موضوعاتی مشاعروں میں صرف فطرت نگاری ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کے جذباتی اور اخلاقی پہلو بھی شامل تھے۔اس طرح جدید نظم کے لیے موضوعات کا دائرہ مسلسل وسیع ہوتا گیا۔13 اگست 1874ء کو انجمنِ پنجاب کا چوتھا مشاعرہ ''حبِ وطن'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔یہ موضوع اردو شاعری کے لیے خاص اہمیت رکھتا تھا کیونکہ اس کے ذریعے وطن اور قومی احساس کو شاعری کے مرکزی موضوعات میں شامل کیا گیا۔اگرچہ اردو شاعری میں وطن اور سرزمین کے حوالے پہلے بھی ملتے ہیں،لیکن ''حبِ وطن'' کو ایک مستقل موضوع کے طور پر نظم کا مرکز بنانا جدید قومی شعور کی علامت تھا۔اس طرح مختلف وقفوں سے انجمنِ پنجاب لاہور کے زیرِ اہتمام مختلف موضوعات پر کل دس مشاعرے منعقد ہوئے۔ان مشاعروں نے اردو کی جدید نظم کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا۔محمد حسین آزاد نے انجمن کے ہر مشاعرے میں حصہ لیا اور ان کی شرکت نے اس شعری تحریک کو ایک مضبوط فکری بنیاد فراہم کی۔

انجمن کے دس مشاعروں میں محمد حسین آزاد نے جو دس نظمیں پیش کیں، وہ جدید اردو نظم کی ابتدائی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ان نظموں میں ''شبِ قدر''، ''ابرِ کرم''، ''صبحِ امید''، ''خوابِ امن''، ''حبِ وطن''، ''دادوانصاف''، ''وداعِ انصاف''، ''گنجِ قناعت''، ''زمستان'' اور ''جذبِ دوری'' شامل ہیں۔ان عنوانات پر غور کرنے سے بھی جدید نظم کے ابتدائی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ان میں فطرت کے مناظر بھی موجود ہیں،انسانی جذبات بھی،قومی احساس بھی،اخلاقی مسائل بھی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلو بھی۔''ابرِ کرم'' اور ''زمستان'' جیسی نظموں میں فطرت نگاری کا رجحان نمایاں ہے۔جدید نظم کی ایک بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ شاعر نے فطرت کو محض روایتی تشبیہات اور استعارات کے ذریعے بیان کرنے کے بجائے اسے براہِ راست مشاہدے کا موضوع بنایا۔موسم، بارش، بادل، سردی اور قدرتی مناظر اپنی حقیقی شکل میں شاعری کا حصہ بننے لگے۔''صبحِ امید'' اور ''خوابِ امن'' جیسے عنوانات انسانی زندگی کے جذباتی اور فکری پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔''حبِ وطن'' میں قومی احساس اور وطن سے محبت کا جذبہ موجود ہے،جبکہ ''دادوانصاف'' اور ''وداعِ انصاف'' سماجی اور اخلاقی زندگی کے مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

''گنجِ قناعت'' میں اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا گیا ہے اور ''جذبِ دوری'' انسانی جذبات اور داخلی کیفیات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس طرح محمد حسین آزاد کی نظموں میں موضوعاتی تنوع موجود ہے اور یہی تنوع جدید نظم کی بنیادوں میں شامل ہے۔

انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں مولانا الطاف حسین حالی کی شرکت بھی جدید نظم کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ حالی نے انجمن کے مشاعروں میں چار نظمیں پیش کیں جن کے عنوان ''برکھارت''، ''حبِ وطن''، ''نشاطِ امید'' اور ''مناظرہ رحم وانصاف'' ہیں۔ حالی کی ان نظموں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ بھی انجمنِ پنجاب کے جدید شعری رجحانات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے موضوعاتی نظم کے تجربے میں فعال طور پر حصہ لیا۔

حالی کا اصل کمال یہ تھا کہ انہوں نے جدید نظم کے اس ابتدائی تجربے کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے حقیقت نگاری، مقصدیت اور اصلاحی شعور سے وابستہ کر دیا۔ حالی کے نزدیک شاعری محض تفریح یا لفظی بازی گری نہیں بلکہ زندگی کی اصلاح اور انسانی شعور کی بیداری کا ذریعہ بھی ہے۔ ان کی شاعری میں معاشرتی برائیوں، قومی زوال، اخلاقی کمزوریوں اور انسانی مسائل پر غور وفکر ملتا ہے۔ حالی کی شاعری میں جدید نظم کا تصور زیادہ واضح اور پختہ صورت اختیار کرتا ہے۔ انہوں نے شاعری کو فطرت اور حقیقت سے وابستہ کرنے پر زور دیا۔ ان کے شعری نظریات کا ایک جامع اظہار بعد میں ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں ہوا۔ اس کتاب میں حالی نے اردو شاعری کے بعض روایتی رجحانات پر تنقید کرتے ہوئے شاعروں کو زندگی اور حقیقت سے قریب ہونے کی دعوت دی۔ ان کے نزدیک شاعری کا مقصد انسانی جذبات کی ترجمانی اور زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی ہونا چاہیے۔ حالی کی سب سے اہم نظموں میں ''مدوجزرِ اسلام'' کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس نظم میں انہوں نے مسلمانوں کے ماضی کے عروج، حال کے زوال اور مستقبل کی اصلاح کے امکانات کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا۔ یہ نظم اس بات کی مثال ہے کہ جدید نظم صرف فطرت نگاری یا موضوعاتی مشاعروں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے قومی اور تہذیبی مسائل کو بھی اپنے دائرے میں شامل کر لیا۔

انجمنِ پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ مختلف موضوعات پر منعقد ہونے والے ان مشاعروں نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ انجمن کا آخری مشاعرہ 3 مارچ 1875ء کو منعقد ہوا جس کا موضوع ''اخلاق'' تھا۔ اس کے بعد 1875ء ہی میں ان مشاعروں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اگرچہ یہ سلسلہ مدت کے اعتبار سے بہت طویل نہیں تھا، لیکن اس کے ادبی اثرات نہایت گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے۔ یہ مشاعرے بند ضرور ہو گئے، مگر ان کے ذریعے اردو شاعری میں جو شعور پیدا ہو چکا تھا، اسے ختم نہیں کیا جا سکا۔ شاعروں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ شاعری کے موضوعات زندگی کی وسعت کے برابر وسیع ہو سکتے ہیں۔ شاعر فطرت، معاشرت، وطن، اخلاق، انسان اور قوم کے

مسائل کو اپنی نظم کا موضوع بنا سکتا ہے۔اس طرح انجمنِ پنجاب کی سرگرمیوں نے اردو شاعری کے ذہن کو بدل دیا۔

انجمنِ پنجاب کی جدید نظم کی تحریک کے بعد اردو نظم کا سفر مزید آگے بڑھا۔اسماعیل میرٹھی نے نظم کو سادگی، مقصدیت اور روزمرہ زندگی سے قربت عطا کی۔انہوں نے بچوں، اخلاقی اقدار، فطرت اور عام زندگی کے موضوعات کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔ان کی نظموں نے اردو شاعری کو عام انسان اور عام زندگی سے وابستہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

بعد ازاں علامہ محمد اقبال نے اردو نظم کو ایک نئی فکری اور فلسفیانہ وسعت عطا کی۔اقبال نے نظم کو محض فطرت نگاری یا اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے انسان، ملت، خودی، عشق، عقل، عمل اور کائنات جیسے عظیم موضوعات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔اقبال کی نظموں میں ایک طرف فطرت کی خوب صورتی ہے اور دوسری طرف انسانی زندگی کی عظیم جدوجہد۔اقبال کے بعد اردو نظم میں ترقی پسند تحریک کا دور آیا۔اس تحریک نے نظم کو سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے مزید قریب کر دیا۔مزدور، کسان، غریب، بھوک، جنگ، سامراج، طبقاتی کشمکش اور انقلاب اردو نظم کے اہم موضوعات بن گئے۔فیض احمد فیض، مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی جیسے شعرا نے نظم کو عوامی زندگی اور اجتماعی جدوجہد سے وابستہ کیا۔ترقی پسند نظم کے ساتھ ساتھ اردو نظم کی ہیئت میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ابتدا میں جدید نظم بنیادی طور پر پابند نظم کی صورت میں آگے بڑھی تھی، لیکن بیسویں صدی میں شاعر نے محسوس کیا کہ جدید زندگی کے پیچیدہ تجربات کے اظہار کے لیے روایتی بحروں اور قافیوں کی پابندی ہمیشہ ضروری نہیں۔اس احساس کے نتیجے میں نظمِ معریٰ اور آزاد نظم نے ترقی کی۔

ن۔م۔راشد جدید اردو نظم کے ان اہم شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے آزاد نظم کو فنی اعتبار سے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ان کی شاعری میں جدید انسان کی تنہائی، داخلی کشمکش، آزادی، وجودی مسائل اور تہذیبی بحران نمایاں ہیں۔راشد نے نظم کی زبان، ہیئت اور علامت میں نئے تجربات کیے اور اردو شاعری کو عالمی جدید شعری رجحانات سے قریب کیا۔

میراجی نے بھی اردو نظم کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ان کی شاعری میں انسانی لاشعور، نفسیاتی پیچیدگیاں، خواب، تنہائی اور داخلی جذبات کا اظہار ملتا ہے۔انہوں نے نظم کو محض خارجی دنیا کی عکاسی سے نکال کر انسان کے باطن کی پیچیدہ دنیا تک پہنچایا۔

تقسیمِ ہند کے بعد اردو نظم میں ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ہجرت، خون ریزی، تہذیبی شکست و ریخت اور انسانی رشتوں کے ٹوٹنے نے شاعر کو گہرے طور پر متاثر کیا۔اس دور میں نظم میں انسان کی تنہائی، خوف، بے یقینی اور وجودی کرب کے موضوعات نمایاں ہونے لگے۔بعد کے جدید شاعروں نے نظم کو علامت، استعارے اور تہہ دار زبان سے مزید مالا مال کیا۔جدید نظم میں براہِ راست بیان کی جگہ اشاریت اور علامتی اظہار

نے اہمیت حاصل کی۔شاعر نے زندگی کی پیچیدگیوں کوسادہ اورسیدھے بیان کے بجائے مختلف معنوی سطحوں پر پیش کرنا شروع کیا۔

عصرِ حاضر میں اردو نظم مزید متنوع اور وسیع ہو چکی ہے۔اب نظم میں انسان کے انفرادی مسائل کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل بھی شامل ہیں۔ جنگ، ہجرت، تشدد، دہشت، ماحولیاتی بحران، ٹیکنالوجی، میڈیا، شہری زندگی، عورت کی شناخت اور انسانی وجود کے نئے مسائل اردو نظم کا حصہ بن چکے ہیں۔ پابند نظم، نظمِ معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم سب اپنے اپنے انداز میں اردو شاعری کے دامن کو وسیع کر رہے ہیں۔اگر اردو کی جدید نظم کے پورے ارتقائی سفر پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے باقاعدہ آغاز میں انجمنِ پنجاب لاہور کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ 21 جنوری 1865ء کو قائم ہونے والی انجمن نے تعلیم، علم اور تہذیب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی ایک نئے شعور کی بنیاد رکھی۔کرنل ہالرائیڈ اور ان کے رفقا کی سرپرستی، محمد حسین آزاد کی فکری قیادت اور حالی جیسے شاعروں کی تخلیقی شرکت نے انجمن کو اردو کی جدید نظم کا اہم مرکز بنا دیا۔

20 مئی 1873ء کو مصرعِ طرح کے بجائے مخصوص موضوع پر نظمیں لکھنے کا فیصلہ اردو شاعری کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم تھا۔ 19 اپریل 1874ء کو ''برسات'' کے موضوع پر منعقد ہونے والا پہلا مشاعرہ، اس کے بعد ''ابرِ کرم''، ''امید''، ''حبِ وطن'' اور دیگر موضوعات پر ہونے والے مشاعرے جدید نظم کے عملی ارتقاء کے اہم مراحل ہیں۔ 3 مارچ 1875ء کو ''اخلاق'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے آخری مشاعرے کے بعد اگرچہ انجمن کے مشاعرے بند ہو گئے، مگر ان کے ذریعے پیدا ہونے والا جدید شعری شعور اردو ادب کی تاریخ میں مستقل طور پر زندہ رہا۔محمد حسین آزاد کی دس نظمیں اور حالی کی چار نظمیں اس ابتدائی جدید نظم کی تحریک کا اہم سرمایہ ہیں۔ان نظموں میں فطرت، اخلاق، امید، امن، وطن اور انسانی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔یہی موضوعاتی وسعت آگے چل کر اردو کی جدید نظم کی سب سے بڑی خصوصیت بنی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں جدید نظم کا آغاز محض ایک ادبی تبدیلی نہیں بلکہ ایک وسیع تہذیبی اور فکری انقلاب کا نتیجہ تھا۔انجمنِ پنجاب لاہور نے اس انقلاب کو ایک ادارہ اور پلیٹ فارم فراہم کیا۔محمد حسین آزاد نے اس کے لیے نظریاتی اور عملی راستہ متعین کیا اور حالی نے اسے حقیقت نگاری، مقصدیت اور اصلاحی شعور کی بنیاد فراہم کی۔ بعد کے شاعروں نے اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے جدید نظم کو فکری، سماجی، سیاسی، فلسفیانہ اور فنی اعتبار سے مسلسل وسعت دی۔

اردو کی جدید نظم کا سفر اس لحاظ سے ایک مسلسل ارتقائی سفر ہے کہ اس نے ہر عہد کے تقاضوں کو قبول کیا۔انجمنِ پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں سے شروع ہونے والی یہ روایت حالی اور اسماعیل میرٹھی سے ہوتی ہوئی اقبال تک پہنچی، ترقی پسند تحریک نے اسے عوامی اور انقلابی شعور

عطا کیا، ن۔م۔راشد اور میراجی نے اس کی فنی ہیئت اور داخلی اظہار کو نئی سمتیں دیں اور بعد کے جدید شاعروں نے اسے علامتی، تہہ دار اور عصری تجربات سے بھرپور بنایا۔

اس تمام ارتقائی سفر کا نقط؟ آغاز انجمنِ پنجاب لاہور کی وہ علمی اور ادبی فضا تھی جس نے اردو شاعری کو پہلی مرتبہ اس شدت کے ساتھ یہ احساس دلایا کہ شاعری صرف ماضی کی روایت کی پابند نہیں بلکہ اسے اپنے عہد کی زندگی، اپنے گردوپیش کی حقیقتوں اور انسان کے بدلتے ہوئے تجربات کی ترجمانی بھی کرنی چاہیے۔ یہی شعور اردو کی جدید نظم کی اصل روح ہے اور اسی شعور نے اردو نظم کو ایک زندہ، متحرک اور مسلسل ارتقاء پذیر صنفِ سخن بنا دیا۔

1.2.3 :سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں۔

سوال1: جدید اردو نظم کے باقاعدہ ارتقاء کا آغاز کس دور میں ہوا؟

(الف) مغلیہ دور (ب) سرسید کے عہد کے بعد

(ج) دکنی دور (د) ولی کے دور

سوال2: جدید اردو نظم میں سب سے نمایاں تبدیلی کیا واقع ہوئی؟

(الف) صرف زبان تبدیل ہوئی (ب) موضوعات اور اسلوب میں وسعت پیدا ہوئی

(ج) صرف قافیہ تبدیل ہوا (د) صرف غزل کو فروغ ملا

سوال3: اردو نظم میں قومی اور اصلاحی موضوعات کو فروغ دینے والوں میں کون نمایاں ہے؟

(الف) الطاف حسین حالی (ب) میر تقی میر

(ج) ولی دکنی (د) انشا اللہ خاں انشا

سوال4: جدید اردو نظم پر مغربی ادب کے اثرات کس ذریعے سے زیادہ نمایاں ہوئے؟

(الف) ترجموں اور جدید تعلیم کے ذریعے (ب) صرف داستانوں کے ذریعے

(ج) صرف غزل کے ذریعے (د) صرف صوفیانہ ادب کے ذریعے

سوال5: جدید اردو نظم میں شاعر نے کن موضوعات کو زیادہ اہمیت دی؟

(الف) صرف عشقیہ موضوعات (ب) صرف مذہبی موضوعات

(ج) سماجی، سیاسی، قومی اور انسانی مسائل (د) صرف تاریخی واقعات۔

1.3: عمومی جائزہ

جدید اردو نظم کا ارتقاء اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم اور قابلِ ذکر مرحلہ ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں غزل کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور نظم کی صورت نسبتاً محدود تھی۔ تاہم بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور فکری حالات نے شاعری کے موضوعات اور ہیئت میں تبدیلی کی ضرورت پیدا کی۔ انگریزی اقتدار، مغربی تعلیم، جدید علوم اور نئے افکار کے اثرات نے اردو ادب میں بھی ایک نئی فکری بیداری پیدا کی۔ اس بیداری کے نتیجے میں شاعروں نے محض عشق و محبت اور روایتی موضوعات کے بجائے زندگی کے حقیقی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنانا شروع کیا۔ جدید اردو نظم کے ارتقاء میں سرسید تحریک اور اصلاحی فکر نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس دور میں شاعری کو زندگی کی اصلاح، قومی بیداری اور معاشرتی شعور کا وسیلہ سمجھا جانے لگا۔ الطاف حسین حالؔی نے اردو نظم کو ایک نیا مقصد، نیا موضوع اور نئی فکری سمت عطا کی۔ ان کی نظموں میں قومی زوال، اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی تربیت اور انسانی مسائل نمایاں ہیں۔ ان کے بعد محمد حسین آزاد نے بھی اردو شاعری میں فطرت نگاری اور نئے شعری رجحانات کو فروغ دیا۔ بیسویں صدی میں اردو نظم نے مزید ترقی کی۔ اقبال نے نظم کو فلسفیانہ، ملی اور خودی کے تصور سے ہم آہنگ کیا اور اسے بلند فکری سطح عطا کی۔ بعد ازاں ترقی پسند تحریک نے نظم کو سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے جوڑ دیا۔ فیض احمد فیض، مجاز، ساحر لدھیانوی اور دوسرے شعراء نے ظلم، استحصال، آزادی، محبت اور انسان دوستی جیسے موضوعات کو اپنی نظموں میں جگہ دی۔

اس کے بعد حلقہء اربابِ ذوق اور جدیدیت کے زیرِ اثر اردو نظم میں فرد کی داخلی کیفیت، تنہائی، وجودی مسائل، علامت، ابہام اور نئے شعری اسلوب کو اہمیت حاصل ہوئی۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور مجید امجد نے آزاد نظم اور جدید شعری اظہار کو نئی جہتیں عطا کیں۔ یوں جدید اردو نظم روایتی پابندیوں سے نکل کر زندگی کے وسیع تر تجربات، انسانی نفسیات، سماجی مسائل اور عصری احساسات کی ترجمان بن گئی۔ اس کا ارتقاء آج بھی جاری ہے اور نئے شعراء نئے موضوعات، نئی ہیئتوں اور نئے اسالیب کے ذریعے اسے مزید وسعت دے رہے ہیں۔

1.4 : فرہنگ

ارتقاء : ترقی، نشوونما

عہد	:	زمانہ، دور
اصلاح	:	درستگی، بہتری
احیائے فکر	:	فکر کی تجدید
فکری بیداری	:	سوچ اور شعور کی بیداری
سماجی	:	معاشرتی
سیاسی	:	سیاست سے متعلق
تہذیبی	:	تہذیب سے متعلق
عصری	:	موجودہ زمانے سے متعلق
رجحان	:	میلان، رغبت
مقصدیت	:	کسی مقصد سے وابستگی
حقیقت نگاری	:	حقیقت کو پیش کرنا
فطرت نگاری	:	قدرتی مناظر کی عکاسی
علامت	:	نشانی، رمز
ابہام	:	غیر واضح ہونے کی کیفیت
داخلی	:	اندرونی
وجودی	:	وجود سے متعلق
استحصال	:	ناجائز فائدہ اٹھانا
خودی	:	اپنی ذات اور خود آگاہی کا احساس
روایت	:	چلا آنے والا طریقہ

1.5:نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: جدید اردو نظم کے ارتقاء کے اسباب وعوامل پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

سوال2: جدید اردو نظم کے ارتقاء میں حالی اور محمد حسین آزاد کے کردار کا جائزہ لیجیے۔

سوال3: ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کے موضوعات اور اسلوب کو کس طرح متاثر کیا؟

سوال4: ن۔م۔راشد، میراجی اور مجید امجد نے جدید اردو نظم کے ارتقاء میں کیا کردار ادا کیا؟

1.6:مشقی سوالات

سوال1: جدید اردو نظم سے پہلے اردو نظم کی صورتِ حال بیان کیجیے۔

سوال2: جدید اردو نظم کے اہم موضوعات کیا ہیں؟

سوال3: جدید اردو نظم پر مغربی ادب اور جدید تعلیم کے اثرات بیان کیجیے۔

سوال4: آزاد نظم نے جدید اردو شاعری کو کس طرح متاثر کیا؟

1.7 جوابات سرگرمی۔

ب) سرسید کے عہد کے بعد

ب) موضوعات اور اسلوب میں وسعت پیدا ہوئی

الف) الطاف حسین حالی

الف) ترجموں اور جدید تعلیم کے ذریعے

ج) سماجی، سیاسی، قومی اور انسانی مسائل

1.8 مشقی سوالات کے جوابات

سوال1: جدید اردو نظم سے پہلے اردو نظم کی صورتِ حال بیان کیجیے۔

جواب: جدید اردو نظم سے پہلے اردو شاعری میں غزل کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ نظم اگرچہ اردو شاعری میں موجود تھی، لیکن اس کی باقاعدہ اور منظّم ترقی نہیں ہوئی تھی۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور غزل جیسی اصناف زیادہ مقبول تھیں۔ نظم میں بھی زیادہ تر روایتی موضوعات، عشقیہ جذبات، اخلاقی مضامین اور مذہبی و تاریخی واقعات کو پیش کیا جاتا تھا۔ شاعر کی توجہ عام طور پر فرد کے ذاتی جذبات اور روایتی شعری موضوعات تک محدود تھی۔ جدید تعلیم، مغربی افکار، سماجی تبدیلیوں اور قومی حالات نے جب اردو ادب کو متاثر کیا تو نظم کے موضوعات اور اندازِ بیان میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ یوں جدید اردو نظم کے لیے ایک نئی فکری اور فنی فضا ہموار ہوئی۔

سوال2: جدید اردو نظم کے اہم موضوعات کیا ہیں؟

جواب: جدید اردو نظم کے موضوعات بہت وسیع اور متنوع ہیں۔ اس میں قومی زندگی، سماجی مسائل، سیاسی حالات، آزادی، غربت، طبقاتی کشمکش، انسانی حقوق، محبت، فطرت، تنہائی، داخلی کرب، انسانی نفسیات اور زندگی کے فلسفیانہ مسائل کو اہمیت حاصل ہے۔ جدید شاعر اپنے عہد کے مسائل سے بے خبر نہیں رہتا بلکہ اپنے گرد و پیش کی زندگی کو شعری اظہار کا حصہ بناتا ہے۔ اسی وجہ سے جدید اردو نظم محض جذبات کی ترجمان نہیں بلکہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی شعور کی بھی عکاس ہے۔

سوال3: جدید اردو نظم پر مغربی ادب اور جدید تعلیم کے اثرات بیان کیجیے۔

جواب: مغربی تعلیم اور مغربی ادب نے جدید اردو نظم کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ انگریزی تعلیم کے فروغ سے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو مغربی فلسفے، ادب، سائنس اور نئے سماجی افکار سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ترجموں کے ذریعے مغربی شاعری اور ادبی نظریات اردو میں پہنچے۔ اس کے نتیجے میں شاعری میں نئے موضوعات اور نئے اسالیب پیدا ہوئے۔ شاعر نے فرد اور معاشرے کے تعلق، آزادی، مساوات، انسانی حقوق اور سماجی انصاف جیسے موضوعات پر توجہ دینا شروع کی۔ مغربی ادب کے اثر سے نظم میں حقیقت نگاری، فطرت نگاری، آزاد نظم اور جدید شعری تکنیکوں کو بھی فروغ ملا۔

سوال4: آزاد نظم نے جدید اردو شاعری کو کس طرح متاثر کیا؟۔

جواب: آزاد نظم نے جدید اردو شاعری کو اظہار کی ایک نئی آزادی عطا کی۔ روایتی نظم میں قافیہ، ردیف، بحر اور ہیئت کی پابندیاں نسبتاً زیادہ تھیں، جب کہ آزاد نظم میں شاعر کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور دیگر جدید شعراء نے آزاد نظم کو کامیابی سے استعمال کیا۔ آزاد نظم کے ذریعے داخلی کیفیات، پیچیدہ نفسیاتی تجربات، عصری مسائل اور فلسفیانہ

خیالات کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کیا گیا۔ اس طرح آزاد نظم نے اردو شاعری کی ہیئت، زبان، اسلوب اور موضوعات میں نمایاں تبدیلی پیدا کی اور جدید اردو نظم کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا۔

1.9 امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

سبق نمبر 2 انجمنِ پنجاب اور اردو نظم جدید

ساخت

2.0 اغراض و مقاصد

2.1 تعارف

2.2 انجمنِ پنجاب اور اردو نظم جدید

2.2.1 انجمنِ پنجاب لاہور کے نمائندہ شعراء

2.2.2 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں!

2.3 عمومی جائزہ

2.4 فرہنگ

2.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

2.6 مشقی سوالات

2.7 مشقی سوالات کے جوابات

2.8 جوابات سرگرمی اور

2.9 امدای کتب

2.0: اغراض ومقاصد

عزیز متعلم !اس سبق ''انجمن پنجاب اور نظم جدید'' کا بنیادی مقصد آپ کو اردو نظم کی اس اہم ادبی تبدیلی سے آگاہ کرنا ہے جس نے روایتی شاعری کے دائرے کو وسیع کر کے اسے زندگی کے حقیقی مسائل، فطرت، معاشرت، اخلاق، قومی احساس اور انسانی جذبات سے وابستہ کیا۔ اس سبق کے ذریعے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ انیسویں صدی میں اردو شاعری میں جدید رجحانات کیوں پیدا ہوئے اور انجمنِ پنجاب نے جدید نظم کے فروغ میں کس قدر اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ طلبہ کو محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالؔی کی خدمات، ان کے موضوعاتی مشاعروں اور نظم کے نئے تصور سے روشناس کرانا بھی اس سبق کا اہم مقصد ہے۔ انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے مشاعروں میں روایتی طرحی مصرعے کے بجائے مختلف موضوعات پر نظمیں کہنے کا رواج پیدا ہوا، جس سے اردو شاعری میں حقیقت نگاری، فطرت نگاری، اصلاحِ معاشرہ اور حبِ وطن جیسے نئے موضوعات کو فروغ ملا۔

2.1: تعارف

انجمنِ پنجاب اور نظم جدید اردو ادب کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ 1857ء کے بعد ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کے اثرات اردو شاعری پر بھی مرتب ہوئے۔ اس دور تک اردو شاعری میں بالخصوص غزل کا غلبہ تھا اور شاعری کے موضوعات عموماً عشق، محبوب، ہجر و وصال، گل و بلبل اور روایتی مضامین تک محدود تھے۔ بدلتے ہوئے حالات نے شاعروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ شاعری کو زندگی کے نئے تقاضوں اور مسائل سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اسی ادبی ضرورت کے تحت لاہور میں انجمنِ پنجاب نے جدید شعری رجحانات کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ محمد حسین آزاؔد، الطاف حسین حالؔی اور کرنل ہالرائیڈ کی کوششوں سے 1874ء میں ایسے مشاعروں کا آغاز ہوا جن میں روایتی طرحی مصرعے کے بجائے کسی خاص موضوع پر نظم کہنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ ان موضوعات میں برسات، امید، حبِ وطن، امن، انصاف، مروت، تہذیب اور اخلاق وغیرہ شامل ہیں۔

انجمن پنجاب کے ان موضوعاتی مشاعروں نے اردو شاعری کو محض روایتی مضامین سے نکال کر زندگی، فطرت، معاشرت اور قومی و اخلاقی مسائل سے جوڑ دیا۔ محمد حسین آزاد اور حالی نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اردو میں فطری اور مقصدی شاعری کے رجحان کو مضبوط کیا۔ اسی لیے انجمن پنجاب کو جدید اردو نظم کی باقاعدہ تحریک کے اہم ترین مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ انجمن کے موضوعاتی مشاعروں کا سلسلہ زیادہ

عرصے تک جاری نہ رہ سکا، تاہم اس کے اثرات بعد کی اردو نظم پر گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے اور جدید اردو نظم کی ترقی کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم ہوئی۔

2.2: انجمنِ پنجاب اور اردو نظم جدید

انجمنِ پنجاب نے جدید اردو نظم کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں لیکن سیاسی نقطہ نظر سے اس کا معاملہ بھی فورٹ ولیم کالج جیسا ہی ہے۔ بقولِ انور سدید، انجمنِ پنجاب کا قیام حکومت کی ایما پر ہوا لیکن اس کی ادبی جہت محمد حسین آزاد نے متعین کی۔ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کے مدارس کی درسی کتب کا جائزہ لیتے ہوئے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ڈونلڈ میکلوڈ نے محسوس کیا کہ ان میں نظموں کی کمی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس وقت کے ڈی پی آئی پنجاب کرنل ہالرائڈ کو ہدایت کی کہ ان کتب میں نظمیں شامل کی جائیں۔ چنانچہ ہالرائڈ نے محمد حسین آزاؔد سے مشورہ کر کے ایک نشست کا انعقاد 21 جنوری 1865ء کو انجمن کے سکھٹنا سبھا میں کیا۔ اس نشست میں پنجاب کے افسران، محمد حسین آزاؔد اور کرنل ہالرائڈ کے علاوہ پنجاب کے اہلِ علم بھی شامل تھے۔ 15 اگست 1867ء کو آزاد نے ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات'' کے عنوان سے ایک یادگار لیکچر دیا۔ یہ لیکچر ان کی انفرادیت کا غماز تھا۔ جدید نظم کی تحریک یہیں سے شروع ہوتی ہے، لیکن اس تحریک کو باقاعدہ طور پر متحرک ہونے میں کچھ عرصہ ضرور لگا۔

انجمن کے افتتاحی جلسے میں آزاد نے ایک لیکچر دیا اور اپنی نظم ''شبِ قدر'' کے عنوان سے سنائی۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کے خیالات کی بھرپور تائید کی اور اپنی رائے پیش کی کہ آئندہ مشاعروں میں مصرعِ طرح کے بجائے کسی خاص عنوان کے تحت نظموں پر طبع آزمائی کی جائے۔ چنانچہ ہالرائڈ نے پہلے مشاعرے کا عنوان ''برسات'' رکھا۔ اسی طرح انجمن نے درج ذیل موضوعات دے کر اردو ادب کے ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ کیا: برسات، امن، زمستان، انصاف، امید، اخلاق، تہذیب، حبِ وطن، مروّت، قناعت۔ محمد حسین آزاد کا خیال تھا کہ قدیم شعری روایت کو یکسر ترک کرنا مناسب نہیں بلکہ اس میں جزوی تبدیلی یا کچھ اصلاح کر کے اسے مقامی رنگ میں رنگا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ماضی اور حال سے بے زار نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ماضی اور حال کے درمیان ایک پل قائم کر دیا جائے تاکہ ہمارا رشتہ اپنی مستحکم روایت سے منقطع نہ ہو۔ آزاد کی رائے کو انور سدید اس طرح بیان کرتے ہیں:

> آزاد کے یہاں نئے اور پرانے میں مفاہمت پیدا کرنے کی ایک فطری خواہش اور کوشش صاف دکھائی دیتی ہے۔

ماضی کی طرف ان کے رویے میں حقارت یا تختی کا شائبہ تک نہیں۔ آزاد عملاً اسی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ کس طرح ماضی اور حال کے درمیان ایک پل بنالیا جائے اور اپنے آپ کو کھوئے بغیر بدلتی ہوئی زندگی کے حساب چکا دیے جائیں۔ مشرقی شاعری کے محاسن کو آزاد نے اسی لیے نہ تو مسترد کیا، نہ اپنے ورثے پر شرمندہ ہوتے ہیں۔۔۔ یعنی کہ آزاد اردو شاعری کو جو رخ دینا چاہتے ہیں اس کا سلسلہ صرف مغرب سے نہیں، بلکہ مشرق کی روایت کے اس حصے سے بھی ملتا ہے جسے رسمی شاعری رواج نے پس پشت ڈال دیا ہے اس طرح آزاد اپنی روایت سے منحرف یا منقطع ہونے کے بجائے دراصل اس روایت سے صالح اور صحت مند عناصر کی بازیافت اور تجدید کے طلب گار تھے۔'' (اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سعدید، ص:386-384)

ہالرائڈ کی کوششوں سے قائم ہونے والی انجمنِ پنجاب محمد حسین آزاد کی اسی رائے پر عمل پیرا ہوئی، جس کا اندازہ ہم اوپر کی سطور میں قلم بند مشاعروں کے عنوانات سے کر سکتے ہیں۔ انجمن کے مشاعروں کے شرکاء کی فہرست پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں صرف دو ہی مقبول و معروف نام نمایاں ہیں۔ پہلا مولانا محمد حسین آزاد اور دوسرا خواجہ الطاف حسین حالی۔ ان دونوں کے علاوہ کوئی صفِ اوّل کا شاعر معلوم نہیں ہوتا۔ ابھی یہ تحریک آہستہ آہستہ اپنے قدم جمانے ہی لگی تھی کہ مارچ 1875ء میں یہ مشاعرے بند کر دیے گئے، مگر ان کی بازگشت بیسویں صدی کی اردو شاعری میں بھی سنائی دیتی ہے۔

انجمن کے مناظموں کے نتیجے میں بھی کچھ اہم نتائج برآمد ہوئے۔ اس بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں:

محمد حسین آزاد کے خیالات اخبار آفتاب پنجاب کے ذریعے اردو شعرا کو متاثر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ 1867ء میں ہی مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے انگریزی کی چار نظموں کے منظوم ترجمے کیے۔'' (اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ خلیل الرحمٰن اعظمی، ص:87)

یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ جب آزاد اردو ادب میں جدید اردو نظم کی راہ ہموار کر رہے تھے، اس سے قبل ہی اس کی راہ کو ہموار کرنے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ قلق میرٹھی نے اس کی بنیاد رکھی۔ 1864ء میں قلق میرٹھی نے پندرہ انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کر کے ''جواہرِ منظوم'' کے نام سے شائع کیا۔ 1874ء تک اس کتاب کے چار ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ حسن الدین احمد فرماتے ہیں:

قلق میرٹھی نے بعض احکامان وقت کی فرمائش پر منتخب انگریزی نظموں کا ترجمہ ''جواہر منظوم کے نام سے کیا، جس کی

طباعت 1864ء میں گورنمنٹ پریس الہ آباد میں ہوئی۔ جواہر منظوم کو اردو منظوم تراجم کا پہلا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ان منظوم تراجم پر مرزا اسداللہ خاں غالب نے نظر ثانی بھی کی تھی۔ (انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، حسین حالی،ص:121)

یہ حوالہ تحقیقی نقطہءنظر سے درست ہے کہ قلق میرٹھی پہلے شخص ہیں جنہوں نے منظوم ترجمے کا کام کیا،مگر تحریکی نقطہ نظر سے محمد حسین آزاد ہی جدید اردو نظم کے بانی قرار پاتے ہیں۔انجمن کے مناظموں کے موضوعات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزاد اور حالی کا مقصد معاشرے اور شاعری میں اصلاح پیدا کرنا تھا،جس میں حقیقت اور ارضیت کی کارفرمائی ہو۔حالؔی لکھتے ہیں:

اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبت عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو، وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق وواقعات پر رکھی جائے۔'' (کلیات نظم حالی، دیباچہ مجموعہ نظم حالی، خواجہ الطاف حسین حالی،ص:51)

حالؔی نے انجمن کے چار مناظموں میں شرکت کی اور ''برکھارت''،''نشاطِ امید''،''حبِ وطن''اور''مناظرہ رحم وانصاف'' کے عنوان سے چار نظمیں پڑھیں۔''برکھارت''میں حالی نے گرمی کی شدت وتپش اور موسمِ برسات کی آمد کا پُر لطف انداز میں خاکہ کھینچا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کھلائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کر کرتے مم مم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھر نے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لا کر
پھر چھوڑتے نہ تھے منہ لگا کر

برسات کا بیان کچھ اس طرح سے کیا ہے:

پھولوں سے لیٹے ہوئے ہیں کیسار
دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پیسے پھیو پیو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

آزاد نے اس انجمن کے ذریعے نیچرل شاعری کی بنیاد رکھی اور اسے عام کرنے کی کوشش کی۔ سرسید نے اس رواج کو دیکھ کر اس کی سراہنا کی اور اس کے مزید استحکام کی تمنا کی۔ انہوں نے حتی الامکان آزاد کی ہمت افزائی کی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعراء نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی ''خواب امن پہنچی۔ دل بہت خوش ہوا اور حقیقت شاعری اور زور سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضروری ہے کہ انگریز شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں''۔ (سرسید بنام آزاد، 29 اکوبر 1884، بحوالہ تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ شمیم حنفی، ص:275)

آزاد نے پہلے ہی اس پہلو کو ملحوظِ خاطر رکھا اور انگریزی شاعری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انجمن کے ابتدائی جلسوں میں اس کے نمونے پیش کیے۔ 30 مئی 1874ء کو آزاد نے ایک مناظمے میں اپنی نظم ''ابرِ کرم'' پڑھی، جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے ابر تیری رات کی تعریف اگر کروں
لازم ہے پہلے میں رہِ ظلمات سر کروں
کیا کیا بیان کروں میں تیری رات کا مزہ
گر رات کا مزہ ہے تو برسات کا مزہ
سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا

چاروں طرف جہاں میں چھائی ہوئی گھٹا
بجلی کبھی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے
کرتی نقابِ ابر میں چھمک ہے ناز سے
اور کوکنا پپیے کا وہ دل کی ہوک سے
نالہ کو اپنے توانا کوئل کی کوک سے
کوٹھے میں ٹھنڈے ٹھنڈے پچھوں وہ اوس میں
ہے فخرِ گل کو آوے اگر پائے بوس میں
آنا وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی
بول اٹھنا مرغِ نغمہ مرا کا کبھی کبھی

مذکورہ بالا کلام کو پڑھ کر یہ علم ہوتا ہے کہ آزاد نے مشاعروں کے لیے جو پیرایہ طے کیا، اس پر پہلے وہ خود عمل پیرا ہوئے۔ قدیم اردو شاعری میں مبالغہ، تصنع، لفاظی اور بے جا استعارہ وتشبیہ کا استعمال عام تھا، مگر نیچرل شاعری نے اس سے انحراف کیا اور ہندوستان کے عوام کے آس پاس کی چیزوں کی عکاس بن گئی۔ آزاد اور حالی فطرت کے پوشیدہ پہلوؤں اور مناظر کی تلاش میں لگ گئے اور اسے دنیا کے سامنے لانے کے لیے چہل قدمی کرنے لگے۔ اس طرح اردو نظم کی دنیا میں ایک اور باب کا اضافہ ہوا، جو ''نیچرل شاعری'' کے نام سے موسوم ہوا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید نے اپنی رائے قلم بند کی ہے:

''تحریک انجمن فطرت کی عکاسی تو کرتی ہے لیکن فرد کے رومانی مزاج کو خاطر خواہ آسودگی عطا نہیں کرتی۔ چنانچہ اس تحریک کی فطرت نگاری کو انگریزی ادب کی اس تحریک سے مماثل قرار دینا ممکن نہیں جس کے نمائندے شعرا ور ڈورتھ، کیٹس اور میلے وغیرہ تھے۔ مجموعی طور پر تحریک انجمن پنجاب کی شاعری میں صرف ایک جہت نمایاں نظر آتی ہے اور یہ اس کی ارضیت پسندی کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ تاہم اس تحریک کی یہ عطا تحسین کی مستحق ہے کہ اس نے غزل کی مقبولیت کے دور میں نظم کو منظر عام پر لانے کا موقع پیدا کیا اور مستقبل میں نظم کے فروغ کے لیے راہ ہموار کی۔''

(اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص:395)

آزاد نے اس کے علاوہ نظم کی ہیئتوں پر بھی غور وفکر کیا اور ان میں ضروری تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے نظمِ معرّیٰ کی ہیئت سے اردو ادب کو متعارف کرایا۔ علاوہ ازیں اسماعیل میرٹھی نے اس نظمِ معرّیٰ کو اپنایا اور بچوں کے لیے نظمیں کہیں، مگر ان کی شہرت اس قدر نہ ہو پائی جس قدر آزاد اور حالی کی ہوئی۔ یوں تو انجمنِ پنجاب کا زوال 1875ء میں ہوگیا، لیکن اس نے نظم نگاری کی تحریک میں جو گراں قدر اور نمایاں کارہائے انجام دیے، انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہیں سے لوگوں کا شعور بالیدہ ہوتا ہے۔ اس تحریک کو مزید تقویت بخشنے کے لیے عبدالحلیم شرر، شیخ عبدالقادر، تاجور نجیب آبادی اور مولوی عبدالحق نے نمایاں کام انجام دیے۔

شرر نے اپنے رسالے ''دلگداز'' میں نظم کی تحریک کو وسعت دینے کے لیے مضامین شائع کیے، فکر وفن پر تجربات کرنے والوں اور نظم میں نئے امکانات پیدا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ شرر کے کہنے پر نظمِ طباطبائی نے گرے کی مشہور نظم کا منظوم ترجمہ ''گورِ غریباں'' کے نام سے کیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں:

> اردو نظم میں جدید اسلوب اور ہیئت کو فروغ دینے کے لیے ایک با قاعدہ تحریک چلانے کا سہرا مولوی عبدالحلیم کے سر ہے۔ اردو کی پابند نظم میں ایک نیا انداز نظم طباطبائی کی گور غریباں سے شروع ہوتا ہے جو گرے کی مشہور ایجی کا منظوم ترجمہ ہے اور جوڑ کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔'' (اردو نظم کا تشکیلی دور خلیل الرحمٰن اعظمی، ص:11)

نظم ''گورِ غریباں'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

وداعِ روزِ روشن ہے، گزر شامِ غریباں کا
چرا گاہوں سے پلٹے قافلے وہ ہے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے، میں ہوں اور طائر آشیانوں میں

اردو شاعری میں اسٹینز ا کی ہیئت نظمِ طباطبائی کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے اپنے ترجمے کے ذریعے اردو شاعری میں اسٹینز ا کو متعارف کرایا، جب کہ شرر نے غیر مقفیٰ یعنی نظمِ معرّیٰ کی ہیئت کو فروغ دینے کے لیے منظوم ڈرامے لکھے، جن میں ''فتحِ اندلس''، ''جینا''، نظمِ غیر منقفی، ''اسیریِ بابل'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شرر نے اپنے نئے انداز سے دیگر شعرا کے ذہن کو متاثر کیا۔ شعرا نے شرر کی پیروی کرتے ہوئے اس نئے انداز میں طبع آزمائی کی، جن میں احمد حسن فرہاد، ضامن کشوری، نادر کاکوری، شوق قدوائی اور ظفر علی خاں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ان شعرا نے ترجموں کے ساتھ ساتھ طبع زاد نظمیں لکھ کر اردو نظم کو نئے امکانات سے روشناس کرایا۔

اردو میں نظم نگاری کی تحریک کو استحکام بخشنے کے لیے رسالہ ''دلگداز'' کے ساتھ ساتھ شیخ عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' نے بھی اہم کردار ادا کیا۔اس رسالے نے پہلے ہی شمارے میں اپنے مقاصد کو واضح کر دیا تھا:

> ''انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں، انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تا کہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔''
>
> (اردو نظم کا تشکیلید در خلیل الرحمٰن اعظمی ص:15)

رسالہ ''دلگداز'' اور ''مخزن'' سے اس دور کے متعدد شعراء وابستہ تھے، جن میں علامہ اقبال کا نام سرفہرست ہے۔اقبال کی نظم ''ہمالہ'' پہلی مرتبہ ''دلگداز'' میں ہی شائع ہوئی۔اقبال کے علاوہ ''مخزن'' کے نمائندہ نظم نگار شعرا میں سرور جہاں آبادی، نادر کاکوری، غلام محمد بھیک نیرنگ، ضامن کشوری، پنڈت کیفی، خوشی محمد ناظر اور ظفر علی خاں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ان شعرا نے بڑے پیمانے پر انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا، اس کے ساتھ ہی طبع زاد نظمیں بھی تخلیق کیں۔''دلگداز'' اور ''مخزن'' کے بعد جس رسالے کا نام آتا ہے، وہ رسالہ ''ہمایوں'' ہے۔رسالہ ''ہمایوں'' کی اشاعت تاجور نجیب آبادی نے کی۔اس رسالے نے بھی نظم کی کئی منزلیں متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس رسالے نے اردو شاعری میں بلینک ورس کی ہیئت کا تعارف کرایا۔''ہمایوں'' کی پالیسی اور اغراض ومقاصد کے تعلق سے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں بے قافیہ نظموں کو رائج کرنا نظم کی گراں قدر اصلاح ہے۔میرا ارادہ ہے کہ انجمن ارباب علم پنجاب اور رسالہ ہمایوں کے ذریعے اردو نظم میں بلینک ورس کو رواج دوں۔ہر کام کی ابتدا مشکلات سے ہوتی ہے لیکن مشکلات کو عبور کرنا ہی کسی کام کو انجام تک پہنچا دینے کا نام ہے۔بے قافیہ اردو نظم اول اول غیر مترنم، سامع سوز اور اوپری سی معلوم ہوگی لیکن کچھ دنوں کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس جدت میں دلکشی و دلآویزی پیدا ہو جائے گی۔
>
> ۔۔۔آئندہ کوشش کی جائے گی کہ ہمایوں کے ہر نمبر میں بے قافیہ نظمیں شائع کی جائیں۔شعرائے روشن خیال سے استدعا ہے کہ وہ اس مفید تحریک کے رائج کرنے میں ہماری مدد کریں۔ہمایوں کے صفحات میں بے قافیہ نظمیں مقفی نظموں کے مقابلے میں ترجیحی سلوک کی مستحق سمجھی جائیں۔''
>
> (اردو نظم کا تشکیلی دور خلیل الرحمٰن اعظمی ص:27)

مذکورہ سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں نظم نگاری کی تحریک کو جلا بخشنے کے لیے دانش وروں نے کس قدر محنت و مشقت کی۔ تاجور نجیب آبادی کی اس تحریک کو توانائی عطا کرنے کے لیے عظمت اللہ خاں نے ان کا ساتھ دیا، جن کی انتھک محنتوں نے اردو نظم نگاری میں جدید میلانات کو فروغ دیا۔ ان کے زیرِ اثر نظم میں نئی ہیئت اور بحروں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب کے عناصر بھی آب و تاب کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اردو نظم کی ترقی میں ''ہمایوں'' اور عظمت اللہ خاں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''ہمایوں اور عظمت اللہ خاں کی کوشش سے اردو نظم کے جدید میلانات کو کافی آگے بڑھنے کا موقع ملا اور اردو نظم میں بحروں کا تنوع، ہیئت کے نئے نئے نمونے، ہندوستانی تہذیب کے عناصر سادہ و شیریں زبان کا استعمال، عورت کی زندگی اور اس کے جذبات و احساسات کی عکاسی محبوب کے لیے ان کا استعمال، غرض کئی طرح کے عناصر کو فروغ ہوا اور بعد کے نظم نگاروں نے کسی نہ کسی طور ان پر ان رجحانات سے اثر لیا۔'' (اردو نظم کا تشکیلی دور خلیل الرحمٰن اعظمی، ص:1)

درج بالا رسائل کے علاوہ رسالہ ''اردو'' اور ''ادبی دنیا'' نے بھی اردو نظم نگاری کی تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مختصر یہ کہ آزاد اور حالی نے جو بنیاد انجمنِ پنجاب کے ذریعے رکھی اور اردو نظم نگاری کی تحریک کو فروغ دیا، وہ ان کے کارہائے نمایاں میں شمار ہوتا ہے۔ انجمن کے مشاعروں اور مناظموں نے نظم کے لیے ایک راہ ہموار کی، جس کے زیرِ اثر دیگر شعرا نے اس تحریک میں شامل ہو کر اسے جلا بخشی۔ اس انجمن نے اردو دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اس انجمن کی وجہ سے نظم میں نظمِ معرّیٰ اور بلینک ورس کی ہیئت کا تعارف ہوا اور ساتھ ہی انگریزی نظموں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا سلسلہ بھی فروغ پایا۔

2.2.1: انجمنِ پنجاب لاہور کے نمائندہ شعراء

اردو ادب کی تاریخ میں انجمنِ پنجاب لاہور کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں جب ہندوستان کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے، اس وقت اردو شاعری بھی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ قدیم شعری روایت میں غزل کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور شاعری میں زیادہ تر عشق و محبت، ہجر و وصال، گل و بلبل، ساقی و شراب اور دیگر روایتی مضامین بیان کیے جاتے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات میں یہ احساس پیدا ہوا کہ شاعری کو زندگی کے حقیقی مسائل، فطرت کے مناظر، قومی جذبات، اخلاقی اقدار اور معاشرتی اصلاح سے بھی وابستہ ہونا چاہیے۔ انجمنِ پنجاب نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اردو شاعری کو ایک نئی سمت عطا

کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

انجمنِ پنجاب لاہور کا قیام 1865ء میں ہوا۔اس کے قیام کا بنیادی مقصد پنجاب میں علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو فروغ دینا تھا۔ بعد میں اس انجمن نے اردو شاعری کے حوالے سے ایسی سرگرمیاں شروع کیں جن کے اثرات اردو ادب پر بہت گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے۔ خصوصاً 1874ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے موضوعاتی مشاعروں نے اردو نظم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ان مشاعروں میں شعرا کو کسی مخصوص موضوع پر نظم لکھنے کی دعوت دی جاتی تھی۔اس طرح شاعری محض روایتی مضامین تک محدود نہ رہی بلکہ فطرت، اخلاق، وطن، امید، انسانی زندگی اور معاشرتی مسائل جیسے موضوعات بھی نظم کا حصہ بننے لگے۔انجمنِ پنجاب کے اس شعری انقلاب میں سب سے نمایاں نام محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالؔی کے ہیں۔ان دونوں شعرا نے اردو نظم کو نئی فکری بنیادیں فراہم کیں۔ان کے علاوہ بعض دوسرے شعرا نے بھی انجمن کے مشاعروں میں شرکت کر کے اس ادبی تحریک کو آگے بڑھانے میں اپنا حصہ ادا کیا۔

محمد حسین آزاؔد

محمد حسین آزاد انجمنِ پنجاب لاہور کے سب سے اہم اور فعال ادبی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔وہ 1830ء کے قریب دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مولوی محمد باقر دہلی کے معروف صحافی اور ادیب تھے۔1857ء کے ہنگامے کے بعد آزاد نے دہلی چھوڑا اور بعد میں لاہور پہنچے، جہاں انہیں علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک سازگار ماحول میسر آیا۔لاہور میں انہوں نے انجمنِ پنجاب کی ادبی سرگرمیوں میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔محمد حسین آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ اردو شاعری میں فطری شاعری کے تصور کو فروغ دینا ہے۔ان کا خیال تھا کہ شاعری کو زندگی اور فطرت کے قریب ہونا چاہیے۔شاعر کو محض قدیم شعری روایت کی تقلید نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنے اردگرد کی دنیا، قدرت کے مناظر، انسانی جذبات اور معاشرتی حالات کو بھی شاعری کا موضوع بنانا چاہیے۔اسی فکر کے تحت انہوں نے موضوعاتی مشاعروں کی روایت کو فروغ دیا۔

آزاد نے انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں متعدد اہم نظمیں پیش کیں۔ان کی نظموں میں فطرت، امید، وطن، اخلاق اور زندگی کے مختلف پہلو نمایاں ہیں۔انہوں نے نظم کو محض تفریح یا عشقیہ اظہار کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اسے انسانی زندگی کی ترجمانی کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی۔ان کی شاعری میں سادگی، فطری اندازِ بیان اور منظر نگاری کی خصوصیات نمایاں ہیں۔محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات صرف شاعری تک محدود نہیں۔وہ ایک اہم نثر نگار، نقاد، مؤرخ اور محقق بھی تھے۔ان کی مشہور تصنیف آبِ حیات اردو ادب کی تاریخ اور تذکرہ نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب میں اردو کے اہم شعرا کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارناموں کو دلچسپ اور ادبی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس

کے علاوہ نیرنگِ خیال اور دیگر تصانیف بھی ان کی علمی و ادبی شخصیت کی گواہی دیتی ہیں۔

اردو نظم کے حوالے سے آزاد کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے شاعر کو اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے وابستہ ہونے کا شعور دیا۔ انہوں نے فطرت کو شاعری کا اہم موضوع بنایا اور اردو نظم کو ایک نئی فکری سمت فراہم کی۔ اسی وجہ سے انہیں جدید اردو نظم کے ابتدائی معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

الطاف حسین حالؔی

الطاف حسین حالؔی جدید اردو نظم کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا اصل نام خواجہ الطاف حسین تھا اور ''حالؔی'' ان کا تخلص تھا۔ وہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کا رخ کیا، جہاں اس دور کے ممتاز شعرا اور ادیبوں سے استفادہ کیا۔ بعد میں ان کی ملاقات سر سید احمد خان سے ہوئی اور ان کی اصلاحی و قومی تحریک سے متاثر ہو کر حالی نے اپنی شاعری کو مقصدیت اور اصلاحِ معاشرہ سے وابستہ کیا۔ حالی نے انجمنِ پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں میں شرکت کر کے جدید نظم کی تحریک کو غیر معمولی قوت فراہم کی۔ ان کے ہاں شاعری محض جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ قوم اور معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بھی ہے۔ انہوں نے نظم کو زندگی کے حقیقی مسائل سے جوڑا اور شاعری میں سادگی، حقیقت نگاری، اخلاقی شعور اور قومی احساس کو فروغ دیا۔

انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کے لیے حالی نے متعدد اہم نظمیں لکھیں۔ برکھا رت، نشاطِ امید، حبِ وطن اور مناظر؟ رحم و انصاف ان کی نمایاں نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان نظموں کے ذریعے انہوں نے اردو شاعری میں نئے موضوعات اور نئے فکری رجحانات کو جگہ دی۔ ان کی نظم برکھا رت میں فطرت کے مناظر کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے، جبکہ حبِ وطن میں قومی جذبے کا اظہار ملتا ہے۔ نشاطِ امید میں امید اور زندگی کی مثبت قوت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ حالی کی سب سے بڑی ادبی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کو زندگی سے جوڑ دیا۔ ان کے نزدیک شاعر کا کام صرف خوبصورت الفاظ اور خیالات پیش کرنا نہیں بلکہ اپنے معاشرے کی اصلاح اور انسان کے اخلاقی شعور کو بیدار کرنا بھی ہے۔ ان کی شاعری میں قوم کی زبوں حالی، مسلمانوں کے مسائل، تعلیم کی ضرورت، اخلاقی اصلاح اور قومی بیداری جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔

حالی کی مشہور کتاب مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں انہوں نے شاعری کے مقصد، موضوع، زبان، حقیقت نگاری اور فطرت سے تعلق کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے۔ اس کتاب نے اردو شاعری کے نظریاتی شعور کو نئی بنیاد فراہم کی۔ ان کی طویل نظم مسدسِ حالؔی بھی اردو کی قومی اور اصلاحی شاعری میں غیر معمولی مقام رکھتی ہے۔

حالی نے اردو نظم کو سادگی، مقصدیت، حقیقت نگاری اور اصلاحی فکر عطا کی۔ ان کی کوششوں سے اردو نظم محض عشقیہ اور روایتی مضامین سے نکل کر قومی اور اجتماعی زندگی کی ترجمان بن گئی۔ اسی لیے حالی کو جدید اردو نظم کا ایک اہم ترین معمار کہا جاتا ہے۔

مولوی مقرب علی

مولوی مقرب علی بھی انجمنِ پنجاب کی ادبی سرگرمیوں سے وابستہ اہم شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ انجمنِ پنجاب کے ابتدائی دور میں ایسے متعدد شعراء موجود تھے جنہوں نے موضوعاتی مشاعروں میں شرکت کر کے نئے شعری رجحانات کو فروغ دینے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ مولوی مقرب علی کا شمار بھی انہی شعرا میں کیا جاتا ہے۔ انجمنِ پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان میں شعرا کو مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح شاعر کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ محدود روایتی مضامین کے بجائے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرے۔ مولوی مقرب علی جیسے شعرا کی شرکت نے اس نئی شعری روایت کو وسعت دینے میں مدد کی۔ انجمنِ پنجاب کے مجموعی ادبی ماحول میں ان کی شرکت اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس دور کے شعرا نے نئی نظم کے تجربے کو قبول کیا اور اردو شاعری میں موضوعاتی تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ آزاد اور حالی کی طرح ان کا نام جدید نظم کی تاریخ میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتا، تاہم انجمن کے مشاعروں کی اجتماعی ادبی سرگرمی میں ان کا حصہ قابلِ ذکر ہے۔

الطاف علی

الطاف علی بھی انجمنِ پنجاب لاہور کے مشاعروں سے وابستہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انجمنِ پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں کا مقصد ہی یہ تھا کہ مختلف شعرا کو نئے موضوعات پر اظہارِ خیال کا موقع دیا جائے اور اردو شاعری میں نئے تجربات کی راہ ہموار کی جائے۔ الطاف علی نے بھی اس نئے شعری ماحول میں شرکت کی۔ انجمنِ پنجاب کی تحریک کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس نے شاعری کو اجتماعی ادبی سرگرمی بنا دیا۔ شاعر کسی مقررہ طرحی مصرعے کی پابندی کے بجائے ایک موضوع کو سامنے رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اس طریق؟ کار نے شعرا میں مشاہدے، فکر اور تخلیقی اظہار کی نئی صلاحیتیں پیدا کیں۔ الطاف علی جیسے شعرا کی شرکت بھی اسی ادبی تبدیلی کا حصہ تھی۔

ذوقؔ کاکوروی

ذوقؔ کاکوروی کا نام بھی انجمنِ پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں کے حوالے سے لیا جاتا ہے۔ وہ اس دور کے ان شعرا میں شامل تھے جنہوں نے انجمن کی نئی شعری روایت میں حصہ لیا۔ انجمنِ پنجاب کی سرگرمیوں کا ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ روایتی شاعری سے وابستہ شعرا بھی نئے

موضوعات اور نئے اسلوبِ اظہار کی طرف متوجہ ہوئے۔

ذوقؔ کا کوروی کی شرکت اس اعتبار سے اہم ہے کہ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں نے اردو شاعری میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس میں مختلف شعری مزاج رکھنے والے افراد کو نئے موضوعات پر اظہارِ خیال کا موقع ملا۔اس اجتماعی ادبی سرگرمی نے جدید نظم کی بنیاد کو مضبوط کرنے میں مدد دی۔انجمنِ پنجاب سے وابستہ شعرا کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ انہوں نے اردو شاعری کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔انہوں نے شاعری کو محض عشق و محبت اور روایتی مضامین تک محدود رکھنے کے بجائے اسے فطرت، وطن، اخلاق، معاشرت، انسانی زندگی اور قومی مسائل سے وابستہ کیا۔اس طرح اردو نظم میں مقصدیت اور حقیقت نگاری کا رجحان پیدا ہوا۔

انجمن کے مشاعروں میں موضوعاتی شاعری کو فروغ ملا۔شاعر کو کسی خاص موضوع پر نظم کہنے کے لیے کہا جاتا تھا، جس کے نتیجے میں اس کی توجہ اپنے اردگرد کی دنیا اور حقیقی زندگی کی طرف مبذول ہوئی۔اس تجربے نے اردو نظم کو ایک نئی فکری بنیاد فراہم کی۔ان شعراء نے زبان و بیان کے حوالے سے بھی نئی راہیں پیدا کیں۔روایتی شاعری کی نسبت ان کی نظموں میں نسبتاً سادہ، واضح اور عام فہم زبان استعمال ہوئی۔اس سے نظم کا دائرۂ اثر وسیع ہوا اور شاعری عام انسانی زندگی کے زیادہ قریب آ گئی۔انجمنِ پنجاب کی تحریک نے فطرت نگاری کو بھی فروغ دیا۔برسات، بہار، صبح، شام، پھول، درخت، موسم اور قدرت کے دوسرے مظاہر کو شاعری کا موضوع بنایا گیا۔محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ نے خاص طور پر فطرت کے مشاہدے کو اہمیت دی اور اس کے ذریعے انسانی جذبات و خیالات کی ترجمانی کی۔

اسی طرح انجمنِ پنجاب کے شعرا نے قومی اور اصلاحی شاعری کی بنیاد مضبوط کی۔حالی کی شاعری میں قومی احساس اور اصلاحی فکر نمایاں طور پر سامنے آئی۔شاعری کو قوم کی بیداری، اخلاقی تربیت اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنانے کا رجحان بعد میں اردو نظم کی ایک اہم خصوصیت بن گیا۔انجمنِ پنجاب کی سب سے بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اردو نظم کے لیے ایک ایسا راستہ ہموار کیا جس پر بعد میں اقبالؔ، چکبستؔ، اکبرؔ الہ آبادی اور دیگر نظم گو شعراء نے سفر کیا۔یوں انجمنِ پنجاب نے قدیم اور جدید شعری روایت کے درمیان ایک اہم پُل کا کام انجام دیا۔

انجمنِ پنجاب لاہور اردو ادب کی تاریخ میں جدید نظم کے ارتقا کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔اس انجمن سے وابستہ شعراء نے اردو شاعری کو نئے موضوعات، نئے افکار اور نئے شعری رویوں سے روشناس کرایا۔محمد حسین آزادؔ نے فطری اور موضوعاتی شاعری کا تصور پیش کر کے جدید نظم کی بنیاد مضبوط کی، جبکہ الطاف حسین حالیؔ نے نظم کو اصلاح، قومی بیداری، اخلاق اور حقیقت نگاری سے وابستہ کر کے اسے ایک بامقصد صنف بنایا۔ مولوی مقرب علی، الطاف علی اور ذوقؔ کا کوروی جیسے شعراء نے بھی انجمن کی اجتماعی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لے کر اس تحریک کو تقویت دی۔

اس طرح انجمنِ پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں نے اردو شاعری کو روایتی دائرے سے نکال کر زندگی کے وسیع تر میدان سے وابستہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انجمنِ پنجاب کو جدید اردو نظم کے ابتدائی اور اہم مراکز میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کے نمائندہ شعرا کو اردو نظم کی جدید روایت کے اولین معماروں میں اہم مقام حاصل ہے۔

2.2.2: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں!

سوال1: انجمنِ پنجاب لاہور کا قیام کب عمل میں آیا؟

(الف) 1857ء (ب) 1865ء

(ج) 1877ء (د) 1885ء

سوال2: انجمنِ پنجاب لاہور کے قیام میں کس شخصیت نے اہم کردار ادا کیا؟

(الف) محمد حسین آزاد (ب) میر تقی میر

(ج) مرزا غالب (د) فراق گورکھپوری

سوال3: انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں کس طرز کی شاعری کی حوصلہ افزائی کی گئی؟

(لف) صرف غزل (ب) جدید اور موضوعاتی نظم

(ج) صرف قصیدہ (د) صرف مرثیہ

سوال4: انجمنِ پنجاب لاہور سے وابستہ نمایاں شاعر کون تھے؟

الف) محمد حسین آزاد (ب) ولی دکنی

(ج) میر انیس (د) ذوق

سوال5: محمد حسین آزاد نے اردو نظم میں کس رجحان کو خاص طور پر فروغ دیا؟

(الف) فطرت نگاری (ب) داستان گوئی

(ج) مرثیہ نگاری (د) قصیدہ نگاری

2.3: عمومی جائزہ

انجمنِ پنجاب لاہور اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم ادبی ادارہ ہے جس نے اردو شاعری کو روایتی راستے سے نکال کر جدید رجحانات کی طرف متوجہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی میں برصغیر کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ مغربی تعلیم، جدید علوم اور نئے افکار کے اثرات ہندوستانی معاشرے پر پڑ رہے تھے۔ اردو ادب بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوا اور شاعری میں نئے موضوعات اور نئے اندازِ اظہار کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ انجمنِ پنجاب لاہور کا قیام اسی ادبی اور فکری ماحول کا نتیجہ تھا۔ اس انجمن نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ شاعری میں جدت اور اصلاح کی تحریک کو بھی آگے بڑھایا۔ محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد سمیت کئی اہلِ علم نے اس ادبی ماحول کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انجمن کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعروں نے اردو شاعری کی نئی سمت متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

محمد حسین آزاد نے روایتی شاعری کے بجائے ایسی شاعری کی ضرورت پر زور دیا جو زندگی، فطرت اور معاشرے سے گہرا تعلق رکھتی ہو۔ ان کے زیرِ اثر انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں موضوعاتی نظموں کو فروغ ملا۔ ان نظموں میں فطرت، قومی زندگی، اخلاق، معاشرتی اصلاح اور انسانی جذبات جیسے موضوعات کو جگہ دی گئی۔ یوں شاعری محض روایتی عشق و محبت اور محدود شعری مضامین تک مقید نہ رہی بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمان بننے لگی۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں نے اردو نظم کی ہیئت اور موضوعات دونوں پر اثر ڈالا۔ شعرا نے فطرت کے مناظر، قومی احساسات اور معاشرتی مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا۔ اس طرح اردو نظم میں حقیقت نگاری، مقصدیت، فطرت نگاری اور قومی شعور کے عناصر نمایاں ہوئے۔ اگرچہ انجمنِ پنجاب کی تحریک مکمل طور پر جدید نظم کی آخری منزل نہیں تھی، تاہم اس نے جدید اردو نظم کے لیے بنیادی زمین ہموار کی۔

اس انجمن کی سب سے بڑی ادبی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کو نئے موضوعات، نئے خیالات اور نئے شعری مزاج سے آشنا کیا۔ حالی، محمد حسین آزاد اور ان کے ہم عصر شعرا نے نظم کو زندگی سے قریب کیا۔ بعد میں ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق اور جدیدیت کی تحریکوں نے اسی سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔ اس طرح انجمنِ پنجاب لاہور کو جدید اردو نظم کے ارتقاء کی ابتدائی اور اہم کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔

2.4: فرہنگ

انجمن : مجلس، تنظیم

قیام	:	وجود میں آنا
ارتقاء	:	ترقی ،نشو ونما
رجحان	:	میلان، رغبت
اصلاح	:	بہتری، درستگی
تجدید	:	نیا پن پیدا کرنا
موضوعاتی	؛	کسی خاص موضوع سے متعلق
مشاعرہ	:	شعرا کی ادبی مجلس
فطرت نگاری	:	قدرتی مناظر کی عکاسی
مقصدیت	:	کسی مقصد سے وابستگی
حقیقت نگاری	:	حقیقت کو بیان کرنا
قومی شعور	:	قوم کے بارے میں احساس وآگہی
معاشرتی	:	معاشرے سے متعلق
تہذیبی	:	تہذیب سے متعلق
عصری	:	موجودہ زمانے سے متعلق
روایت	:	قدیم سے چلا آنے والا طریقہ
جدت	:	نیا پن
اصلاحی	:	اصلاح سے متعلق
بیداری	:	آگہی، شعور
ترجمان	:	نمائندہ، اظہار کرنے والا

2.5: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: انجمنِ پنجاب لاہور کے قیام کے اسباب اور اس کے ادبی مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

سوال2: محمد حسین آزاد نے انجمنِ پنجاب لاہور کے ذریعے اردو نظم کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا؟

سوال3: انجمنِ پنجاب کے مشاعروں نے اردو نظم کی ہیئت اور موضوعات کو کس طرح متاثر کیا؟

سوال4: انجمنِ پنجاب لاہور کو جدید اردو نظم کے ارتقاء کی اہم کڑی کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

2.6 : مشقی سوالات

سوال1: انجمنِ پنجاب لاہور کے قیام کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

سوال2: محمد حسین آزاد کی نظمِ جدید کے سلسلے میں خدمات بیان کیجیے۔

سوال3: انجمنِ پنجاب کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعروں کی ادبی اہمیت بیان کیجیے۔

سوال4: انجمنِ پنجاب لاہور نے اردو نظم کو روایتی شاعری سے جدید شاعری کی طرف منتقل کرنے میں کیا کردار ادا کیا؟

2.7: مشقی سوالات کے جوابات

1 (ج) 1877ء

2 (الف) محمد حسین آزاد

3 (ب) جدید اور موضوعاتی نظم

4 (الف) محمد حسین آزاد

5 (الف) فطرت نگاری

2.8: مشقی سوالات کے جوابات

سوال1: انجمنِ پنجاب لاہور کے قیام کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

جواب: انجمنِ پنجاب لاہور کے قیام کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی ترقی اور اس کے ذریعے معاشرے میں علمی و ادبی شعور پیدا کرنا تھا۔

انجمن نے اردو شاعری کو روایتی موضوعات اور محدود دائرے سے نکال کر زندگی کے حقیقی مسائل اور جدید افکار سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس کے ذریعے نئے ادبی رجحانات کو فروغ ملا اور شعرا کو نئے موضوعات پر اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا گیا۔ انجمن نے مشاعروں اور ادبی سرگرمیوں کے ذریعے اردو شاعری میں اصلاح، مقصدیت اور جدت کے رجحانات کو مضبوط کیا۔

سوال 2: محمد حسین آزاد کی نظمِ جدید کے سلسلے میں خدمات بیان کیجیے۔

جواب: محمد حسین آزاد نے اردو نظم کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے شاعری کو محض روایتی موضوعات تک محدود رکھنے کے بجائے اسے زندگی، فطرت اور معاشرے سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کے ذریعے موضوعاتی اور فطرت پر مبنی نظموں کی حوصلہ افزائی کی۔ آزاد کا خیال تھا کہ شاعری میں اپنے زمانے اور اپنے ماحول کی عکاسی ہونی چاہیے۔ ان کی کوششوں سے اردو نظم میں فطرت نگاری، مقصدیت، قومی احساس اور حقیقت پسندی کے عناصر کو فروغ ملا۔ اسی وجہ سے انہیں جدید اردو نظم کے ابتدائی معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سوال 3: انجمنِ پنجاب کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعروں کی ادبی اہمیت بیان کیجیے۔

جواب: انجمنِ پنجاب کے مشاعرے اردو ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مشاعروں میں روایتی غزل کے بجائے مخصوص موضوعات پر نظم کہنے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ شعرا نے فطرت، قومی زندگی، اخلاق، معاشرتی اصلاح اور انسانی جذبات جیسے موضوعات پر نظمیں پیش کیں۔ اس عمل سے شاعری میں موضوعاتی وسعت پیدا ہوئی اور نظم کو ایک باقاعدہ ادبی صنف کی حیثیت حاصل ہونے لگی۔ انجمن کے مشاعروں نے نئے شعری ذوق کو فروغ دیا اور بعد میں آنے والی جدید نظم کے لیے راہ ہموار کی۔

سوال 4: انجمنِ پنجاب لاہور نے اردو نظم کو روایتی شاعری سے جدید شاعری کی طرف منتقل کرنے میں کیا کردار ادا کیا؟

جواب: انجمنِ پنجاب لاہور نے اردو نظم کو روایتی شاعری سے جدید شاعری کی طرف منتقل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے اردو شاعری میں غزل اور دیگر روایتی اصناف کا غلبہ تھا اور شاعری کے موضوعات بھی بڑی حد تک روایتی تھے۔ انجمن نے شاعروں کو نئے موضوعات اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ فطرت، قومی زندگی، معاشرتی اصلاح، اخلاق اور انسانی مسائل کو نظم کا موضوع بنایا گیا۔ محمد حسین آزاد کی کوششوں سے موضوعاتی مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا، جس نے نظم کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی۔ اس طرح انجمنِ پنجاب نے اردو شاعری میں جدت، مقصدیت، حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کو فروغ دیا اور جدید اردو نظم کے ارتقاء کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی۔

2.9:امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

سبق نمبر 3۔ ترقی پسند تحریک اور نظم جدید

ساخت

3.0 اغراض ومقاصد
3.1 تعارف
3..2 ترقی پسند تحریک سے قبل اردو نظم
3.2.1 ترقی پسند تحریک اور نظم جدید
3.2.2 فیض احمد فیضؔ
3.2.3 علی سردار جعفریؔ
3.2.4 مخدومؔ محی الدین
3.2.5 معین احسن جذبیؔ
3.2.6 اسرار الحق مجازؔ
3.2.7 کیفیؔ اعظمی
3.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں
3.4 عمومی جائزہ
3.5 فرہنگ
3.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
3.7 مشقی سوالات
3.8 جوابات سرگرمی اور مشقی سوالات کے جوابات
3.9 امدای کتب

3.0:اغراض ومقاصد

عزیز متعلم ! اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو ترقی پسند تحریک کے فکری، سماجی اور ادبی پس منظر سے آگاہ کرنا اور یہ سمجھانا ہے کہ اس تحریک نے اردو ادب، بالخصوص جدید اردو نظم کی تشکیل و ترقی میں کیا کردار ادا کیا۔ آپ کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ترقی پسند ادب نے ادب کو محض حسن و عشق اور ذاتی جذبات کے اظہار تک محدود رکھنے کے بجائے اسے زندگی کے حقیقی مسائل، سماجی ناہمواری، معاشی استحصال، طبقاتی تفریق، غربت، غلامی اور انسانی آزادی جیسے موضوعات سے وابستہ کیا۔ اس سبق کے ذریعے آپ جدید نظم کی فکری خصوصیات، موضوعاتی وسعت اور ہیئتی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں گے اور ترقی پسند شعرا کے ہاں عوامی زندگی، محنت کش طبقے، قومی آزادی اور انسانی مساوات کے تصورات کا مطالعہ کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کرنا بھی اس سبق کا مقصد ہے کہ وہ ترقی پسند نظم کو اس کے تاریخی اور سماجی تناظر میں پرکھ سکیں اور ترقی پسند تحریک کے اثرات کو اردو نظم کے ارتقا کے ساتھ مربوط کر کے دیکھ سکیں۔ اس سبق سے آپ کو فیض احمد فیضؔ، جوشؔ ملیح آبادی، مخدومؔ محی الدین، مجازؔ، ساحرؔ لدھیانوی اور دیگر ترقی پسند شعراء کی شعری خدمات کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

3.1:تعارف

اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک ایک اہم اور مؤثر ادبی تحریک کی حیثیت رکھتی ہے جس نے اردو شاعری اور نثر کے موضوعات، مقاصد اور اسلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں برصغیر کا معاشرہ سیاسی غلامی، معاشی ناہمواری، طبقاتی استحصال، غربت، بے روزگاری اور سامراجی نظام جیسے مسائل سے دوچار تھا۔ دوسری طرف دنیا میں بھی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ روسی انقلاب، آزادی کی تحریکوں، اشتراکی فکر اور انسانی مساوات کے تصورات نے برصغیر کے اہلِ قلم کو متاثر کیا۔ ایسے حالات میں ادب کو زندگی کے حقیقی مسائل سے وابستہ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔

ترقی پسند تحریک نے اسی ضرورت کو پورا کیا۔ 1936ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کے انعقاد کے ساتھ اس تحریک کو باقاعدہ ادبی تحریک کی صورت حاصل ہوئی۔ اس تحریک کا مقصد ادب کو سماج سے مربوط کرنا اور اسے انسانی زندگی کی بہتری، آزادی، مساوات اور انصاف کے حصول کا ذریعہ بنانا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کا خیال تھا کہ ادب صرف تفریح یا محض جمالیاتی مسرت کا وسیلہ نہیں بلکہ وہ معاشرے کے دکھوں، مسائل اور محرومیوں کی ترجمانی بھی کر سکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے اثرات اردو نظم پر نہایت نمایاں ہوئے۔ جدید اردو نظم پہلے ہی روایتی شعری موضوعات اور ہیئتی پابندیوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اسے ایک نیا فکری اور سماجی شعور عطا کیا۔ چنانچہ نظم میں مزدور، کسان، عورت، بھوک، غربت، جنگ، آزادی، انقلاب، استحصال، سامراج دشمنی اور انسانی مساوات جیسے موضوعات داخل ہوئے۔ شاعر نے اپنے ذاتی احساسات کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، مخدوم محی الدین، مجاز، ساحر لدھیانوی اور علی سردار جعفری جیسے شعراء نے ترقی پسند فکر کو اردو نظم کے ذریعے عام کیا۔ ان کی نظموں میں رومان اور انقلاب، محبت اور اجتماعی درد، حسن اور حقیقت، فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کی مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یوں ترقی پسند تحریک نے جدید اردو نظم کو محض ایک شعری صنف کے طور پر نہیں بلکہ سماجی شعور، انسانی ہمدردی اور تبدیلی کے احساس کی مؤثر آواز بنا دیا۔ اس اعتبار سے ترقی پسند تحریک اور جدید نظم کا تعلق اردو ادب کی تاریخ میں نہایت اہم ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جدید نظم کو نئے موضوعات، نئے فکری زاویوں اور نئے سماجی شعور سے مالا مال کیا، جبکہ جدید نظم نے ترقی پسند افکار کو مؤثر شعری اظہار فراہم کیا۔

3.2 ترقی پسند تحریک سے قبل اردو نظم

ترقی پسند تحریک کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس سے قبل اردو نظم کی صورتِ حال کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ہندوستانی معاشرے کی فکری اور سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس واقعے کے بعد ہندوستانی عوام میں سیاسی اور سماجی شعور کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی۔ لوگ اپنے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ صرف ہندوستان کے محدود دائرے میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے تناظر میں بھی کرنے لگے۔ دنیا میں اشتراکی نظریات تیزی سے پھیل رہے تھے اور ہندوستانی اہلِ فکر بھی ان سے متاثر ہو رہے تھے۔ اسی زمانے میں نازی فوجوں کے ظلم و ستم اور جنگی تباہ کاریوں نے پوری انسانیت کو متاثر کیا۔ ان حالات کے نتیجے میں مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ مفکرین، دانشوروں اور اہلِ قلم نے اس نئے عہد کے مسائل اور بدلتے ہوئے حالات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا شروع کیا۔ فطری طور پر ان تبدیلیوں کے اثرات ادب پر بھی پڑے اور اردو ادب نے بھی اپنے عہد کے مسائل کو موضوع بنانا شروع کیا۔

اردو نثر میں مغرب سے متاثر ہو کر متعدد نئی اصناف سامنے آئیں، جب کہ شاعری میں مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی

نے ایک نئی فکری اور فنی راہ ہموار کی۔ انجمنِ پنجاب کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعروں نے اردو نظم کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان مشاعروں میں روایتی مصرعِ طرح کے بجائے کسی خاص موضوع یا عنوان پر نظم لکھنے کا رواج پیدا ہوا۔ اس طریقے سے اردو شاعری میں فطرت، قومی زندگی اور معاشرتی مسائل سے متعلق موضوعات کو جگہ ملنے لگی اور جدید اردو نظم کے لیے ایک مضبوط بنیاد قائم ہوئی۔

انگریزی نظموں کے تراجم نے بھی اردو نظم کے دائرے کو وسیع کرنے میں مدد دی۔ ان مشاعروں میں مولانا محمد حسین آزاد نے مثنوی شبِ قدر، زمستان، صبحِ امید، حبِ وطن اور قناعت جیسی نظمیں پیش کیں، جب کہ الطاف حسین حالی نے نشاطِ امید، برکھارت اور مناظرہ رحم و انصاف جیسی نظمیں سنائیں۔ سرسید احمد خاں کی تحریک پر حالی نے ''مسدسِ مدوجزرِ اسلام'' لکھی جس نے اردو نظم کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ آزاد اور حالی کے ساتھ ساتھ متعدد دوسرے شعرا بھی نظم نگاری کی اس نئی روایت سے وابستہ ہوئے۔ ان میں علامہ شبلی نعمانی، اسماعیل میرٹھی، عظمت اللہ خاں، نظم طباطبائی، سرور جہاں آبادی، علامہ اقبال، برج نرائن چکبست، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور اختر شیرانی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان شعراء نے اردو نظم کے موضوعاتی اور فنی دائرے کو وسعت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

3.2.1 : ترقی پسند تحریک اور نظم جدید

عزیز متعلم! اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تشکیل و ترقی میں مختلف ادبی تحریکوں اور رجحانات نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ادب کے موضوعات، اسلوب اور اندازِ اظہار میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب اپنے ہر عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ادبی شعور کے ارتقا نے نہ صرف ادب کو نئے موضوعات عطا کیے بلکہ اس کے فروغ اور وسعت کے امکانات بھی پیدا کیے۔ ترقی پسند تحریک کے ظہور سے پہلے اردو ادب میں مختلف فکری اور ادبی تحریکیں سرگرم رہ چکی تھیں۔ ان میں رومانوی تحریک اور اس کے بعد علی گڑھ تحریک کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں نے اردو نثر کی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں سوانح نگاری، مضمون نگاری، تاریخ نویسی اور ناول نگاری جیسی اصناف کو فروغ حاصل ہوا، جب کہ تنقید کے لیے بھی نئے امکانات پیدا ہوئے۔ علی گڑھ تحریک نے اردو نثر کو تکلف، تصنع اور مقفیٰ و مسجع عبارت کی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور اسے زندگی کے حقیقی مسائل سے قریب کیا۔

شاعری کے میدان میں بھی اس دور میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جدید نظم کی بنیاد مضبوط ہوئی اور انجمنِ پنجاب کے مشاعروں نے اس

کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے اردو شاعری کو روایتی راستوں سے نکال کر ایک نئی سمت عطا کی۔ ان کے بعد اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا ظہور ہوا۔ اس تحریک نے اپنے واضح نظریات، مقاصد اور منشور کے ساتھ ادبی میدان میں قدم رکھا اور ادب کے مزاج کو ایک نئی فکری سمت دینے کی کوشش کی۔ اس کے اثرات اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف پر مرتب ہوئے اور ہر صنف نے اپنے موضوعات اور اندازِ بیان میں کسی نہ کسی سطح پر تبدیلی محسوس کی۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی نقوش لندن میں مقیم ان ہندوستانی نوجوانوں کی سرگرمیوں میں نظر آتے ہیں جو ہندوستان کو سیاسی، سماجی اور معاشی غلامی سے نجات دلانے کے خواہش مند تھے۔ ان میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر اور پرمود سین گپتا وغیرہ شامل تھے۔ ان نوجوانوں نے ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام کی بنیاد رکھی اور اس کے مقاصد و تجاویز مرتب کر کے ہندوستان بھیجیں۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد اس تحریک کو منشی پریم چند جیسے عظیم ادیب کی بھرپور حمایت حاصل ہوئی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد ادب کو زندگی کا ترجمان بنانا اور تخلیق کار کے ذریعے سماج کے محروم، مظلوم اور پس ماندہ طبقات کی آواز کو سامنے لانا تھا۔ اس کا اثر اردو شاعری پر بھی براہِ راست پڑا اور اردو نظم نے بھی اپنے موضوعات اور انداز میں نمایاں تبدیلی اختیار کی۔

عزیز متعلم! جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں، ترقی پسند تحریک کی بنیاد لندن میں مقیم مختلف ہندوستانی زبانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان ادیبوں نے رکھی۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی۔ اس تنظیم میں سجاد ظہیر، انگریزی کے معروف ادیب ملک راج آنند، بنگالی ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور اردو کے ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ ان ادیبوں نے انجمن کا منشور مرتب کر کے ہندوستان بھیجا، جہاں اسے منشی پریم چند کی بھرپور حمایت حاصل ہوئی۔

اس تحریک کا بنیادی مقصد ادب کے ذریعے ہندوستان کو غلامی، مظلومیت اور پستی کی کیفیت سے نکالنے کی کوشش کرنا تھا۔ ترقی پسند ادیب ادب کو محض تفریح یا حسن و جمال کے اظہار کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے معاشرتی تبدیلی اور انسانی بیداری کا مؤثر وسیلہ قرار دیتے تھے۔

ترقی پسند تحریک کے منشور اور اس کے مقاصد کو اس عہد کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے پسند کیا۔ مختلف زبانوں کے دانشوروں اور اہلِ قلم کے علاوہ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر اعجاز حسین، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، جوش ملیح آبادی، عصمت چغتائی، ڈاکٹر احتشام حسین اور فراق گورکھپوری وغیرہ نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔

اس تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کے رفاہِ عام کلب میں منعقد ہونے والی پہلی آل انڈیا پروگریسو رائٹرز کانفرنس سے

ہوا۔اس کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔اپنے تاریخی صدارتی خطبے میں انہوں نے ادب کے روایتی معیار کو بدلنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا:"ہمیں حسن کا میعار تبدیل کرنا ہوگا۔ابھی تک اس کا میعار امیرانہ اور عیش پروانہ تھا۔ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔انہی کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں،حسرتوں اور تمناؤں،چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں،جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے انہیں وہ انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھتا تھا"۔

پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ترقی پسند ادیبوں کے بنیادی مقاصد اور ادبی ترجیحات کی بھی وضاحت کی۔ان کے الفاظ تھے:

> "ہماری انجمن نے کچھ اس طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان میں قدم رکھا ہے۔وہ ادب کو خمریات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتی۔وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے،اسے زبان سے بحث نہیں، آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔"

پریم چند کے ان خیالات نے اردو شاعری کو بھی گہرائی سے متاثر کیا۔اردو شاعری جو طویل عرصے تک قصیدہ،مرثیہ اور مثنوی جیسی اصناف کے روایتی حصار میں ایک مخصوص تخیلی فضا سے وابستہ رہی تھی،انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کے نتیجے میں زندگی کے حقیقی مسائل کی طرف متوجہ ہوئی۔ان مشاعروں نے نظم کے موضوعات کو وسعت دی اور قومی،ملی اور معاشرتی موضوعات کے ساتھ مظاہرِ فطرت کو بھی شاعری کا حصہ بنایا۔یوں اردو شاعری حقیقت اور زندگی کے قریب آتی گئی۔ترقی پسند تحریک نے جب اردو ادب پر اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کیے تو اردو نظم کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ ہیئت کے میدان میں بھی مختلف تجربات کیے گئے۔تاہم ترقی پسند شعرا کی بنیادی توجہ مقصدیت اور پیغام رسانی پر مرکوز رہی۔

ترقی پسند تحریک سے قبل اردو نظم پابند نظم،نیم پابند نظم اور نظمِ معریٰ کی مختلف صورتوں میں لکھی جا رہی تھی۔ان میں پابند نظم کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ترقی پسند شعرا کے نزدیک ادب کا بنیادی مقصد زندگی کے مسائل کی ترجمانی اور عوام تک اپنا پیغام پہنچانا تھا۔اسی لیے ہیئت کی پیچیدگی کے بجائے موضوع اور مقصد کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ان کا خیال تھا کہ اگر شاعر ہیئت اور اسلوب کی غیر ضروری پیچیدگیوں میں الجھ جائے تو ادب کا اصل مقصد متاثر ہو سکتا ہے۔چنانچہ آزاد نظم کو بھی فروغ ملا تاکہ خیالات اور پیغام کو زیادہ مؤثر اور آسان انداز میں عوام تک پہنچایا جا سکے۔ڈاکٹر عبدالعلیم نے ترقی پسند ادیبوں کے لیے اسلوب اور ہیئت کے حوالے سے نہایت اہم بات کہی ہے:

"ترقی پسند ادیبوں کے لیے اسلوب اور طرز ادا کا سوال موضوع سے اس طرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ ادب کے مسلمہ اسلوبوں کو اس وقت تک ترک نہ کریں جب تک وہ بالکل ناموزوں نہ ثابت ہو جائیں۔ اس بات کی ہمیشہ احتیاط کرنی چاہیے کہ نئے اسالیب کے گورکھ دھندے میں کہیں ان کا مقصد اور مطلب ہی خبط نہ ہو جائے۔ نت نئے اسلوب کی تلاش درحقیقت ایک طرح کی خود پرستی اور انفرادیت پسندی ہے جس سے ترقی پسند ادیب کو بچنا چاہئے۔'' اس طرح ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کو محض جذبات اور تخیل کی شاعری تک محدود رکھنے کے بجائے اسے زندگی، سماج، سیاست، معاشرت، غربت، استحصال، آزادی، مساوات اور انسانی حقوق جیسے مسائل سے جوڑ دیا۔ نظم زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمان بن گئی اور شاعر نے اپنے عہد کے اجتماعی دکھ، محرومی، ناانصافی اور امید کو شعری اظہار عطا کیا۔ یوں ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کے موضوعاتی دائرے کو وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ایک نئے سماجی اور فکری شعور سے بھی ہم کنار کیا۔

یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند شعرا نے ہیئت کے غیر ضروری تجربات کے بجائے ایسی ہیئتوں کو ترجیح دی جو ان کے موضوع اور مقصد کے اظہار میں زیادہ معاون ثابت ہو سکیں۔ چنانچہ روایتی اصنافِ نظم مثلاً مثنوی، مسدس، مخمس وغیرہ کے ساتھ آزاد نظم، نظمِ معریٰ، نیم آزاد نظم اور بعض مغربی ہیئتوں میں بھی شاعری ہونے لگی۔ اس تبدیلی کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ نظم نے غزل کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ترقی پسند شعرا کی ایک بڑی تعداد نے آزاد نظم کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ فیض احمد فیض کی نظم ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے''، مخدوم محی الدین کی ''اندھیرا''، ''چاند تاروں کا بن''، ''لختِ جگر''، علی سردار جعفری کی ''نئی دنیا کو سلام''، ''ایک خواب اور''، ''لہو پکارتا ہے''، ''اودھ کی خاکِ حسیں'' وغیرہ آزاد نظم کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ترقی پسند شعرا نے طویل نظموں کی طرف بھی توجہ دی۔ اس سلسلے میں علی سردار جعفری کی ''نئی دنیا کو سلام''، جاں نثار اختر کی ''امن نامہ'' اور کیفی اعظمی کی ''اندیشے'' کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر ترقی پسند نظم کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں زندگی براہِ راست ادب کا حصہ بن گئی۔ نظم نے عام انسان کی زندگی اور اس کے مسائل کی ترجمانی شروع کر دی۔ حبِ وطن، انقلاب، اشتراکیت اور رومانیت کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام میں غریب اور محنت کش طبقے کے استحصال، مطلق العنانی، آزادی، مساوات اور انسان دوستی جیسے موضوعات بھی نظم کا حصہ بن گئے۔ شاعر نے اپنے عہد کے اہم سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو شعری اظہار عطا کیا۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں وطن سے محبت، وطن کی آزادی اور عوام میں آزادی کا شعور پیدا کرنا نظم کے اہم موضوعات میں

شامل تھا۔اس زمانے میں جوش کی ''وطن''، ''لمح؟ آزادی''، ''آثارِ انقلاب''، علی سردار جعفری کی ''جنگ اور انقلاب''، ''آزادی''، ''صبحِ فردا''، ''امن کا ستارا''، مخدوم کی ''جنگ''، ''مشرق''، ''آزادیِ وطن''، ''باغی''، ''جہانِ نو''، ''مستقبل''، ''انقلاب''، مجاز کی ''سرمایہ داری''، ''خوابِ سحر''، ''انقلاب''، ''پردہ وعصمت''، اسی طرح کیفی اعظمی کی ''خانہ جنگی''، ''قومی اخبار''، ''لال جھنڈا''، ''بلغار''، ''آزادی''، ''نئی جنت'' اور جاں نثار اختر کی ''اتحاد''، ''بیدار ہے انسان بیدار''، ''عزم''، ''امن نامہ'' وغیرہ جیسی نظمیں سامنے آئیں۔

جیسے جیسے ملک کے سیاسی اور سماجی حالات میں تبدیلیاں آتی گئیں، ویسے ویسے شاعری کے موضوعات بھی تبدیل ہوتے گئے۔دوسرے لفظوں میں شاعر کے جذبات واحساسات نے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ شاعری کے منظرنامے کو بھی نئی شکل دی۔ ہندوستان کی آزادی اور اس کے ساتھ ہونے والی تقسیمِ ہند نے بھی ترقی پسند شعرا کو نئے موضوعات فراہم کیے۔ملک میں پیش آنے والا کوئی اہم واقعہ ہو یا بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والا ایسا واقعہ جس کا تعلق ہندوستان یا یہاں کے عوام سے ہو، وہ نظم کا موضوع بن سکتا تھا۔گویا ہر وہ مسئلہ جس سے عوام، معاشرے یا ملک کی زندگی متاثر ہوتی تھی، ترقی پسند شاعر کے لیے شعری اظہار کا جواز بن جاتا تھا۔

اس دور میں شاعر نے ذاتی اور داخلی کیفیات کے بجائے اجتماعی مسائل کو زیادہ اہمیت دینا شروع کردی۔ یہاں تک کہ محبوب کی محبت بھی اس کی شاعری میں اس وقت ثانوی حیثیت اختیار کرگئی جب سماج کے بڑے مسائل اس کے سامنے موجود تھے۔شاعر محبوب کی محبت کا خواہش مند ضرور تھا، لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ محبوب اس کے انقلابی سفر میں شریک ہو۔اگر محبوب اس راستے پر اس کا ساتھ نہ دے سکا تو شاعر نے اپنی ذاتی محبت سے بھی گریز اختیار کیا۔

فیض احمد فیضؔ کی مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' اسی احساس کی نمائندگی کرتی ہے۔اسی طرح علی سردار جعفری کی نظم ''انتظار نہ کرنا'' میں شاعر کہتا ہے:

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرورِ عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے سازِ محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں، پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

مجاز اپنی نظم ''نوجوان خاتون سے خطاب'' میں محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تیرے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو سازِ بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

درحقیقت ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا نے فرد کی ذاتی کیفیات کے مقابلے میں اجتماعی زندگی کے مسائل کو زیادہ اہمیت دی۔ ان کے نزدیک شاعر کا تعلق صرف اپنی ذات، جذبات اور ذاتی تجربات تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے پورے معاشرے کے دکھ، محرومی اور مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنانا چاہیے۔ ان مسائل میں سیاسی اور معاشی مسائل کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات نمایاں ہوجاتی ہے کہ اردو نظم نے اس دور میں ایک نئے عہد میں قدم رکھا۔ ترقی پسند شعرا کی نظموں نے عوام میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے، انہیں اپنے حقوق سے آگاہ کرنے اور نئے فکری ماحول سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے مقصد اور نظریے سے متاثر ہوکر اس دور کے متعدد شعراء نے نظم نگاری کو اپنے اظہار کا اہم وسیلہ بنایا۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا میں فیض احمد فیضؔ، مخدومؔ محی الدین، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجازؔ، معین احسن جذبیؔ، ساحرؔ لدھیانوی، جاں نثارؔ اختر، مجروحؔ سلطان پوری، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان شعراء نے ترقی پسند نظریے کی حمایت کرتے ہوئے انسان دوستی، سامراجی طاقتوں سے آزادی، مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقے کے حقوق، معاشی و سماجی عدم مساوات اور وطن کی آزادی کے لیے جاری جدوجہد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کا یقین تھا کہ ادب محض حسن و جمال کی عکاسی نہیں بلکہ سماجی تبدیلی اور انسانی بیداری کا مؤثر ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ اسی اعتبار سے ترقی پسند تحریک اردو ادب کی سب سے مؤثر اور پُرجوش تحریکوں میں شمار ہوتی ہے۔

ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے اہم شعراء میں فیض احمد فیضؔ، علی سردار جعفری، معین احسن جذبیؔ، مخدومؔ محی الدین، کیفی اعظمی، ساحرؔ لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، اسرار الحق مجازؔ، اختر الایمان، اختر سعید خاں، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، مغیب الرحمٰن، شاد عارفی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے چند اہم شعراء کے فن اور شاعری کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

3.2.2 : فیض احمد فیضؔ

ترقی پسند تحریک کی آواز پر لبیک کہنے والے شعرا میں فیض احمد فیض کا مقام نہایت اہم ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ترقی پسند فکر کو نہ صرف تقویت پہنچائی بلکہ اسے ایک مؤثر اور دل نشیں شعری زبان بھی عطا کی۔فیض نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا،لیکن بعد میں نظم کی طرف بھی پوری توجہ مبذول کی۔ان کی شاعری میں رومانیت اور ترقی پسند فکر کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔فیض اپنے عہد کے سیاسی،سماجی اور معاشرتی حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد،غربت،بھوک،طبقاتی کشمکش،ظلم اور استحصال جس ماحول کو جنم دے رہے تھے،فیض نے اسے نہایت گہرائی سے محسوس کیا۔ان کے پاس ان تجربات اور احساسات کو مؤثر شعری پیکر عطا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے مختلف مسائل،مثلاً بھوک،غربت،سرمایہ داری،ظلم، جبر اور استبداد کو اپنی نظموں میں موضوع بنایا اور ناانصافی کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ان کی مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کم خواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے۔

فیض احمد فیضؔ کی نظموں میں رومانیت اور حقیقت پسندی کا ایک نہایت خوب صورت اور متوازن امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ان کے یہاں رومان محض عشق و محبت تک محدود نہیں رہتا بلکہ سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کے ساتھ مل کر ایک وسیع تر معنویت اختیار کر لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک طرف حسن،محبت اور جمالیاتی احساس کی لطافت نظر آتی ہے تو دوسری طرف سماجی ناانصافی،طبقاتی استحصال اور انسانی محرومیوں کے خلاف شدید احتجاج بھی موجود ہے۔

فیض کی نظم ''رقیب سے'' میں سماجی حقیقت نگاری اور انسانی ہمدردی کا یہ رنگ نمایاں ہے۔ وہ غریبوں اور ناتوانوں کے استحصال کو دیکھ کر اپنے اندر پیدا ہونے والی بے چینی کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

اسی طرح نظم ''زنداں کی ایک شام'' میں فیض نے جیل کی فضا، شام کے اترنے اور رات کے پھیلنے کا نہایت حسین اور رومان انگیز نقشہ پیش کیا ہے۔ یہاں قید و بند کی سخت فضا کے باوجود شاعر کی جمالیاتی حس پوری طرح بیدار نظر آتی ہے:

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں محو ہیں بنانے میں
دامن آسماں پہ نقش و نگار

فیض کی شاعری میں یہی رومانیت حقیقت پسندی کے ساتھ مل کر ایک منفرد شعری آہنگ پیدا کرتی ہے۔ ''رقیب سے''، ''تہہِ نجوم''، ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ''، ''سرودِ شام''، ''ہائی''، ''چند روز و مری جان'' وغیرہ ان نظموں میں شامل ہیں جن میں رومانوی احساس اور سماجی شعور ایک دوسرے سے مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح فیض کے یہاں رومانیت زندگی کی حقیقتوں سے فرار کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی احساس اور اجتماعی شعور کو گہرا کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

3.2.3 : علی سردار جعفری

علی سردار جعفری کا شمار اردو کے اہم ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور صحافی کی حیثیت سے ادبی دنیا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سیاست ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتی ہے اور اس پر عالمی بغاوت، اشتراکیت، آزادی اور انقلاب کے تصورات غالب نظر آتے ہیں۔ وہ صرف ہندوستان کے سیاسی حالات کو موضوع نہیں بناتے بلکہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کی کوشش کر رہی تھی اور علی سردار جعفری ادب کو سماجی تبدیلی اور انقلاب کا مؤثر وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں فکری بیداری پیدا ہو اور انسان ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں خطیبانہ انداز، بلند آہنگی، جوش اور ولولہ نمایاں ہے۔ انقلاب اور بغاوت ان کی شاعری کے بنیادی امتیازات میں شمار ہوتے ہیں۔

ان کی نظم ''بغاوت'' میں بغاوت کو ایک ہمہ گیر فکری رویے کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت رسم چنگیزی سے، تہذیب تتاری سے
بغاوت جبر و استبداد سے، سرمایہ داری سے
بغاوت سرسوتی سے، لکشمی سے، بھیم و ارجن سے
بغاوت دیویوں سے اور دیوتاؤں کے تمدن سے
بغاوت وہم کی پابندیوں سے، قید ملت سے
بغاوت آدمی کو پیسنے والی مشیت سے

علی سردار جعفری کی ''نئی دنیا کو سلام''، ''سماج''، ''دعا'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر فرسودہ سماجی نظام کو تبدیل کرنے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں عوامی مسائل کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ وطن سے محبت کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ وہ جنگ اور نفرت کے بجائے امن، اتحاد اور انسانی بھائی چارے کے حامی ہیں۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال اور ہندوستان و پاکستان کے درمیان پیدا ہونے والی دوریوں کو انہوں نے نظم ''کون ہے دشمن'' میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے:

ہمارے پاس کیا ہے درد مشترک کے سوا
مزا تو تب تھا کہ مل کے علاج جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے
شریک ہوتے تو پھر جشن آشیاں کرتے
تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بر دوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم

علی سردار جعفری کی طویل نظموں میں بھی یہی موضوعات تفصیل اور اثر انگیزی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ''امن کا ستارہ''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''موت''، ''تین شرابی'' وغیرہ ان کی معروف نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان نظموں میں انقلاب، امن، آزادی، انسان دوستی اور سماجی انصاف کے تصورات نمایاں ہیں۔

3.2.4 : مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین اردو نظم کے باکمال اور مؤثر ترقی پسند شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد پوری شدت اور اثر انگیزی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وہ بھی انقلاب کو اپنی شاعری کا بنیادی محور بناتے ہیں، تاہم ان کے ہاں انقلاب کی گھن گرج کے ساتھ ساتھ نغمگی، موسیقیت اور جذباتی گداز بھی موجود ہے۔ مخدوم نے فرسودہ سماجی رسم و رواج، سرمایہ دارانہ نظام، سیاسی جبر، سماجی نابرابری اور عام انسان کے مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان موضوعات کو محض نعرے کی صورت میں پیش نہیں کرتے بلکہ ان میں رومانوی احساس، موسیقیت اور شعری جمالیات بھی شامل کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری میں زندگی اور فن ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک فکری رشتہ قائم ہوتا ہے۔

ان کی نظم ''جانِ غزل'' کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

مست آنکھوں کی جھیلوں سے کھلنے لگے آنسوؤں کے کنول
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
دل کھول کے مسکرا چشم نم
آج چھٹکی ہے رخسار کی چاندنی
چھٹی گئیں بدلیاں کھل گئے پیچ و خم
کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر

میری جان غزل

اسی طرح مخدوم کی معروف نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں آزادی کی جدوجہد، شہیدوں کی قربانی اور مستقبل کی امید کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

مخدوم کی شاعری صرف ہندوستان کے داخلی مسائل تک محدود نہیں بلکہ اس میں بین الاقوامی سطح کے مسائل بھی جگہ پاتے ہیں۔ سماجی

نابرابری، غلامی سے آزادی، وطن سے محبت، جنگ، انقلاب اور انسانی آزادی ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ ان کی نظموں پر ترقی پسند تحریک کے نظریات کا گہرا اثر ہے اور یہ اثر ان کے شعور اور فن دونوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ ''جنگِ آزادی''، ''موت کا گیت''، ''قمر''، ''حویلی''، ''سپاہی''، ''باغی''، ''اسٹالن کی آرزو''، ''انقلاب''، ''قید''، ''اندھیرا'' اور ''چاند تاروں کا بن'' ان کی اہم اور مقبول نظموں میں شامل ہیں۔ ان نظموں میں انقلابی فکر کے ساتھ ساتھ شعری حسن، موسیقیت اور جذباتی تاثیر بھی نمایاں ہے۔

3.2.5 : معین احسن جذبی

معین احسن جذبی کا شعری سرمایہ مقدار کے اعتبار سے نسبتاً مختصر ہے، لیکن فکری اور فنی اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان کے کلیاتِ جذبی میں انتیس نظمیں شامل ہیں، جن میں بعض نظمیں مختلف ادبی شخصیات، مثلاً آلِ احمد سرور، مجاز اور اختر وغیرہ کے نام یا خطاب سے وابستہ ہیں۔ جذبی نے اپنی منفرد فکر، مخصوص لہجے اور مؤثر طرزِ اظہار کے باعث ترقی پسند شاعروں میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ ترقی پسند تحریک کا زمانہ ہندوستانی سیاست اور سماج میں شدید تبدیلیوں کا دور تھا۔ ہندوستانی نوجوانوں میں اشتراکی نظریات اور حقیقت پسندانہ فکر فروغ پا رہی تھی۔ جذبی نے بھی اسی فکری ماحول میں حقیقت نگاری کو اپنی شاعری کا اہم جزو بنایا۔ اگرچہ ترقی پسند شعراء کے یہاں موضوعات کا ایک خاص دائرہ بار بار سامنے آتا ہے، تاہم جذبی نے ان موضوعات کو اپنے مخصوص احساس اور رومانوی انداز کے ذریعے ایک نئی شعری کیفیت عطا کی۔

ان کی شاعری میں زندگی کی کشمکش، سماجی مسائل، ذہنی انتشار، اخلاقی اقدار کا زوال، بھوک، افلاس، ظلم اور جبر جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ تاہم جذبی کی اصل خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ان مسائل سے پیدا ہونے والے کرب کو نہایت شدت سے محسوس کیا اور اسے رومانیت کی ہلکی سی آمیزش کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا۔ ان کی نظم ''موت'' میں فکری گہرائی، احساس کی شدت اور داخلی اضطراب نمایاں ہے:

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جذبی کی نظم ''بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج'' میں بھی ان کے فکری اور فنی شعور کی عمدہ مثال ملتی ہے۔ شاعر آزادی کے نئے سورج

کے طلوع ہونے کا منظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے جو صدیوں سے محرومی اور غلامی کا شکار ہیں:

بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج
ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا
نئے بل نئے زور ان کو سکھائے
لباس زری آبشاروں نے پایا
نشیبی زمینوں پہ چھینٹے اڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کا منظر
یہ ہیں آج سب آب زر میں نہائے
مگر برق و آتش کے سائے میں اے دل
یہ صدیوں کے خود رفتہ ناشاد طائر
یہ صدیوں کے پر بستہ برباد طائر
یہ ہیں آج بھی مضمحل دل گرفتہ
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو چھپائے
ارے او نئی شان کے میرے سورج
تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے
انہیں پنجہ تیز سے جو بچائے
انہیں جو نئے بال و پر آ کے بخشے
انہیں جو نئے سر سے اڑنا سکھائے

جذبی نے اپنے مختصر شعری سرمایے کے باوجود ترقی پسند شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا مخصوص لب ولہجہ، گہرا انسانی احساس اور فکر وفن کا حسین امتزاج انہیں دوسرے ترقی پسند شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ خوب صورت تشبیہات، مؤثر استعارات اور داخلی کرب کی شدت کے ذریعے انہوں نے ترقی پسند نظم کی روایت کو آگے بڑھایا۔

3.2.6 : اسرارالحق مجاؔز

ترقی پسند شعراء میں اسرارالحق مجاؔز نے بہت کم عرصے میں اپنی منفرد شناخت قائم کر لی تھی۔ ان کی شاعری میں انقلاب اور حسن کا ایک دل کش امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں انقلاب کی گھن گرج تو ہے، لیکن وہ محض نعرے کی صورت میں سامنے نہیں آتا بلکہ نغمگی، ترنم اور جمالیاتی احساس کے ساتھ مل کر ایک تازہ شعری کیفیت پیدا کرتا ہے۔ مجاز نے اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی نظموں میں مزدوروں اور کسانوں کی محرومی، سیاسی حالات کی تلخیاں، سماجی ناانصافیاں اور انسانی زندگی کی مشکلات نمایاں ہیں۔ تاہم ان موضوعات کو پیش کرتے ہوئے ان کی تغزل پسندی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، جس کے نتیجے میں ان کی نظموں کو ایک منفرد آہنگ اور شگفتگی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی نظم ''اندھیری رات کا مسافر'' میں تاریکی کے باوجود منزل کی طرف مسلسل سفر اور امید کا جذبہ نمایاں ہے:

افق پر زندگی کے لشکر ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
چراغ دیر، فانوس حرم، قندیل رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیاز نور عرفانی
نہ ناقوس برہمن ہے نہ آہنگ ہدیٰ خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

مجاز کی شاعری میں وقت کے ساتھ فکری اور فنی ارتقا بھی دکھائی دیتا ہے۔ ابتدائی دور میں ان کے یہاں شدت اور انقلابی جوش زیادہ

نمایاں ہے،لیکن رفتہ رفتہ ان کے شعری مزاج میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔انقلاب،حسن،محبت،انسانی دکھ اور سماجی شعور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے جاتے ہیں۔یہی توازن ان کی شاعری کو تازگی اور اثر انگیزی عطا کرتا ہے۔

3.2.7: کیفی اعظمی

کیفی اعظمی ترقی پسند اردو شاعری کے ان اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کی شاعری میں مزدور،کسان،غریب،نادار،مفلس اور دہقان کی زندگی کے مسائل اور ان پر ہونے والے مظالم کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ان کی شاعری میں سماجی زندگی کے بنیادی مسائل اور انسانی دکھ نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔اپنے ملک کے عوام کی بدحالی اور محرومی انہیں گہرے رنج والم میں مبتلا کرتی ہے۔انسان کا انسان پر تسلط،ظلم وتشدد، مطلق العنانیت اور انسانی اقدار کی پامالی ان کے دکھ کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔یہی احساس انہیں احتجاج اور مزاحمت کی آواز بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ان کی نظم ''مکان'' میں محنت کش طبقے کی زندگی،ان کی محرومی اور انسانی استحصال کی نہایت مؤثر تصویر پیش کی گئی ہے۔اس نظم میں غریب انسان کے لیے مکان کی تعمیر محض ایک عمارت کی تعمیر نہیں بلکہ اس کی پوری زندگی کی جدوجہد اور مسلسل محنت کی علامت بن جاتی ہے۔نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پر نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار سے کھل جائے گی
یہ شمیں تب بھی نگلنے پر آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو کچھاؤں میں گزارے ہم نے
ہاتھ ڈھلتے گئے سانچوں میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے

کی یہ دیوار بلند اور بلند اور بلند

بام و در اور ذرا اور سنوارے ہم نے

''مکان'' ایک علامتی اور کیفیتی نظم ہے۔اس میں الفاظ کی ظاہری سطح کے ساتھ ساتھ ان کے اندر پوشیدہ معنوی تہیں بھی قاری کے احساس کو متاثر کرتی ہیں اور درد و کرب کی ایک گہری لہر پیدا کرتی ہیں۔شاعر نے مکان کی تعمیر کے پس منظر میں محنت کش انسان کی پوری زندگی کی جدوجہد کو پیش کیا ہے۔ یہاں استحصال کی ایک ایسی زنجیر دکھائی دیتی ہے جو فرد کو پورے سماجی نظام سے مربوط کرتی ہے۔ چونکہ سماج افراد ہی سے تشکیل پاتا ہے، اس لیے فرد کی زندگی، اس کے مسائل اور اس کی خوش حالی یا بدحالی سماج کی مجموعی صورتِ حال پر اثر انداز ہوتی ہے۔کیفی اعظمی اسی بنیادی حقیقت کو اپنی شاعری کے ذریعے نمایاں کرتے ہیں۔کیفی اعظمی کی شاعری میں عورت بھی ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ عورت کے ساتھ صدیوں سے روا رکھے جانے والے غیر منصفانہ سلوک کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اسے اس کی حقیقی عظمت اور صلاحیت کا احساس دلاتے ہیں۔ان کے نزدیک مرد اور عورت ایک دوسرے کے معاون اور شریکِ حیات ہیں، اس لیے دونوں کو برابر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔کوئی بھی جنس فطری طور پر کمتر یا برتر نہیں۔کیفی کے نزدیک عورت کو اپنی حالت بدلنے کے لیے خود آگے بڑھنا ہوگا اور اپنی قوت و صلاحیت کو پہچاننا ہوگا۔ان کی مشہور نظم ''عورت'' میں عورت کو بیداری، جدوجہد اور اپنے مستقبل کی تعمیر کا پیغام دیا گیا ہے:

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرہ پرویں

ترے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں

ہاں اٹھا جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں

میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں

لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے

ان اشعار میں کیفی اعظمی عورت کو محض مظلوم اور محکوم کردار کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ اسے باصلاحیت، بااختیار اور اپنے مستقبل کی تعمیر کرنے والی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ اسے ماضی کی پابندیوں سے نکلنے، اپنے حقوق کو پہچاننے اور زندگی کی جدوجہد میں فعال کردار ادا

کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اس طرح ان کی شاعری میں عورت کا مسئلہ محض نسائی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ انسانی مساوات اور سماجی انصاف کا مسئلہ بن جاتا ہے۔کیفی اعظمی کی شاعری میں موضوعاتی تنوع بھی نمایاں ہے۔وہ صرف مزدور، کسان اور عورت کے مسائل تک محدود نہیں رہتے بلکہ وطن پرستی، ملکی سیاست، عالمی سیاسی حالات، سماجی ناانصافی، جنگ، انقلاب، انسانی آزادی اور دیگر بنیادی انسانی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ان کی شاعری میں اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

ان کی اہم نظموں میں ''اندیشہ''، ''پشیمانی''، ''ٹرنک کال''، ''پامسٹ''، ''حوصلہ''، ''تبسم''، ''یلغار''، ''فتحِ برلن''، ''ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں''، ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ''، ''خانہ جنگی''، ''لال جھنڈا''، ''سپردگی''، ''تلنگانہ''، ''مکان'' اور ''عورت'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان نظموں میں کیفی اعظمی نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو ترقی پسند نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔کیفی اعظمی کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں انقلاب، انسان دوستی، حقیقت پسندی اور شعری جمالیات ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔وہ سماج کی خرابیوں کی صرف نشاندہی نہیں کرتے بلکہ انسان کو ان کے خلاف جدوجہد کرنے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں احتجاج کے ساتھ امید، مزاحمت کے ساتھ عزم اور حقیقت نگاری کے ساتھ جذبے کی حرارت موجود ہے۔یہی خصوصیات انہیں ترقی پسند اردو نظم کے اہم اور مؤثر شاعروں میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔

3.3: سرگرمی! آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال 1: ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز کس سال ہوا؟

(الف) 1932ء۔ (ب) 1936ء

(ج) 1940ء (د) 1947ء

سوال 2: ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کہاں منعقد ہوئی؟

الف) لاہور۔ (ب) دہلی

ج) لکھنؤ۔ (د) بمبئی

سوال 3: ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں سے ایک کیا تھا؟

(الف) قدیم روایات کی مکمل پابندی (ب) سماجی ناانصافی اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانا

(ج) صرف عشقیہ شاعری کو فروغ دینا (د) صرف کلاسیکی ادب کی ترویج

سوال 4: درج ذیل میں سے کون ترقی پسند اردو نظم کا اہم شاعر ہے؟

(الف) فیض احمد فیض۔ (ب) میر تقی میر

(ج) ولی دکنی۔ (د) سودا

سوال 5: ترقی پسند اردو نظم میں زیادہ اہمیت کس چیز کو حاصل ہوئی؟

(الف) محض حسن و عشق (ب) سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل

(ج) صرف صوفیانہ خیالات (د) صرف داستانوی موضوعات

3.4: عمومی جائزہ

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی تاریخ کی ایک اہم ادبی اور فکری تحریک ہے جس نے اردو شاعری اور نثر کو زندگی کے حقیقی مسائل سے قریب کیا۔ بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں دنیا بھر میں سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ سرمایہ دارانہ نظام، طبقاتی تقسیم، غربت، غلامی، سامراجی استحصال اور آزادی کی تحریکوں نے ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کیا۔ ہندوستان میں بھی آزادی کی جدوجہد اور معاشرتی ناہمواریوں کے باعث ایک ایسے ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو عوام کے مسائل اور ان کے جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز 1936ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی پہلی کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس سے ہوا۔ اس تحریک نے ادب کو زندگی سے وابستہ کرنے اور اسے سماجی تبدیلی کا وسیلہ بنانے پر زور دیا۔ ترقی پسند ادیبوں کا خیال تھا کہ ادب محض تفریح یا حسن و عشق کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ اسے انسان اور معاشرے کے مسائل کی عکاسی بھی کرنی چاہیے۔

ترقی پسند تحریک نے اردو نظم پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ نظم کے موضوعات میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی۔ شاعر نے غریب، مزدور، کسان، محکوم اور مظلوم انسان کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ غربت، بھوک، بے روزگاری، طبقاتی کشمکش، آزادی، قومی جدوجہد، سامراج، جنگ، امن اور انسانی مساوات جیسے موضوعات اردو نظم کا حصہ بن گئے۔ اس تحریک کے اہم شعراء میں فیض احمد فیض، مجاز، مخدوم محی الدین، ساحر

لدھیانوی، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء نے اپنی نظموں کے ذریعے مظلوم طبقے کے احساسات، آزادی کی خواہش اور ایک بہتر معاشرے کی آرزو کو شعری زبان عطا کی۔ فیض کی شاعری میں انقلاب، محبت، آزادی اور انسان دوستی کا حسین امتزاج ملتا ہے، جب کہ مجاز اور مخدوم نے بھی نوجوانوں، مزدوروں اور محروم طبقات کے مسائل کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔

ترقی پسند نظم میں زبان بھی نسبتاً سادہ، رواں اور عوام سے قریب ہوئی۔ شاعر نے مشکل اور پیچیدہ اسلوب کے بجائے ایسا انداز اختیار کیا جسے عام قاری آسانی سے سمجھ سکے۔ تاہم ترقی پسند شاعری محض سیاسی نعرہ نہیں تھی بلکہ اس میں جمالیاتی شعور، تخیل، انسانی محبت اور فنی حسن بھی موجود تھا۔ اس طرح ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کو زندگی کے وسیع تر مسائل سے جوڑ دیا اور اسے سماجی شعور، انسانی ہمدردی، آزادی اور انصاف کی ترجمان بنا دیا۔ جدید اردو نظم کے ارتقاء میں ترقی پسند تحریک کا کردار نہایت اہم ہے کیونکہ اس نے نظم کے موضوعات، زبان، اسلوب اور مقصد میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔

3.5: فرہنگ

ترقی پسند	:	ترقی اور بہتری کی حمایت کرنے والا
تحریک	:	منظّم جدوجہد، مہم
استحصال	:	ناجائز فائدہ اٹھانا
سامراج	:	دوسرے ملک پر سیاسی و معاشی غلبہ
سرمایہ دارانہ	:	سرمایہ پر مبنی نظام سے متعلق
طبقاتی	:	مختلف معاشی یا سماجی طبقات سے متعلق
ناہمواری	:	عدم مساوات، غیر برابری
محکوم	:	جس پر حکومت کی جائے
مظلوم	:	جس پر ظلم کیا جائے
محروم	:	کسی حق یا سہولت سے بے نصیب

مساوات	:	برابری
انقلاب	:	بنیادی اور بڑی تبدیلی
اشتراکیت	:	اجتماعی ملکیت اور مساوات کا نظریہ
استبداد	:	جابرانہ حکومت
سامراجیت	:	دوسرے ممالک پر تسلط قائم کرنے کی پالیسی
شعور	:	آگہی، سمجھ بوجھ
مقصدیت	:	کسی مقصد سے وابستگی
حقیقت نگاری	:	زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی
عوام	:	عام لوگ
جمالیات	:	حسن اور خوب صورتی کا علم

3.6: خود جانچ امتحانی سوالات

سوال1: ترقی پسند تحریک کے قیام کے اسباب و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

سوال2: ترقی پسند تحریک نے جدید اردو نظم کے موضوعات اور اسلوب کو کس طرح متاثر کیا؟

سوال3: ترقی پسند اردو نظم کے اہم شعرا اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال4: فیض احمد فیض اور دیگر ترقی پسند شعرا کی نظموں میں سماجی اور انسانی مسائل کی عکاسی پر بحث کیجیے۔

3.7: مشقی سوالات

سوال1: ترقی پسند تحریک سے کیا مراد ہے؟

سوال2: ترقی پسند اردو نظم کے اہم موضوعات بیان کیجیے۔

سوال3: ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کی زبان اور اسلوب میں کیا تبدیلی پیدا کی؟

سوال4: ترقی پسند اردو نظم میں عوامی مسائل کی ترجمانی کس طرح کی گئی ہے؟

3.8: جوابات سرگرمی

1.(ب)1936ء

2۔(ج)لکھنؤ

3۔(ب) سماجی ناانصافی اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانا

4۔(الف) فیض احمد فیض

5۔(ب) سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل

3.8.1: مشقی سوالات کے جوابات

سوال1: ترقی پسند تحریک سے کیا مراد ہے؟

جواب: ترقی پسند تحریک ایک اہم ادبی اور فکری تحریک تھی جس کا مقصد ادب کو زندگی کے حقیقی مسائل سے وابستہ کرنا تھا۔ اس تحریک نے سماجی ناانصافی، غربت، استحصال، طبقاتی تفریق، سامراجی تسلط اور انسانی محرومیوں کے خلاف آواز اٹھانے پر زور دیا۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا خیال تھا کہ ادب کو معاشرے کی اصلاح اور انسان کی فلاح میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز 1936ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی پہلی کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس سے ہوا۔

سوال2: ترقی پسند اردو نظم کے اہم موضوعات بیان کیجیے۔

جواب: ترقی پسند اردو نظم کے موضوعات کا تعلق براہِ راست انسانی زندگی اور معاشرے سے ہے۔ اس میں غربت، بھوک، بے روزگاری، مزدور اور کسان کے مسائل، طبقاتی کشمکش، آزادی، سامراجی استحصال، جنگ و امن، انسانی مساوات اور سماجی انصاف جیسے موضوعات کو اہمیت حاصل ہوئی۔ ترقی پسند شعرا نے مظلوم اور محروم طبقے کے مسائل کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا۔ اس کے علاوہ محبت، انسان دوستی اور ایک بہتر اور منصفانہ معاشرے کے قیام کی خواہش بھی ترقی پسند نظم کے اہم موضوعات ہیں۔

سوال3: ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کی زبان اور اسلوب میں کیا تبدیلی پیدا کی؟

جواب: ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کی زبان اور اسلوب کو عام انسان کی زندگی سے قریب کر دیا۔ شاعروں نے مشکل اور پیچیدہ زبان کے بجائے سادہ، رواں اور عام فہم زبان اختیار کی تاکہ ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ نظم میں براہِ راست اظہار، حقیقت نگاری، علامت، احتجاج اور جذباتی شدت کے عناصر پیدا ہوئے۔ شاعر نے روزمرہ زندگی کے مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا اور نظم کو محض ذاتی جذبات کے اظہار کے بجائے اجتماعی احساسات کی ترجمان بنا دیا۔

سوال 4: ترقی پسند اردو نظم میں عوامی مسائل کی ترجمانی کس طرح کی گئی ہے؟

جواب: ترقی پسند اردو نظم نے عام انسان کی زندگی اور اس کے مسائل کو خصوصی اہمیت دی۔ مزدور، کسان، غریب، بے روزگار اور مظلوم طبقے کی مشکلات کو نظم کا موضوع بنایا گیا۔ شاعروں نے غربت، بھوک، استحصال، طبقاتی ناانصافی اور سیاسی جبر کے خلاف احتجاج کیا۔ ساتھ ہی آزادی، مساوات، امن، محبت اور انسانی وقار کی حمایت کی گئی۔ فیض احمد فیض، مجاز، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی اور دیگر شعراء نے اپنی نظموں کے ذریعے عوام کے جذبات اور مسائل کی مؤثر ترجمانی کی۔ یوں ترقی پسند نظم نے اردو شاعری کو عوامی زندگی سے جوڑ کر اسے سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کی مؤثر آواز بنا دیا۔

3.9: امدادی کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

سبق نمبر 4 نظم۔ ''آدمی نامہ'' نظیر اکبرآبادی

ساخت

4.0 اغراض ومقاصد

4.1 تعارف

4.2 نظم ''آدمی نامہ'' کا متن

4.2.1 نظم ''آدمی نامہ'' کی تشریح

4.2.2 نظم ''آدمی نامہ'' کی فنی خصوصیات

4.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

4.4 عمومی جائزہ

4.5 فرہنگ

4.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

4.7 مشقی سوالات

4.8 جوابات سرگرمی

4.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

4.9 امدای کتب

4.0 اغراض ومقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ نظیر اکبر آبادی کی عوامی اور حقیقت پسندانہ شاعری سے واقف ہوسکیں گے اور نظم ''آدمی نامہ'' کے بنیادی موضوع اور مرکزی خیال کو سمجھ سکیں گے۔ عزیز متعلم آپ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں، انسان کے مختلف سماجی طبقات اور اس کے متضاد رویوں کا ادراک حاصل کرسکیں گے۔ آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ انسان اپنی ظاہری حیثیت، دولت، غربت، عہدے یا مرتبے سے نہیں بلکہ اپنے اعمال اور کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ اس سبق کا مقصد آپ میں انسانی مساوات، ہمدردی، رواداری، عاجزی اور خود احتسابی کے جذبات پیدا کرنا بھی ہے۔ آپ یہ محسوس کرسکیں گے کہ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، نیک ہو یا بدسب بنیادی طور پر انسان ہیں۔ نظم میں انسان کے اچھے اور برے دونوں کرداروں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، اس کے ذریعے آپ انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں گے۔ آپ نظیر کے سادہ، عام فہم، برجستہ اور عوامی اسلوب کی خصوصیات سے واقف ہوں گے اور یہ جان سکیں گے کہ شاعر نے نہایت سادہ زبان میں گہری فلسفیانہ اور اخلاقی باتیں کس طرح بیان کی ہیں۔ اس سبق کے ذریعے آپ میں معاشرتی ناہمواری، طبقاتی تفاوت، انسانی خودغرضی، غرور، ظلم اور اخلاقی زوال کے خلاف شعور پیدا ہوگا۔ آپ نظم کے طنزیہ اور اصلاحی پہلو کو سمجھتے ہوئے اپنے کردار اور رویوں کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوں گے۔

4.1: تعارف

''آدمی نامہ'' اردو کے منفرد اور عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کی ایک مشہور اور اہم نظم ہے۔ نظیر نے اپنی شاعری میں زندگی کے عام اور روزمرہ موضوعات کو خصوصی اہمیت دی۔ انہوں نے بادشاہوں، درباری زندگی اور محض روایتی عشقیہ مضامین کے بجائے عام انسان، اس کے مسائل، خوشیوں، غموں، عادات، اطوار اور معاشرتی زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اسی وجہ سے انہیں اردو کا عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی معاشرت، تہذیب، میلوں، تہواروں اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

''آدمی نامہ'' میں نظیر نے انسان کو مختلف روپ اور حیثیتوں میں پیش کیا ہے۔ شاعر کی نظر میں دنیا کا بادشاہ بھی آدمی ہے اور مفلس و گدا بھی آدمی؛ دولت مند بھی آدمی ہے اور بے نوا بھی آدمی۔ اسی طرح نیکی کرنے والا بھی انسان ہے اور برائی کا ارتکاب کرنے والا بھی۔ نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان اپنی سماجی حیثیت سے قطع نظر بنیادی طور پر انسان ہی ہے، تاہم اس کے اعمال، کردار اور رویے اسے اچھا یا برا بناتے ہیں۔ نظم کا آغاز ہی انسانی مساوات اور معاشرتی تفاوت کے اس تضاد کو نمایاں کرتا ہے: ''دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی/ اور مفلس و گدا ہے سو ہے

وہ بھی آدمی''۔نظیر نے اس نظم میں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو نہایت سادہ مگر معنی خیز انداز میں بیان کیا ہے۔کہیں انسان نیکی اور عبادت کے ذریعے بلندی حاصل کرتا ہے اور کہیں غرور، ظلم اور برے اعمال کے باعث پستی کا شکار ہوتا ہے۔شاعر نے فرعون، شداد اور نمرود جیسے کرداروں کے ذریعے انسان کے غرور اور خدائی کے دعوے تک پہنچ جانے کی کیفیت کو بھی طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

''آدمی نامہ'' کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی، روانی، عوامی زبان اور گہری فکری معنویت ہے۔نظیر نے کسی مشکل فلسفیانہ زبان کا سہارا لیے بغیر انسانی زندگی کے ایک نہایت اہم فلسفے کو عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔نظم میں انسان کی عظمت بھی ہے، اس کی کمزوری بھی؛ اس کی نیکی بھی ہے اور بدی بھی؛ اس کا غرور بھی ہے اور اس کی بے بسی بھی۔یوں ''آدمی نامہ'' دراصل انسانی زندگی اور انسانی فطرت کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر انسان اپنے کسی نہ کسی روپ کو دیکھ سکتا ہے۔اسی جامع انسانی تصور اور عوامی اندازِ بیان کی وجہ سے ''آدمی نامہ'' نظیر اکبر آبادی کی نمائندہ نظموں میں شمار ہوتی ہے اور اردو نظم کی روایت میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔

4.2: نظم ''آدمی نامہ'' کا متن

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال، قطب و غوث، ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لیے
حتٰی کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ
قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ
دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلا کے راہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس میں جو پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خونچا

کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا
کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ آدمی

طبلے مجیرے دائرے سارنگیاں بجا
گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بجا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا
اور آدمی ہی ناچے ہیں اور دیکھ پھر مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر میں بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بد تر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند سا
بد شکل بد نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں
کم خواب تاش شال دو شالوں میں غرق ہے
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں یارو دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے
اور آدمی ہی چور ہے اور آپی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور بانگ تانگ ہے
دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے گڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زارزار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

4.2.1: نظم ''آدمی نامہ'' کی تشریح

نظیر اکبر آبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' اردو نظم کی ایک نہایت اہم اور منفرد تخلیق ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے۔ انسان کبھی بادشاہ ہے، کبھی فقیر؛ کبھی نیک اور متقی ہے اور کبھی ظالم اور گناہ گار۔ شاعر نے انسانی معاشرے کے مختلف طبقات،

پیشوں، عادات اور کرداروں کو نہایت سادہ، دلچسپ اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کا بنیادی مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ دنیا میں پائی جانے والی تمام تر عظمتیں، پستیاں، خوبیاں اور خامیاں انسان ہی سے وابستہ ہیں۔

بنداول

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ان اشعار میں شاعر انسانی مساوات کی حقیقت بیان کرتا ہے۔ دنیا میں بادشاہ ہو یا فقیر، دولت مند ہو یا بے نوا، سب بنیادی طور پر انسان ہیں۔ کسی شخص کے پاس اقتدار اور دولت کی فراوانی ہے اور کوئی شخص غربت و افلاس میں زندگی گزار رہا ہے، لیکن ان کے درمیان موجود یہ فرق صرف ظاہری اور معاشرتی ہے۔ انسان ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ شاعر نے اس حقیقت کو نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں پیش کیا ہے کہ دولت اور مرتبہ انسان کی اصل حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔

بند دوم

ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ابدال، قطب و غوث، ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لیے

یہاں شاعر انسانی زندگی کے مختلف روحانی اور مذہبی پہلوؤں کو بیان کرتا ہے۔ جو شخص غربت کی وجہ سے روٹی کے ٹکڑوں پر گزارا کرتا ہے، وہ بھی انسان ہے۔ دوسری طرف ابدال، قطب، غوث اور ولی جیسے بلند روحانی مرتبے رکھنے والے افراد بھی انسان ہی ہیں۔ اسی طرح مذہب کا انکار کرنے والے اور کفر کی راہ اختیار کرنے والے بھی انسان ہیں۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی دونوں کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ایک انسان روحانی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے اور دوسرا گمراہی کی انتہا تک جا سکتا ہے۔

بندسوم

حتّٰی کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا

ان اشعار میں انسان کی دو بالکل متضاد کیفیتیں بیان ہوئی ہیں۔ایک طرف انسان عبادت، زہداور ریاضت کے ذریعے روحانی بلندی حاصل کرتا ہےاور اپنے خالق کے قرب کا خواہش مند ہوتا ہے۔ دوسری طرف بعض انسان غروراور تکبر میں مبتلا ہوکر خدائی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔فرعون نے اپنی طاقت کے نشے میں خدائی کا دعویٰ کیااور شداد نے جنت جیسا باغ بنا کر اپنی عظمت کا اظہار کیا۔شاعراس تضاد کے ذریعے انسان کی عظمت اوراس کے غرور، دونوں کونمایاں کرتا ہے۔

بند چہارم

نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور

شاعر کہتا ہے کہ نمرود نے بھی کھلے عام خدائی کا دعویٰ کیا تھا،لیکن حقیقت میں وہ بھی ایک انسان ہی تھا۔شاعراشارے کے انداز میں کہتا ہے کہ انسان کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے۔ دنیا میں حسن اور قبح ،یعنی نیکی اور بدی، دونوں کا اظہار انسان کے ذریعے ہوتا ہے۔ انسان کے کردار میں ایسی عظمت بھی ہے جو اسے بلند مقام عطا کرتی ہےاور ایسی برائی بھی ہے جو اسے پستی میں گرا دیتی ہے۔

بند پنجم

شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں

ان اشعار میں شاعر انسان کے نیک اور بد کردار دونوں روپ پیش کرتا ہے۔ جو شخص مکر وفریب، ظلم اور طاقت کے بل پر دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے، وہ شیطان صفت انسان ہے۔ اس کے برعکس جو دوسروں کو سیدھا راستہ دکھاتا اور ان کی رہنمائی کرتا ہے، وہ بھی انسان ہے۔ مسجد بنانے والا، امام بننے والا اور خطبہ دینے والا بھی انسان ہی ہے۔ اس طرح انسان کے کردار میں خیر وشر کی دونوں قوتیں موجود ہیں۔

بند ششم

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی

شاعر نہایت دلچسپ اور حقیقت پسندانہ انداز میں انسانی معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے۔ قرآن پڑھنے والے اور نماز ادا کرنے والے انسان ہیں، لیکن انہی کے جوتے چرانے والا بھی انسان ہے۔ چور کو پکڑنے یا دیکھنے والا بھی انسان ہے۔ اس کے بعد شاعر انسانی محبت اور ایثار کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان ہی انسان کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ گویا ایک ہی انسانی معاشرے میں نیکی اور بدی، محبت اور جرم ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

بند ہفتم

اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ان اشعار میں انسانی تعلقات کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے محبت بھی کرتا ہے اور دشمنی بھی۔ ایک انسان

دوسرے انسان کو قتل کرتا ہے اور اس کی عزت و آبرو کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔لیکن دوسری طرف انسان ہی کسی دوسرے انسان کو مدد کے لیے پکارتا ہے اور انسان ہی اس کی آواز سن کر اس کی مدد کے لیے دوڑتا ہے۔شاعر نے انسانی فطرت کے اندر موجود محبت اور نفرت، ہمدردی اور ظلم کے تضاد کو نمایاں کیا ہے۔

بند ہشتم

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

ان اشعار میں زندگی کے مختلف کرداروں اور انسانی معاشرے کے تضادات کو بیان کیا گیا ہے۔سفر کرنے والا بھی انسان ہے اور کسی کو سزا دینے والا بھی انسان ہے۔دنیا میں بعض انسان شکار کی طرح مظلوم ہوتے ہیں اور بعض انسان جال کی مانند دوسروں کو اپنے مفاد کے لیے پھنساتے ہیں۔اسی معاشرے میں سچ بولنے والے بھی انسان ہیں۔شاعر انسانی زندگی کے مختلف کرداروں کو ایک ہی حقیقت، یعنی انسانیت، سے وابستہ قرار دیتا ہے۔

بند نہم

اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ
قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ

شاعر کہتا ہے کہ سچا انسان بھی ہے اور جھوٹ سے بھرا ہوا شخص بھی انسان ہے۔اس کے بعد شادی بیاہ کی تقریب کا منظر پیش کیا گیا ہے۔شادی کرنے والے، نکاح پڑھانے والے قاضی، وکیل اور گواہ سب انسان ہیں۔شادی کے موقع پر ساز بجانے والے اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینے والے بھی انسان ہیں۔شاعر نے عام زندگی کے ایک اہم سماجی منظر کو نہایت سادگی اور حقیقت پسندی سے بیان کیا ہے۔

بند دہم

دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلا کے راہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار

ان اشعار میں شادی کے جلوس اور شاہانہ سفر کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ مشعلیں لے کر چلنے والے انسان ہیں اور گھوڑے یا سواری پر بیٹھنے والا دلہا بھی انسان ہے۔ اعلان کرنے والا نقیب بھی انسان ہے، پیدل چلنے والے بھی انسان ہیں اور سواری پر بیٹھنے والے بھی انسان ہیں۔ شاعر اس منظر کے ذریعے طبقاتی فرق کے باوجود سب کی بنیادی شناخت انسان ہونا قرار دیتا ہے۔

بند یازدہم

حقہ صراحی جوتیاں دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس میں جو پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا

ان اشعار میں خدمت کرنے والے اور خدمت لینے والے دونوں کا ذکر ہے۔ پالکی اٹھانے والے کہار انسان ہیں اور پالکی میں آرام سے بیٹھا ہوا شخص بھی انسان ہے۔ ایک شخص محنت اور مشقت کر رہا ہے جبکہ دوسرا آرام کر رہا ہے، لیکن دونوں کی بنیادی حقیقت ایک ہے۔ اس کے بعد شاعر بازار کی زندگی کی طرف آتا ہے اور بتاتا ہے کہ دکانیں لگانے والے بھی انسان ہیں۔

بند دوازدہم

اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خونچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا

کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہاں شاعر نے بازار کا ایک جاندار نقشہ پیش کیا ہے۔کوئی دکان پر سامان بیچ رہا ہے اور کوئی سر پر خوانچہ رکھ کر گلیوں میں پھر رہا ہے۔ دکاندار اپنی چیزوں کو فروخت کرنے کے لیے آوازیں لگاتے ہیں اور خریدار چیزیں خریدتے ہیں۔سامان بنانے والا بھی انسان ہے،اسے بیچنے والا بھی انسان اور خریدنے والا بھی انسان ہے۔اس طرح انسانی زندگی کی معاشی سرگرمیوں کا پورا نظام انسان ہی کے گرد گھومتا ہے۔

بند سیزدہم

طبلے مجیرے دائرے سارنگیاں بجا
گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بجا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا
اور آدمی ہی ناچے ہیں اور دیکھ پھر مزا

ان اشعار میں موسیقی اور تفریح کی دنیا کا ذکر ہے۔طبلہ،مجیرا،دائرہ اور سارنگی بجانے والے انسان ہیں اور گانے والے بھی انسان ہیں۔ ناچنے اور نچانے والے بھی انسان ہیں۔شاعر انسانی معاشرے کی ان تمام سرگرمیوں کو بغیر کسی بناوٹ کے پیش کرتا ہے۔نظیر کے نزدیک عام زندگی کے یہ تمام مناظر شاعری کا حصہ ہیں۔

بند چہاردہم

جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی ہی لعل و جواہر میں بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بد تر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا

شاعر کہتا ہے کہ تفریح اور ناچ دیکھنے والا بھی انسان ہے۔اس کے بعد وہ معاشی اور سماجی فرق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔کوئی انسان لعل و جواہر کی طرح قیمتی اور عزت والا سمجھا جاتا ہے،جبکہ کوئی شخص انتہائی غربت اور ذلت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔کسی کا رنگ کالا ہے،مگر اس ظاہری

فرق کے باوجود وہ بھی انسان ہے۔

بند پانزدہم

گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند سا
بد شکل بد نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں

ان اشعار میں شاعر انسانوں کے ظاہری فرق بیان کرتا ہے۔کوئی گورا اور انتہائی خوب صورت ہے، کوئی بدصورت ہے، لیکن دونوں انسان ہیں۔اسی طرح بعض انسان انتہائی شان وشوکت اور زرق برق لباس وزیورات میں رہتے ہیں۔ان کی زندگی دولت اور آسائشوں سے بھرپور ہے، مگر ان کی اصل شناخت بھی انسان ہی ہے۔

بند شانزدہم

جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں
کم خواب تاش شال دو شالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
حیراں ہوں یارو دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے

یہاں شاعر امیر اور غریب کے درمیان شدید فرق کو بیان کرتا ہے۔کچھ انسان قیمتی زیورات، نفیس کپڑوں اور عمدہ شالوں میں ملبوس ہیں جبکہ کچھ انسان پھٹے ہوئے کپڑوں اور چیتھڑوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔شاعر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ ایک ہی دنیا میں انسانوں کے درمیان اتنا بڑا فرق موجود ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر اور غریب دونوں انسان ہیں۔

بند ہفدہم

اور آدمی ہی چور ہے اور آپی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور بانگ تانگ ہے

دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے گڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ان اشعار میں شاعر انسانی معاشرے میں پائی جانے والی چوری، فریب، چھینا جھپٹی اور لڑائی جھگڑے کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ یہ تمام برائیاں انسان ہی پیدا کرتا ہے۔ شاعر انسان کی عجیب فطرت پر حیرت کرتا ہے کہ وہ کبھی نرم اور کمزور دکھائی دیتا ہے اور کبھی فولاد کی طرح سخت اور طاقت ور ہو جاتا ہے۔ انسان کی شخصیت میں مختلف اور متضاد صفات موجود ہیں۔

بند ہجدہم

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زارزار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار

ان اشعار میں انسانی زندگی کے آخری مرحلے، یعنی موت، کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ جب کوئی انسان مر جاتا ہے تو دوسرے انسان اس کے لیے کفن تیار کرتے ہیں، اسے غسل دیتے ہیں اور اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ جنازے کے ساتھ چلنے والے انسان کلمہ پڑھتے ہیں اور اپنے عزیز کی جدائی میں روتے ہیں۔ مردے کی تدفین کے تمام معاملات انسان ہی انجام دیتے ہیں۔

بند نوزدہم

اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر

شاعر کہتا ہے کہ جو شخص مر گیا، وہ بھی انسان تھا۔ اس کے بعد وہ معاشرے کے تمام طبقات کا ذکر کرتا ہے۔ اعلیٰ طبقے سے لے کر عام اور کم حیثیت لوگوں تک، بادشاہ سے وزیر تک، سب انسان ہیں۔ اسی طرح مرید بھی انسان ہے اور پیر بھی انسان ہے۔ کوئی مرتبہ یا مقام انسان کی

بنیادی حقیقت کو تبدیل نہیں کرتا۔

بندِ بیستم

اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ان آخری اشعار میں شاعر پوری نظم کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ دنیا میں اچھا کہلانے والا بھی انسان ہے اور برا کہلانے والا بھی انسان ہے۔ انسان کی نیکی اور بدی، عظمت اور پستی، دولت اور غربت، سب اس کی مختلف حالتیں ہیں، لیکن ان تمام فرقوں کے باوجود وہ انسان ہی رہتا ہے۔ شاعر نے اس آخری بند میں پوری نظم کے بنیادی فلسفے کو نہایت مؤثر انداز میں سمیٹ دیا ہے۔

4.2.2 نظم ''آدمی نامہ'' کی فنی خصوصیات

نظم ''آدمی نامہ'' کا مرکزی خیال انسان اور اس کی متضاد فطرت ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اس نظم میں بتایا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مختلف کردار، طبقے اور حالتیں موجود ہیں، ان سب کے پیچھے انسان ہے۔ بادشاہ اور فقیر، امیر اور غریب، پیر اور مرید، امام اور نمازی، چور اور نیکوکار، قاتل اور مددگار، سب انسان ہیں۔ شاعر انسان کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو بھی بیان کرتا ہے۔ انسان عبادت اور ریاضت کے ذریعے روحانی بلندی حاصل کرسکتا ہے، لیکن غرور میں مبتلا ہو کر خدائی کا دعویٰ بھی کرسکتا ہے۔ وہ دوسرے انسان کے لیے جان قربان بھی کرسکتا ہے اور اسی انسان کو قتل بھی کرسکتا ہے۔ اس طرح انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ نظم کا ایک اہم پیغام انسانی مساوات بھی ہے۔ شاعر نے دولت، مرتبے، رنگ، شکل اور سماجی حیثیت کی بنیاد پر قائم تمام فرقوں کے باوجود یہ واضح کیا ہے کہ ہر شخص کی بنیادی شناخت انسان ہونا ہے۔ بادشاہ اور فقیر میں ظاہری فرق ضرور ہے، مگر دونوں انسان ہیں۔ اسی طرح خوب صورت اور بدصورت، گورے اور کالے، امیر اور غریب، سب انسان ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' اپنی موضوعاتی وسعت، سادگی اور حقیقت نگاری کے باعث اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔ شاعر نے زندگی کے خیالی یا غیر حقیقی پہلوؤں کے بجائے عام انسانی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ مسجد، بازار، شادی، سفر، موسیقی، امیری، غربت اور موت جیسے روزمرہ کے مناظر نظم میں نہایت جاندار انداز میں پیش کیے گئے

ہیں۔نظم کی دوسری اہم خصوصیت عام انسان کوموضوع بنانا ہے۔کلاسیکی شاعری میں عام طور پر بادشاہوں،محبوبوں اور خاص طبقوں کواہمیت دی جاتی تھی،لیکن نظیر نے عام انسان، دکاندار،خوانچہ فروش،کہار،مسافر،فقیراوردوسرے عام کرداروں کوبھی شاعری کا حصہ بنایا۔اس نظم میں تکرار کا استعمال نہایت مؤثر ہے۔تقریباً ہر شعر میں ''آدمی'' اور ''سو ہے وہ بھی آدمی'' کی تکرار نظم کے مرکزی خیال کومضبوط بناتی ہے۔یہی تکرار نظم میں ایک خاص موسیقیت اور تسلسل بھی پیدا کرتی ہے۔نظم کی ایک اور نمایاں خصوصیت تضاد نگاری ہے۔شاعر نے بادشاہ اور فقیر،امیر اور غریب،نیک اور بد، سچے اور جھوٹے،قاتل اور مددگار، پیر اور مرید جیسے متضاد کرداروں کوایک ساتھ پیش کیا ہے۔ان تضادات کے ذریعے انسانی فطرت کی وسعت اور پیچیدگی واضح ہوتی ہے۔

نظیر کی زبان نہایت سادہ، عام فہم اور عوامی ہے۔انہوں نے مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے گریز کیا ہے اور روزمرہ زندگی کی زبان استعمال کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ نظم میں بیان کیے گئے مناظر قاری کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتے ہیں۔اس نظم میں طنز ومزاح کا عنصر بھی موجود ہے۔خاص طور پر مسجد میں نمازیوں کے جوتے چوری ہونے،شادی بیاہ، بازار اور مختلف سماجی سرگرمیوں کے بیان میں شاعر نے ہلکے طنز اور مزاح کے ذریعے انسانی معاشرے کی حقیقتوں کونمایاں کیا ہے۔تصویر نگاری بھی نظم کی ایک اہم خوبی ہے۔شاعر نے بازار،شادی کے جلوس، پالکی، موسیقی اور جنازے کے مناظر کواس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں ایک مکمل منظر قائم ہو جاتا ہے۔

مختصراً ''آدمی نامہ'' انسان اور انسانی معاشرے کی ایک جامع اور حقیقت پسندانہ تصویر ہے۔نظیر اکبرآبادی نے اس نظم میں انسان کی عظمت وپستی، نیکی و بدی اور دولت وغربت کے تمام پہلوؤں کوسمیٹتے ہوئے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ دنیا میں کردار کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ان سب کے پیچھے ایک ہی بنیادی حقیقت موجود ہے،اور وہ حقیقت انسان ہے۔

4.3: سرگرمی! آواپنی معلومات جانچیں۔

سوال1: نظم ''آدمی نامہ'' کس ہیئت میں کہی گئی ہے؟

(الف) ترویني (ب) مربع

(ج) مخمس (د) مثمن

سوال2: نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

(الف) عوامی زندگی کی عکاسی (ب) تذکرہ حسن وعشق

(ج) صرف صوفیانہ مضامین (د) صرف تاریخی واقعات

سوال3: ''آدمی نامہ'' میں بنیادی طور پر کس موضوع کو بیان کیا گیا ہے؟

الف) فطرت (ب) انسان اوراس کی مختلف حالتیں

(ج) جنگ (د) وطن

سوال4: نظیر اکبرآبادی کو کس حیثیت سے خاص شہرت حاصل ہے؟

(الف) درباری شاعر (ب) عوامی شاعر

(ج) مرثیہ نگار (د) قصیدہ نگار

سوال5: ''آدمی نامہ'' میں نظیر نے انسان کے بارے میں کیا تصور پیش کیا ہے؟

(الف) انسان ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے (ب) انسان مختلف حالات اور کرداروں میں نظر آتا ہے

(ج) انسان صرف دولت کا خواہاں ہے (د) انسان صرف عبادت کرتا ہے

4.4: عمومی جائزہ

نظیر اکبرآبادی اردو شاعری کے ان منفرد شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے عام انسان اوراس کی روزمرہ زندگی کو اپنی شاعری کا

موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی معاشرے کی حقیقی تصویر، عوام کے مسائل، خوشیاں، غم، تہوار، رسم و رواج اور انسانی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں اردو کا عوامی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ ''آدمی نامہ'' نظیر اکبرآبادی کی ایک معروف نظم ہے جس میں شاعر نے انسان کی مختلف حالتوں، کرداروں اور معاشرتی حیثیتوں کو نہایت سادہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر کے نزدیک دنیا میں مختلف شکلوں، پیشوں، مرتبوں اور حالات میں رہنے والے تمام افراد بنیادی طور پر انسان ہی ہیں۔ کوئی بادشاہ ہے تو کوئی فقیر، کوئی دولت مند ہے تو کوئی غریب، کوئی عالم ہے تو کوئی جاہل، کوئی حاکم ہے تو کوئی محکوم؛ لیکن سب کے اندر انسانی وجود مشترک ہے۔

نظم میں نظیر نے انسانی زندگی کے تضادات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ انسان کبھی خوش حالی میں زندگی گزارتا ہے اور کبھی غربت کا شکار ہوتا ہے۔ کوئی شخص عزت و اقتدار کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے تو کوئی ذلت اور محرومی کا سامنا کرتا ہے۔ اس طرح شاعر نے انسانی زندگی کی ناپائیداری اور مختلف معاشرتی حالتوں کو سامنے رکھا ہے۔ ''آدمی نامہ'' کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ نظیر نے انسان کو کسی خاص طبقے تک محدود نہیں کیا بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان کے یہاں امیر و غریب، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل اور حاکم و محکوم سب موجود ہیں۔ اس طرح نظم انسانی مساوات کا احساس پیدا کرتی ہے اور یہ پیغام دیتی ہے کہ انسان کی اصل شناخت اس کا انسانی وجود ہے، نہ کہ اس کا عہدہ، دولت یا معاشرتی مرتبہ۔ نظیر کا اندازِ بیان نہایت سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔ انہوں نے مشکل فلسفیانہ زبان کے بجائے روزمرہ الفاظ اور عام زندگی کی مثالوں کے ذریعے ایک گہری حقیقت بیان کی ہے۔ یہی سادگی ''آدمی نامہ'' کو عوام کے قریب کرتی ہے۔ نظم میں طنز، حقیقت نگاری، مشاہدہ اور انسانی ہمدردی کے عناصر نمایاں ہیں۔

مختصر یہ کہ ''آدمی نامہ'' فقط انسان کی مختلف حالتوں کا بیان نہیں بلکہ انسانی معاشرے کا ایک جامع اور معنی خیز مطالعہ ہے۔ نظیر نے اس نظم کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ دنیا میں انسان مختلف ناموں، مرتبوں اور حیثیتوں میں نظر آتا ہے، لیکن بنیادی طور پر وہ سب آدمی ہیں۔ یہی انسانی وحدت اور معاشرتی حقیقت نظم کا مرکزی پیغام ہے۔

4.5: فرہنگ

آدمی : انسان

آدمیت	:	انسانیت
معاشرہ	:	سماج
عوام	:	عام لوگ
مرتبہ	:	مقام، درجہ
حیثیت	:	مقام، حالت
اقتدار	:	حکومت، اختیار
محکوم	:	جس پر حکومت کی جائے
حاکم	:	حکومت کرنے والا
بادشاہ	:	فرمانروا
فقیر	:	درویش، غریب شخص
امیر	:	دولت مند
غریب	:	نادار
تضاد	:	باہمی اختلاف
ناپائیداری	:	دیر تک قائم نہ رہنے کی کیفیت
محرومی	:	کسی چیز سے بے نصیبی
مساوات	:	برابری
حقیقت نگاری	:	حقیقت کی عکاسی
طنز	:	کسی خامی کو تنقیدی انداز میں ظاہر کرنا
مشاہدہ	:	غور سے دیکھنا اور تجربہ کرنا

4.6:امتحانی سوالات

سوال1: نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کا مرکزی خیال بیان کرتے ہوئے اس کی تشریح وتوضیح کیجیے۔

سوال2: ''آدمی نامہ'' میں نظیرؔ اکبرآبادی نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کس طرح پیش کیا ہے؟

سوال3: ''آدمی نامہ'' کی روشنی میں نظیرؔ اکبرآبادی کے عوامی شعور اور انسان دوستی کا جائزہ لیجیے۔

سوال4: نظم ''آدمی نامہ'' کے فنی اور فکری محاسن پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

4.7 مشقی سوالات

سوال1: نظیرؔ اکبرآبادی کو عوامی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

سوال2: ''آدمی نامہ'' کا بنیادی پیغام کیا ہے؟

سوال3: ''آدمی نامہ'' میں انسانی زندگی کے کن مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے؟

سوال4: نظیرؔ اکبرآبادی کے اندازِ بیان کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

4.8:جوابات سرگرمی

(ج)مخمس

(الف)عوامی زندگی کی عکاسی

(ب)انسان اور اس کی مختلف حالتیں

(ب)عوامی شاعر

(ب)انسان مختلف حالات اور کرداروں میں نظر آتا ہے

4.8.1:مشقی سوالات کے جوابات

سوال1: نظیرؔ اکبرآبادی کو عوامی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں عام انسان اور اس کی روزمرہ زندگی کو مرکزی حیثیت دی۔ انہوں نے بادشاہوں اور درباری زندگی کے بجائے عام لوگوں، ان کے مسائل، خوشیوں، غموں، تہواروں، رسم و رواج اور معاشرتی حالات کو موضوع بنایا۔ ان کی زبان سادہ، رواں اور عام فہم ہے، جسے عام قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ان کی نظم ''آدمی نامہ'' بھی عوامی زندگی اور انسانی معاشرے کی مختلف حقیقتوں کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

سوال 2: ''آدمی نامہ'' کا بنیادی پیغام کیا ہے؟

جواب: ''آدمی نامہ'' کا بنیادی پیغام انسانی زندگی کی مختلف صورتوں اور انسانی وحدت کو اجاگر کرنا ہے۔ شاعر بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان مختلف حیثیتوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ کوئی بادشاہ ہے، کوئی فقیر؛ کوئی امیر ہے، کوئی غریب؛ کوئی حاکم ہے اور کوئی محکوم، لیکن سب بنیادی طور پر آدمی ہیں۔ اس طرح نظم انسان کی ظاہری معاشرتی تقسیم کے باوجود اس کی بنیادی انسانی شناخت کو نمایاں کرتی ہے۔ نظم میں انسانی مساوات، حقیقت پسندی اور انسان دوستی کا احساس نمایاں ہے۔

سوال 3: ''آدمی نامہ'' میں انسانی زندگی کے کن مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے؟

جواب: ''آدمی نامہ'' میں انسانی زندگی کے مختلف معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے امیر و غریب، بادشاہ و فقیر، حاکم و محکوم، عالم و جاہل اور مختلف پیشوں سے وابستہ انسانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ذریعے انسانی معاشرے میں موجود طبقاتی فرق اور زندگی کی مختلف حالتیں سامنے آتی ہیں۔ شاعر یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسان کی زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی بلکہ حالات کے ساتھ اس کی حیثیت اور کیفیت بدلتی رہتی ہے۔

سوال 4: نظیر اکبر آبادی کے اندازِ بیان کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

جواب: نظیر اکبر آبادی کا اندازِ بیان سادہ، رواں، بے تکلف اور عوامی ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کے بجائے روزمرہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حقیقت نگاری، طنز، مشاہدہ، سادگی اور بے ساختگی نمایاں ہے۔ وہ عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور واقعات سے بڑے فکری نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ''آدمی نامہ'' میں بھی انہوں نے انسانی زندگی کی پیچیدگیوں اور معاشرتی تضادات کو عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ یہی خصوصیات ان کی شاعری کو عام لوگوں کے قریب کرتی ہیں اور انہیں اردو کا ایک منفرد عوامی شاعر بناتی ہیں۔

4.9:امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 5 نظم ''مناجات بیوہ'' الطاف حسین حالؔی

ساخت

5.0 اغراض ومقاصد

5.1 تعارف

5.2 نظم ''مناجات بیوہ'' کا متن

5.2.1 نظم ''مناجات بیوہ'' کی تشریح

5.2.2 نظم ''مناجات بیوہ'' کی فنی خصوصیات

5.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

5.4 عمومی جائزہ

5.5 فرہنگ

5.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

5.7 مشقی سوالات

5.8 جوابات سرگرمی

5.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

5.9 امدای کتب

5.0 :اغراض ومقاصد

عزیز متعلم !نظم ''مناجاتِ بیوہ'' پڑھانے کا مقصد آپ کو خواجہ الطاف حسین حالی کی اصلاحی اور مقصدی شاعری سے روشناس کرانا ہے۔ اس نظم کے ذریعے آپ بیوہ عورت کی زندگی کے دکھ، تنہائی، محرومی، بے بسی اور معاشرتی مشکلات کو سمجھ سکیں گے اور اس کے جذبات واحساسات سے ہمدردی پیدا کریں گے۔اس سبق کے مطالعے سے آپ حالی کی انسان دوست اور اصلاحی فکر سے واقف ہوں گے اور یہ سمجھ سکیں گے کہ شاعری صرف تفریح یا جذبات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ معاشرتی مسائل کی نشاندہی اور اصلاح کا مؤثر ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔آپ نظم کے مرکزی خیال، جذباتی کیفیت اور اصلاحی پیغام کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ حالی کی سادہ، رواں، مؤثر اور دردوسوز سے بھرپور زبان وبیان کی خصوصیات سے بھی واقف ہوں گے۔

5.1: تعارف

خواجہ الطاف حسین حالی اردو ادب کے ممتاز شاعر، نقاد، سوانح نگار اور عظیم مصلح تھے۔انہوں نے اردو شاعری کو روایتی موضوعات کی محدود فضا سے نکال کر زندگی کے حقیقی مسائل، قومی بیداری، اخلاقی اصلاح اور معاشرتی شعور سے وابستہ کیا۔ان کی شاعری میں انسانی ہمدردی اور معاشرتی اصلاح کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔''مناجاتِ بیوہ'' حالی کی اسی اصلاحی اور انسان دوست شاعری کی ایک اہم مثال ہے۔اس نظم میں حالی نے ایک کم سن اور بے سہارا بیوہ عورت کے جذبات واحساسات کو نہایت دردمندی اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ بیوہ اپنے دکھ، تنہائی، محرومی اور بے بسی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان کرتی ہے اور اسی سے مدد اور تسلی کی امید رکھتی ہے۔نظم کے ذریعے حالی نے نہ صرف ایک مظلوم عورت کے درد کو زبان دی ہے بلکہ اس عہد کے معاشرتی رویوں کی بھی عکاسی کی ہے، جن کے باعث بیوہ عورت کو زندگی میں شدید مشکلات اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

''مناجاتِ بیوہ'' محض ایک بیوہ کی خدا کے حضور فریاد نہیں بلکہ انسانی ہمدردی، عورت کے احترام اور معاشرتی اصلاح کا مؤثر پیغام بھی ہے۔حالی نے سادہ اور عام فہم زبان میں بیوہ کے کرب کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری اس کے دکھ اور تنہائی کو محسوس کرنے لگتا ہے۔یہی درد مندی، سادگی اور اصلاحی جذبہ اس نظم کو حالی کی اہم اور مؤثر نظموں میں شامل کرتا ہے۔

5.2: نظم ''مناجات بیوہ'' کا متن

(۱)

اے سب سے اول اور آخر
جہاں تہاں، حاضر اور ناظر

اے سب داناؤں سے دانا
سارے تواناؤں سے توانا

اے بالا، ہر بالاتر سے
چاند سے سورج سے امبر سے

اے سمجھے بوجھے بن سوجھے
جانے پہچانے بن بوجھے

سب سے انوکھے سب سے نرالے
آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے

اے اندھوں کی آنکھ کے تارے
اے لنگڑے لولوں کے سہارے

ناتیوں سے چھوٹوں کے ناتی
ساتھیوں سے بچھڑوں کے ساتھی

ناؤ جہاں کی کھینے والے
دکھ میں تسلی دینے والے

جب اب تب تجھ سا نہیں کوئی
تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی

جوت ہے تیری جل اور تھل میں
باس ہے تیری پھول اور پھل میں

ہر دل میں ہے تیرا بسیرا
تو پاس اور گھر دور ہے تیرا

راہ تری دشوار اور سکڑی
نام ترا رہ گیر کی لکڑی

تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا
تو ہے سہارا غمگینوں کا

تو ہے اکیلوں کا رکھوالا
تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا

لاگو اچھے اور برے کا
خواہاں کھوٹے اور کھرے کا

بید نراسے بیماروں کا
گاہک مندے بازاروں کا

سوچ میں دل بہلانے والے
بپتا میں یاد آنے والے

(۲)

اے بے وارث گھروں کے وارث
بے بازو بے پروں کے وارث

بے آسوں کی آس ہے تو ہی
جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی

بس والے ہیں یا بے بس ہیں
تو نہیں جن کا وہ بے کس ہیں

ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا
دسرایت کی وہاں نہیں پروا

دل میں ہے جن کے تیری بڑائی
گنتے ہیں وہ پربت کو رائی

بیکس کا غم خوار ہے تو ہی
بری بنی کا یار ہے تو ہی

دکھیا دکھی یتیم اور بیوہ
تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا

تو ہی مرض دے تو ہی دوا دے
تو ہی دوا دارو میں شفا دے

تو ہی پلائے زہر کے پیالے
تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے

تو ہی دلوں میں آگ لگائے
تو ہی دلوں کی لگی بجھائے

چمکارے چمکار کے مارے
مارے مار کے پھر چمکارے

پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے
مار میں بھی اک تیری مزا ہے

(۳)

اے رحمت اور ہیبت والے
شفقت اور دباغت والے

اے اٹکل اور دھیان سے باہر
جان سے اور پہچان سے باہر

عقل سے کوئی پا نہیں سکتا
بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا

ایک کو تو نے شاد کیا ہے
ایک کے دل کو داغ دیا ہے

اس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا
اس سے نہ تو بیزار کچھ ایسا

ہر دم تیری آن نئی ہے
جب دیکھو تب شان نئی ہے

یہاں پچھوا ہے وہاں پروا ہے
گھر گھر تیرا حکم نیا ہے

پھول کہیں کملائے ہوئے ہیں
اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں

کھیتی ایک کی ہے لہراتی
ایک کا ہر دم خون سکھاتی

ایک پڑے ہیں دھن کو ڈبوئے
ایک ہیں گھوڑے بیچ کے سوئے

ایک نے جب سے ہوش سنبھالا
رنج سے اس کو پڑا نہ پالا

ایک نے اس جنجال میں آ کر
چین نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر

مینہ کہیں دولت کا ہے برستا
ہے کوئی پانی تک کو ترستا

ایک کو مرنے تک نہیں دیتے
ایک اکتا گیا لیتے لیتے

حال غرض دنیا کا یہی ہے
غم پہلے اور بعد خوشی ہے

رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا
تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا

یہاں نہیں بنتی رنج سہے بن
رنج نہیں سب ایک سے لیکن

ایک سے یہاں رنج ایک ہے بالا
ایک سے ہے درد ایک نرالا

گھاؤ ہے گو ناسور کی صورت
پر اسے کیا ناسور سے نسبت

تپ وہی دق کی شکل ہے لیکن
دق نہیں رہتی جان لیے بن

دق ہو وہ یا ناسور ہو کچھ ہو
دے نہ جو اب امید کسی کو

روز کا غم کیوں کر سہے کوئی
آس نہ جب باقی رہے کوئی

تو ہی کر انصاف اے مرے مولا
کون ہے جو بے آس ہے جیتا

گو کہ بہت بندے ہیں پر ارماں
کم ہیں مگر مایوس ہیں جو یاں

خواہ دکھی ہے خواہ سکھی ہے
جو ہے اک امید اس کو بندھی ہے

کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سوکھی
آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی

گھٹا جن کی اساڑی میں ہے
ساونی کی امید نہیں ہے

ڈوب چکی ہے ان کی اگیتی
دیتی ہے ڈھارس ان کو پچھیتی

ایک ہے اس امید پہ جیتا
اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا

ایک کو جو اولاد ملی ہے
اس کو امنگ شادیوں کی ہے

رنج ہے یا قسمت میں خوشی ہے
کچھ ہے مگر اک آس بندھی ہے

م نہیں ان کو غمگیں ہیں
جو دل ناامید نہیں ہیں

کال میں کچھ سختی نہیں ایسی
کال میں ہے جب آس سمیں کی

سہل ہے موجوں سے چھٹکارا
جب کہ نظر آتا ہے کنارا

پر نہیں اٹھ سکتی وہ مصیبت
آئے گی جس کے بعد نہ راحت

شاد ہو اس رہ گیر کا کیا دل؟
مر کے کٹے گی جس کی منزل

ان اجڑوں کو کل پڑے کیوں کر
گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر

ان بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا؟
جن کو نہ ملنے دے گا زمانہ

اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی
مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی

آئیں بہت دنیا میں بہاریں
عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں

پڑے بہت باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے

گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں کھلیں بہت برساتیں

پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

آس ہی کا بس نام ہے دنیا
جب نہ رہی یہی تو رہا کیا؟

ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ
جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ

رونا ان بن باسیوں کا ہے
دیس نکالا جن کو ملا ہے

حکم سے تیرے پر نہیں چارہ
کڑوی میٹھی سب ہے گوارا

زور ہے کیا پتے کا ہوا پر
چاہے جدھر لے جائے اڑا کر

تنکا اک اور سات سمندر
جائے کہاں موجوں سے نکل کر

سمت ہی میں جب تھی جدائی
پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی؟

آج کی بگڑی ہو تو بنے بھی
ازل کی بگڑی خاک بنے گی

تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا
بندے کا یاں بس نہیں چلتا

مارے اور نہ دے تو رونے
تھپکے اور نہ دے تو سونے

ٹھہرے بن آتی ہے نہ بھاگے
تیری زبردستی کے آگے

تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاہیں
بند ہیں چاروں کھونٹ کی راہیں

تو مارے اور خواہ نوازے
پڑی ہوئی ہوں میں تیرے دروازے

تجھ کو اپنا جانتی ہوں میں
تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

ماں ہی سدا بچہ کو مارے
اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

(۴)

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے

میں لونڈی تیری دکھیارے
دروازے کی تیری بھکاری

موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان اپنی ہے آپ اجیرن

اپنے پرائے کی دھتکاری
میکے اور سسرال پہ بھاری

سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بیزار چلی ہوں

دل پر میرے داغ ہیں جتنے
منہ میں بول نہیں ہیں اتنے

دکھ دل کا کچھ کہہ نہیں سکتی
اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتی

تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا
تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا

بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے
لینے کے یاں پڑ گئے دینے

خوشی میں بھی دکھ ساتھ نہ آیا
غم کے سوا کچھ ہات نہ آیا

ایک خوشی نے غم یہ دکھائے
ایک ہنسی نے گل ہی کھلائے

کیسا تھا یہ بیاہ ننھاواں
جوں ہی پڑا اس کا پرچھاواں

چین سے رہنے دیا نہ جی کو
کر دیا ملیامیٹ خوشی کو

رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک
اور روؤں تو روؤں کہاں تک

ہنس ہنس دل بہلاؤں کیوں کر
اوسوں پیاس بجھاؤں کیوں کر

ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا
ایک نہ ہنستا بھلا نہ روتا

لیٹے گر سونے کے بہانے
پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے

جاگیے تو بھی بن نہیں پڑتی
جاگنے کی آخر کوئی حد بھی

اب کل ہم کو پڑے گی مر کر
گور ہے سونی سیج سے بہتر

بات سے نفرت کام سے وحشت
ٹوٹی آس اور بجھی طبیعت

آبادی جنگل کا نمونہ
دنیا سونی اور گھر سونا

دن ہے بھیانک اور رات ڈرانی
یوں گزری ساری یہ جوانی

بہنیں اور بہنیلیاں میری
ساتھ کی جو تھیں کھیلیاں میری

مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے
خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے

جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ
جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ

کوئی نہیں دل کا بہلاوا
آ نہیں چکتا میرا بلاوا

آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا
کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا

تھک گئی دکھ سہتے سہتے
تھم گئے آنسو بہتے بہتے

آگ کھلی دل کی نہ کسی پر
گھل گئی جان اندر ہی اندر

دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے
جان کو پھونکا دل کی لگی نے

دبی تھی بھوبھل میں چنگاری
لی نہ کسی نے خبر ہماری

قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی
شہر میں وہ دھوئیں ساہوں کی

تہواروں کا آئے دن آنا
اور سب کا تہوار منانا

وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں
وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں

وہ گرمی کی چاندنی راتیں
وہ ارمان بھری برساتیں

کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں
خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں

چاؤ کے اور خوشیوں کے سمے سب
آتے ہیں خوش کل جان کو ہو جب

رنج میں ہیں سامان خوشی کے
اور جلانے والے ہی کے

گھر برکھا اور پیا بدیسی
آئیو برکھا کہیں نہ ایسی

دن یہ جوانی کے کٹے ایسے
باغ میں پنچھی قید ہو جیسے

رت گئی ساری سر ٹکراتے
اڑ نہ سکے پر ہوتے سارے

کسی نے ہوگی کچھ کل پائی
مجھے تو شادی راس نہ آئی

آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ
پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ

رہ گیا دے کر چاند دکھائی　　چاند ہوا پر عید نہ آئی
پھل کی خاطر برچھی کھائی　　پھل نہ ملا اور جان گنوائی
ریت میں ذرے دیکھ چمکتے　　دوڑ پڑی میں جھیل سمجھ کے
چاروں کھونٹ نظر دوڑائی　　پر پانی کی بوند نہ پائی

5.2.1: نظم ''مناجات بیوہ'' کی تشریح

ذیل میں الطاف حسین حالؔی کی نظم ,, مناجاتِ بیوہ'' کے تمام بندوں کی تشریح پیش کی جاتی ہے۔ چونکہ نظم طویل ہے، اس لیے ہر بند کے اشعار کو ان کے مفہوم اور مرکزی کیفیت کے لحاظ سے مربوط انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

بند اوّل کی تشریح

اے سب سے اول اور آخر
جہاں تہاں، حاضر اور ناظر
اے سب داناؤں سے دانا
سارے تواناؤں سے توانا
اے بالا، ہر بالاتر سے
چاند سے سورج سے امبر سے
اے سمجھے بوجھے بن سوجھے
جانے پہچانے بن بوجھے
سب سے انوکھے سب سے نرالے
آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے
اے اندھوں کی آنکھ کے تارے

اے لنگڑے لولوں کے سہارے
ناتیوں سے چھوٹوں کے ناتی
ساتھیوں سے بچھڑوں کے ساتھی
ناؤ جہاں کی کھینے والے
دکھ میں تسلی دینے والے
جب اب تب تجھ سا نہیں کوئی
تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی
جوت ہے تیری جل اور تھل میں
باس ہے تیری پھول اور پھل میں
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا
تو پاس اور گھر دور ہے تیرا
راہ تری دشوار اور سکڑی
نام ترا رہ گیر کی لکڑی
تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا
تو ہے سہارا غمگینوں کا
تو ہے اکیلوں کا رکھوالا
تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا
لاگو اچھے اور برے کا
خواہاں کھوٹے اور کھرے کا

بید نراسے بیماروں کا

گاہک مندے بازاروں کا

سوچ میں دل بہلانے والے

بپتا میں یاد آنے والے

تشریح

نظم کے آغاز میں شاعر ایک بیوہ عورت کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہے۔ بیوہ سب سے پہلے خدا کی عظمت، قدرت، علم اور رحمت کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ اللہ کو اول وآخر، حاضر وناظر، سب سے زیادہ دانا اور سب سے زیادہ طاقت ور قرار دیتی ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کی ذات ہر چیز سے بلند اور برتر ہے۔ چاند، سورج اور آسمان جیسی عظیم مخلوقات بھی اس کی قدرت کے سامنے معمولی ہیں۔ بیوہ کہتی ہے کہ خدا انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر چہ انسان اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا لیکن اس کی ذات ہر طرف موجود ہے اور اس کی روشنی انسان کے دل کو منور کرتی ہے۔ شاعر نے خدا کو اندھوں کی آنکھوں کا تارا اور لنگڑوں اور معذوروں کا سہارا قرار دے کر اس کی شفقت اور مہربانی کو نمایاں کیا ہے۔ خدا ان لوگوں کا ساتھی ہے جو اپنے عزیزوں اور ساتھیوں سے جدا ہو گئے ہیں اور ان لوگوں کا محافظ ہے جن کا کوئی مددگار نہیں۔

بیوہ کے نزدیک دنیا کی زندگی ایک کشتی کی مانند ہے اور خدا اس کشتی کو کھینے اور اسے مشکلات سے نکالنے والا ہے۔ انسان جب مصیبت اور غم میں مبتلا ہوتا ہے تو اسی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسی سے تسلی پاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں خدا کے برابر کوئی نہیں۔ تمام مخلوقات اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور زمین وآسمان کی ہر شے میں اس کی قدرت اور نور جلوہ گر ہے۔ آگے بیوہ کہتی ہے کہ اگر چہ خدا ہر دل کے قریب ہے، لیکن اس کی حقیقی ذات انسانی عقل کی پہنچ سے بہت دور ہے۔ اس کی راہ مشکل ضرور ہے، مگر اس کا نام مصیبت زدہ انسان کے لیے سہارا اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ شاعر نے خدا کو مسکینوں کا ٹھکانا، غمگینوں کا سہارا، تنہا انسانوں کا محافظ اور تاریک گھروں کا چراغ قرار دیا ہے۔

اس بند کے آخری حصے میں خدا کی رحمت کو مزید واضح کیا گیا ہے۔ وہ اچھے اور برے، کھوٹے اور کھرے، سب کی ضرورتوں سے واقف ہے۔ بیماروں کی شفا، ناامیدوں کی امید اور شکستہ دلوں کی تسلی اسی کے اختیار میں ہے۔ انسان جب مصیبت میں ہوتا ہے اور دنیا کی تمام آسائشیں بے معنی معلوم ہونے لگتی ہیں تو اسے خدا ہی یاد آتا ہے۔ اس طرح اس بند میں خدا کی عظمت، رحمت، ہمہ گیری اور بے سہارا انسانوں کے لیے اس کی پناہ گاہ ہونے کا تصور پیش کیا گیا ہے۔

بند دوم کی تشریح

اے بے وارث گھروں کے وارث
بے بازو بے پروں کے وارث
بے آسوں کی آس ہے تو ہی
جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی
بس والے ہیں یا بے بس ہیں
تو نہیں جن کا وہ بے کس ہیں
ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا
دسرایت کی وہاں نہیں پروا
دل میں ہے جن کے تیری بڑائی
گنتے ہیں وہ پربت کو رائی
بیکس کا غم خوار ہے تو ہی
بری بنی کا یار ہے تو ہی
دکھیا دکھی یتیم اور بیوہ
تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا
تو ہی مرض دے تو ہی دوا دے
تو ہی دوا دارو میں شفا دے
تو ہی پلائے زہر کے پیالے
تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے

تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے
مارے مار کے پھر چمکارے
پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے
مار میں بھی اک تیری مزا ہے

تشریح

اس بند میں بیوہ عورت خدا کو بے سہارا اور بے وارث لوگوں کا وارث قرار دیتی ہے۔ جن لوگوں کے پاس کوئی مددگار، رشتہ دار یا محافظ نہیں ہوتا، ان کے لیے خدا ہی سب سے بڑا سہارا ہے۔ جو لوگ جسمانی طور پر کمزور اور مجبور ہیں، وہ بھی اسی کی حفاظت اور رحمت کے محتاج ہیں۔ بیوہ کہتی ہے کہ جس انسان کو خدا پر مکمل بھروسا حاصل ہو، وہ کبھی بے آسرا نہیں ہوتا۔ دنیا کے لحاظ سے اگرچہ وہ تنہا اور کمزور ہو، لیکن خدا اس کے ساتھ ہو تو اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جن لوگوں کے دل میں خدا کی عظمت موجود ہوتی ہے، وہ بڑی سے بڑی مصیبت کو بھی معمولی سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں۔ اس لیے خدا کی یاد انسان کے اندر صبر، حوصلہ اور طاقت پیدا کرتی ہے۔

اس کے بعد شاعر خدا کو بے کسوں کا غم خوار، مصیبت زدوں کا مددگار، دکھیوں، یتیموں اور بیواؤں کا محافظ قرار دیتا ہے۔ یہ الفاظ نظم کے بنیادی موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ نظم کی مرکزی کردار خود ایک بیوہ ہے۔ وہ اپنی محرومی اور تنہائی کے عالم میں خدا ہی کو اپنا حقیقی سہارا سمجھتی ہے۔ اس بند میں خدا کی قدرت کا فلسفہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ بیوہ کہتی ہے کہ بیماری بھی خدا کی طرف سے آتی ہے اور اس کی دوا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ زہر میں اثر پیدا کرنا اور اسی زہر کو بے اثر کر دینا بھی اسی کی قدرت ہے۔ وہ دلوں میں محبت اور آگ پیدا کرتا ہے اور پھر اسی آگ کو بجھانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔

آخری اشعار میں ایک گہرا روحانی اور صوفیانہ تصور پیش کیا گیا ہے۔ خدا کبھی انسان کو نوازتا ہے اور کبھی آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن اس کی سزا اور اس کی شفقت دونوں میں بندے کے لیے حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ بیوہ کہتی ہے کہ خدا کی محبت اتنی عظیم ہے کہ اس کی طرف سے آنے والی تکلیف میں بھی ایک خاص لطف اور معنویت موجود ہوتی ہے۔ گویا سچا بندہ خدا کی عطا اور آزمائش دونوں کو اس کی محبت کا حصہ سمجھتا ہے۔

بندسوم کی تشریح

اے رحمت اور ہیبت والے
شفقت اور دباغت والے
اے اٹکل اور دھیان سے باہر
جان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا
بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا
ایک کو تو نے شاد کیا ہے
ایک کے دل کو داغ دیا ہے
اس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا
اس سے نہ تو بیزار کچھ ایسا
ہر دم تیری آن نئی ہے
جب دیکھو تب شان نئی ہے
یہاں پچھوا ہے وہاں پروا ہے
گھر گھر تیرا حکم نیا ہے
پھول کہیں کملائے ہوئے ہیں
اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں
کھیتی ایک کی ہے لہراتی
ایک کا ہر دم خون سکھاتی
ایک پڑے ہیں دھن کو ڈبوئے

ایک ہیں گھوڑے بیچ کے سوئے
ایک نے جب سے ہوش سنبھالا
رنج سے اس کو پڑا نہ پالا
ایک نے اس جنجال میں آ کر
چین نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر
مینہ کہیں دولت کا ہے برستا
ہے کوئی پانی تک کو ترستا
ایک کو مرنے تک نہیں دیتے
ایک اکتا گیا لیتے لیتے
حال غرض دنیا کا یہی ہے
غم پہلے اور بعد خوشی ہے
رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا
تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا
یہاں نہیں بنتی رنج سہے بن
رنج نہیں سب ایک سے لیکن
ایک سے یہاں رنج ایک ہے بالا
ایک سے ہے درد ایک نرالا
گھاؤ ہے گو ناسور کی صورت
پر اسے کیا ناسور سے نسبت
تپ وہی دق کی شکل ہے لیکن

دق نہیں رہتی جان لیے بن
دق ہو وہ یا ناسور ہو کچھ ہو
دے نہ جو اب امید کسی کو
روز کا غم کیوں کر سہے کوئی
آس نہ جب باقی رہے کوئی
تو ہی کر انصاف اے مرے مولا
کون ہے جو بے آس ہے جیتا
گو کہ بہت بندے ہیں پر ارماں
کم ہیں مگر مایوس ہیں جو یاں
خواہ دکھی ہے خواہ سکھی ہے
جو ہے اک امید اس کو بندھی ہے
کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سوکھی
آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی
گھٹا جن کی اساڑی میں ہے
ساونی کی امید نہیں ہے
ڈوب چکی ہے ان کی اگیتی
دیتی ہے ڈھارس ان کو پچھیتی
ایک ہے اس امید پہ جیتا
اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا
ایک کو جو اولاد ملی ہے

اس کو امنگ شادیوں کی ہے
رنج ہے یا قسمت میں خوشی ہے
کچھ ہے مگر اک آس بندھی ہے
غم نہیں ان کو غمگیں ہیں
جو دل ناامید نہیں ہیں
کال میں کچھ سختی نہیں ایسی
کال میں ہے جب آس سمیں کی
سہل ہے موجوں سے چھٹکارا
جب کہ نظر آتا ہے کنارا
پر نہیں اٹھ سکتی وہ مصیبت
آئے گی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہو اس رہ گیر کا کیا دل؟
مر کے کٹے گی جس کی منزل
ان اجڑوں کو کل پڑے کیوں کر
گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر
ان بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا؟
جن کو نہ ملنے دے گا زمانہ
اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی
مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی
آئیں بہت دنیا میں بہاریں

عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی
آس ہی کا بس نام ہے دنیا
جب نہ رہی یہی تو رہا کیا؟
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ
جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ
رونا ان بن باسیوں کا ہے
دیس نکالا جن کو ملا ہے
حکم سے تیرے پر نہیں چارہ
کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
زور ہے کیا پتے کا ہوا پر
چاہے جدھر لے جائے اڑا کر
تنکا اک اور سات سمندر
جائے کہاں موجوں سے نکل کر
قسمت ہی میں جب تھی جدائی

پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی؟
آج کی بگڑی ہو تو بنے بھی
ازل کی بگڑی خاک بنے گی
تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا
بندے کا یاں بس نہیں چلتا
مارے اور نہ دے تو رونے
تھپکے اور نہ دے تو سونے
ٹھہرے بن آتی ہے نہ بھاگے
تیری زبردستی کے آگے
تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاہیں
بند ہیں چاروں کھونٹ کی راہیں
تو مارے اور خواہ نوازے
پڑی ہوئی ہوں میں تیرے دروازے
تجھ کو اپنا جانتی ہوں میں
تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں
ماں ہی سدا بچہ کو مارے
اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

تشریح

اس بند میں بیوہ خدا کی رحمت اور جلال دونوں کا ذکر کرتی ہے۔ خدا نہایت مہربان بھی ہے اور عظیم ہیبت و طاقت کا مالک بھی۔ انسان اپنی عقل، اندازے اور خیال کے ذریعے اس کی حقیقت کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی حکمت اور اس کے فیصلے انسانی عقل سے کہیں بلند ہیں۔

بیوہ دنیا میں موجود تفاوت کو دیکھ کر حیران ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ ایک انسان خوش اور خوش حال ہے جبکہ دوسرا غم اور محرومی میں مبتلا ہے۔ ایک شخص کو زندگی کی تمام آسائشیں حاصل ہیں اور دوسرے کے دل پر دکھوں کے داغ لگے ہوئے ہیں۔ تاہم وہ یہ بھی کہتی ہے کہ اس تفاوت کا مطلب یہ نہیں کہ خدا ایک سے محبت کرتا ہے اور دوسرے سے نفرت کرتا ہے، بلکہ اس کی حکمت انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

دنیا کی زندگی ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ کہیں ہوا ایک سمت چل رہی ہے اور کہیں دوسری سمت۔ کہیں پھول مرجھا رہے ہیں اور کہیں پھل پک رہے ہیں۔ کسی کی فصل لہلہا رہی ہے جبکہ کسی کی کھیتی خشک ہو رہی ہے۔ کسی کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ اسے سنبھال نہیں سکتا، جبکہ کوئی شخص پانی کے ایک قطرے کے لیے ترس رہا ہے۔ شاعر نے ان تضادات کے ذریعے انسانی زندگی کی ناہمواری کو بیان کیا ہے۔ ایک انسان بچپن سے خوش حال زندگی گزارتا ہے اور دوسرے کو پیدائش سے موت تک چین نصیب نہیں ہوتا۔ کہیں دولت کی بارش ہو رہی ہے اور کہیں انسان بنیادی ضرورتوں سے محروم ہے۔ کسی کو زندگی سے محبت ہے مگر اسے موت نہیں آتی، جبکہ کوئی زندگی سے اکتا چکا ہے۔ اس طرح شاعر انسانی زندگی کے تلخ اور پیچیدہ تضادات کو سامنے لاتا ہے۔

بیوہ کہتی ہے کہ غم دنیا کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ یہاں کوئی شخص رنج اور تکلیف سے مکمل طور پر محفوظ نہیں۔ البتہ ہر انسان کا دکھ مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ کسی کا زخم ناسور کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کسی کی بیماری اتنی شدید ہوتی ہے کہ زندگی ہی چھین لیتی ہے۔ اس کے بعد نظم کا ایک نہایت اہم فلسفیانہ پہلو سامنے آتا ہے: امید۔ بیوہ کہتی ہے کہ انسان ہر قسم کا غم برداشت کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے دل میں امید باقی ہو۔ امید ختم ہو جائے تو زندگی کا بوجھ ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ خواہ انسان غریب ہو یا امیر، دکھی ہو یا خوش حال، وہ کسی نہ کسی امید کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ کسان خشک فصل دیکھ کر بارش کی امید رکھتا ہے۔ جس کی پہلی فصل تباہ ہو جائے، وہ اگلی فصل سے امید باندھ لیتا ہے۔ کوئی شخص بیٹے یا بیٹی کی پیدائش کی امید میں جیتا ہے اور جسے اولاد حاصل ہو جائے، وہ اس کی شادی اور مستقبل کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اس طرح زندگی دراصل امید کے سہارے چلتی ہے۔

بیوہ کہتی ہے کہ اصل مصیبت وہ ہے جس کے بعد راحت کی کوئی امید باقی نہ رہے۔ سمندر کی موجوں سے لڑنا اس وقت آسان ہے جب دور کہیں کنارا دکھائی دے، لیکن اگر انسان کو معلوم ہو کہ اس کی منزل موت پر ختم ہوگی اور اس کے بعد کوئی خوشی نہیں آئے گی، تو اس کے لیے سفر بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ یہاں بیوہ اپنی ذاتی زندگی کی طرف آتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے لیے مستقبل میں خوشی کی کوئی امید باقی نہیں۔ اس کے شوہر کی جدائی ایسی تقدیر بن چکی ہے جس کا بدلنا ممکن نہیں۔ دنیا میں بہاریں آئیں گی، لوگ خوشیاں منائیں گے، باغوں میں جھولے پڑیں گے،

چاندنی راتیں آئیں گی اور برساتیں برسیں گی، لیکن اس کے دل کی وہ کلی جو شوہر کی جدائی سے مرجھا گئی ہے، دوبارہ کبھی نہیں کھلے گی۔

بیوہ کے نزدیک دنیا کا اصل سرمایہ امید ہے۔ جب امید ختم ہو جائے تو زندگی کی کشش بھی ختم ہو جاتی ہے۔ کسی ایسے مسافر کی جدائی کا غم کم ہوتا ہے جس کے واپس آنے کی امید ہو، لیکن اس شخص کا غم نا قابلِ برداشت ہوتا ہے جس سے دوبارہ ملنا ناممکن ہو۔ وہ تقدیر کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کرتی ہے۔ انسان ہوا کے سامنے پتے کی طرح بے اختیار ہے۔ جس طرح تنکا سمندر کی موجوں میں بے بس ہوتا ہے، اسی طرح انسان تقدیر کے فیصلوں کے سامنے بے اختیار ہے۔ جب قسمت میں جدائی لکھی ہو تو انسان اسے نہیں روک سکتا۔

آخر میں بیوہ مکمل طور پر خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تو چاہے مارے یا نوازے، میں تیرے در پر پڑی ہوں۔ میرا تیرے سوا کوئی نہیں۔ شاعر نے ماں اور بچے کی مثال دے کر نہایت مؤثر انداز میں انسان اور خدا کے تعلق کو بیان کیا ہے۔ ماں بچے کو سزا دیتی ہے مگر بچہ پھر بھی اسی کو پکارا ہے۔ اسی طرح انسان خدا کی طرف سے مصیبت ملنے کے باوجود اسی کو اپنا حقیقی سہارا سمجھتا ہے۔

بند چہارم کی تشریح

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیارے
دروازے کی تیری بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان اپنی ہے آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری
میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے

منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
دکھ دل کا کچھ کہہ نہیں سکتی
اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتی
تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا
تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے
لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی دکھ ساتھ نہ آیا
غم کے سوا کچھ ہات نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے
ایک ہنسی نے گل ہی کھلائے
کیسا تھا یہ بیاہ ننا واں
جوں ہی پڑا اس کا پرچھاواں
چین سے رہنے دیا نہ جی کو
کر دیا ملیامیٹ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک
اور روؤں تو روؤں کہاں تک
ہنس ہنس دل بہلاؤں کیوں کر
اوسوں پیاس بجھاؤں کیوں کر
ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا

ایک نہ ہنستا بھلا نہ روتا
لیٹے گر سونے کے بہانے
پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے
جاگیے تو بھی بن نہیں پڑتی
جاگنے کی آخر کوئی حد بھی
اب کل ہم کو پڑے گی مر کر
گور ہے سونی سیج سے بہتر
بات سے نفرت کام سے وحشت
ٹوٹی آس اور بجھی طبیعت
آبادی جنگل کا نمونہ
دنیا سونی اور گھر سونا
دن ہے بھیانک اور رات ڈرانی
یوں گزری ساری یہ جوانی
بہنیں اور بہنیلیاں میری
ساتھ کی جو تھیں کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے
خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ
جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ
کوئی نہیں دل کا بہلاوا

آ نہیں چکتا میرا بلاوا
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا
کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
تھک گئی دکھ سہتے سہتے
تھم گئے آنسو بہتے بہتے
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر
گھل گئی جان اندر ہی اندر
دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے
جان کو پھونکا دل کی لگی نے
دبی تھی بھوبھل میں چنگاری
لی نہ کسی نے خبر ہماری
قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی
شہر میں وہ دھوئیں ساہوں کی
تہواروں کا آئے دن آنا
اور سب کا تہوار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں
وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں
وہ ارمان بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں

خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں

چاؤ کے اور خوشیوں کے سمے سب

آتے ہیں خوش کل جان کو ہو جب

رنج میں ہیں سامان خوشی کے

اور جلانے والے ہی کے

گھر برکھا اور پیا بدیسی

آئیو برکھا کہیں نہ ایسی

دن یہ جوانی کے کٹے ایسے

باغ میں پنچھی قید ہو جیسے

رت گئی ساری سر ٹکراتے

اڑ نہ سکے پر ہوتے سارے

کسی نے ہوگی کچھ کل پائی

مجھے تو شادی راس نہ آئی

آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ

پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ

رہ گیا دے کر چاند دکھائی

چاند ہوا پر عید نہ آئی

پھل کی خاطر برچھی کھائی

پھل نہ ملا اور جان گنوائی

ریت میں ذرے دیکھ چمکتے

دوڑ پڑی میں جھیل سمجھ کے
چاروں کھونٹ نظر دوڑائی
پر پانی کی بوند نہ پائی

تشریح

اس بند میں نظم کا سب سے زیادہ دردناک اور جذباتی حصہ سامنے آتا ہے۔ یہاں بیوہ براہِ راست اپنی ذاتی زندگی، اپنے دکھوں اور اپنی محرومیوں کا بیان کرتی ہے۔ وہ خدا کو طاقت اور قدرت کا مالک قرار دے کر کہتی ہے کہ میں تیری ایک بے بس اور دکھی لونڈی ہوں اور تیرے در کی بھکاری ہوں۔ وہ اپنی زندگی سے اس قدر تنگ آ چکی ہے کہ اسے موت زندگی سے زیادہ محبوب معلوم ہونے لگی ہے۔ زندگی اس کے لیے بوجھ بن گئی ہے۔ اپنے اور پرائے سب اس سے دور ہو گئے ہیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے میکے اور سسرال دونوں پر بوجھ بن چکی ہے۔ بیوہ کہتی ہے کہ اس نے زندگی میں بے شمار دکھ برداشت کیے ہیں اور اب وہ دنیا سے بیزار ہو چکی ہے۔ اس کے دل میں اتنے غم موجود ہیں کہ انہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے دکھ اس قدر گہرے ہیں کہ زبان ان کی مکمل ترجمانی کرنے سے عاجز ہے۔ البتہ خدا اس کے تمام راز اور دکھوں سے واقف ہے، اس لیے اسے اپنی حقیقت خدا کے سامنے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے نکاح کے تجربے کو یاد کرتی ہے اور کہتی ہے کہ شادی کے وقت اسے خوشی اور محبت کی امید تھی، لیکن اس خوشی کے ساتھ ہی غم اس کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ جس شادی کو اس نے اپنی خوشیوں کا آغاز سمجھا تھا، وہی اس کی زندگی کے دکھوں کا سبب بن گئی۔ شاعر نے اس طرح بیوہ کی زندگی کے المیے کو انتہائی مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

وہ کہتی ہے کہ شادی کے بعد اسے حقیقی خوشی نصیب نہ ہوئی۔ ایک لمحے کی خوشی نے اسے بے شمار دکھ دیے اور ایک مسکراہٹ کے پیچھے غموں کا ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ شادی کا سایہ اس کی زندگی پر پڑتے ہی اس کے سکون اور خوشی کو تباہ کر گیا۔ بیوہ اپنی تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اب وہ اتنا رو چکی ہے کہ رونے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے غم اتنے زیادہ ہیں کہ ہنس کر دل بہلانا بھی ممکن نہیں۔ وہ اس شخص کی مانند ہو گئی ہے جو نہ حقیقی طور پر زندہ ہے اور نہ سکون کے ساتھ مر سکتا ہے۔ اس کے لیے نیند بھی راحت نہیں رہی۔ بستر پر لیٹتی ہے تو نہ پاؤں کی طرف چین ہے اور نہ سرہانے سکون۔ جاگتی ہے تو زندگی کا دکھ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اب قبر کی تنہائی اپنے خالی بستر سے بہتر محسوس ہونے لگی ہے۔ یہ اشعار بیوہ کی شدید ذہنی اور جذباتی تنہائی کو ظاہر کرتے ہیں وہ کہتی ہے کہ اب اسے گفتگو سے نفرت اور کام سے وحشت ہونے لگی

ہے۔امید ختم ہوچکی ہےاور دل کی تمام رونق بجھ گئی ہے۔آباد دنیا اسے جنگل کی مانند اور اپنا گھر سنسان محسوس ہوتا ہے۔دن خوف ناک اور راتیں ڈراؤنی معلوم ہوتی ہیں۔یوں اس کی پوری جوانی غم اور تنہائی میں گزر گئی۔بیوہ اپنی بہنوں، سہیلیوں اور بچپن کی ساتھیوں کو یاد کرتی ہے۔وہ اس سے ملنے آتی ہیں،لیکن وہ ان کے ساتھ دل کھول کر بات یا ہنس بول نہیں سکتی۔جب وہ آتی ہیں تو روتی ہیں اور جب واپس جاتی ہیں تو بھی بے چین ہوتی ہیں۔ان کی آمد بھی بیوہ کے دکھ کو کم نہیں کر پاتی۔

وہ کہتی ہے کہ اس کے دل کا کوئی سچا بہلاوا نہیں اور اس کی زندگی مسلسل غم اور تنہائی میں گزر رہی ہے۔اسے یہ فکر ستاتی ہے کہ وہ اپنی باقی زندگی، یعنی رنڈاپے کے طویل عرصے کو کس طرح گزارے گی۔مسلسل دکھ سہتے سہتے وہ تھک گئی ہے اور روتے روتے اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔اس کے دل کی آگ کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی۔وہ اندر ہی اندر جلتی اور گھلتی رہی۔کسی نے اس کے دل کی کیفیت کو پوری طرح نہ سمجھا اور اس کے غم کی چنگاری خاموشی سے اس کے اندر سلگتی رہی۔آگے شاعر نے بیوہ کے جذباتی دکھ کو موسموں اور تہواروں کے ذریعے بہت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔شادیوں کی خوشیاں، تہوار، چیت اور پھاگن کی ہوائیں، ساون بھادوں کی گھٹائیں، چاندنی راتیں اور برساتیں سب دوسروں کے لیے خوشی کا سامان ہیں،لیکن بیوہ کے لیے یہی چیزیں اس کے غم کو مزید بڑھا دیتی ہیں۔جو مناظر دوسروں کو خوشی دیتے ہیں، وہ اسے اپنی محرومی اور تنہائی کا احساس دلاتے ہیں۔

وہ کہتی ہے کہ جوانی کے دن اس طرح گزر گئے جیسے کوئی پرندہ پنجرے میں قید ہو۔اس کے پاس پر ہونے کے باوجود وہ آزادانہ پرواز نہیں کر سکی۔اس نے پوری زندگی سر ٹکراتے اور تڑپتے ہوئے گزار دی۔بیوہ افسوس سے کہتی ہے کہ شاید کسی کو شادی سے خوشی اور سکون ملا ہو،لیکن اس کے لیے شادی خوش بختی کا باعث نہیں بن سکی۔اس نے شادی سے بہت سی امیدیں وابستہ کی تھیں، مگر وہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔شاعر نے اس کیفیت کو کئی بلیغ تشبیہوں سے بیان کیا ہے۔بیوہ کی امیدیں ایسے پھول کی مانند ہیں جس میں پھل نہ لگا۔اسے چاند تو دکھائی دیا مگر عید کی خوشی نصیب نہ ہوئی۔اس نے پھل حاصل کرنے کی کوشش میں تکلیف اٹھائی، مگر پھل بھی نہ ملا اور زندگی کی خوشی بھی ختم ہو گئی۔

آخری اشعار میں وہ اپنی امیدوں کو صحرا میں پانی کی تلاش سے تشبیہ دیتی ہے۔اسے ریت کے چمکتے ذرات دور سے پانی کی جھیل محسوس ہوئے اور وہ امید کے ساتھ ان کی طرف دوڑی،لیکن وہاں پہنچ کر اسے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملا۔اس تشبیہ کے ذریعے شاعر نے بیوہ کی زندگی کی تمام ناکام امیدوں، محرومیوں اور حسرتوں کو نہایت دردناک انداز میں سمیٹ دیا ہے۔

5.2.2:نظم ''مناجات بیوہ'' کی فنی خصوصیات

نظم ''مناجاتِ بیوہ'' حالؔی کی اصلاحی اور جذباتی شاعری کا ایک اہم نمونہ ہے۔اس نظم کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی اور سلاست ہے۔شاعر نے مشکل اور ثقیل زبان کے بجائے عام فہم اور دل نشین الفاظ استعمال کیے ہیں،جس کی وجہ سے بیوہ کے دکھ براہِ راست قاری کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔نظم میں مناجات کا انداز اختیار کیا گیا ہے،یعنی پوری نظم میں بیوہ خدا سے براہِ راست گفتگو کرتی ہے۔اس مکالماتی انداز نے نظم میں جذباتی شدت پیدا کر دی ہے۔حالؔی نے تشبیہات،استعارات اور علامتوں کا مؤثر استعمال کیا ہے۔پتے کا ہوا کے سامنے بے بس ہونا،تنکے کا سمندر کی موجوں میں بہنا،قید پرندے کا پنجرے میں تڑپنا،مرجھائی ہوئی کلی،خشک کھیتی اور صحرا میں پانی کی تلاش جیسی تصویریں نظم کے درد کو زیادہ مؤثر بناتی ہیں۔نظم میں تضاد کا بھی خوب صورت استعمال ملتا ہے،جیسے کہیں خوشی اور کہیں غم،کہیں دولت کی فراوانی اور کہیں پانی کی کمی،کہیں لہلہاتی فصل اور کہیں خشک کھیتی۔یہ تضادات زندگی کی ناہمواری اور انسانی قسمت کے فرق کو نمایاں کرتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر اس نظم کی خصوصیت اس کی جذباتی صداقت اور دردانگیزی ہے۔حالی نے بیوہ کے دل کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ قاری اس کے دکھ کو محض سمجھتا ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ,, مناجاتِ بیوہ'' اردو نظم میں انسانی ہمدردی،سماجی شعور اور دردانگیز جذبات کی ایک نہایت اہم اور مؤثر نظم شمار ہوتی ہے۔

مناجاتِ بیوہ'' کا مرکزی خیال ایک بیوہ عورت کی بے بسی،تنہائی،محرومی،امید اور ناامیدی کے جذبات کا اظہار ہے۔ حالی نے بیوہ کو محض ایک فرد کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعے معاشرے میں عورت کی اس المناک حالت کو نمایاں کیا ہے جو شوہر کی وفات کے بعد تنہائی،سماجی محرومی اور بے سہارگی کا شکار ہو جاتی ہے۔نظم میں خدا کی ذات بیوہ کے لیے آخری اور سب سے بڑا سہارا ہے۔وہ دنیا کے تمام سہاروں سے محروم ہو کر خدا سے مخاطب ہوتی ہے اور اپنی زندگی کے تمام دکھ اس کے سامنے رکھتی ہے۔نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسان کی زندگی امید کے سہارے قائم رہتی ہے،لیکن جب مستقبل کی امید بھی ختم ہو جائے تو زندگی انتہائی دردناک اور دشوار محسوس ہونے لگتی ہے۔حالی نے اس نظم کے ذریعے بیوہ عورت کے انفرادی غم کو ایک اجتماعی اور انسانی مسئلے کی صورت دے دی ہے۔

5.3: سرگرمی! آؤ اپنی معلومات جانچیں۔

سوال۱: نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) نظیر اکبر آبادی　　(ب) الطاف حسین حالی

(ج) اکبر الہ آبادی　　(د) محمد حسین آزاد

سوال۲: ''مناجاتِ بیوہ'' میں بنیادی طور پر کس طبقے کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے؟

(الف) کسانوں کے　　(ب) مزدوروں کے

(ج) بیوہ عورتوں کے　　(د) تاجروں کے

سوال۳: حالی کی شاعری کا بنیادی وصف کیا ہے؟

(الف) محض تفریح　　(ب) مقصدیت اور اصلاح

(ج) داستان گوئی　　(د) رزمیہ انداز

سوال۴: ''مناجاتِ بیوہ'' کس صنفِ شاعری سے تعلق رکھتی ہے؟

(الف) غزل　　(ب) قصیدہ

(ج) نظم　　(د) مثنوی

سوال۵: ''مناجاتِ بیوہ'' میں بیوہ عورت کس سے فریاد کرتی ہے؟

(الف) بادشاہ سے　　(ب) معاشرے سے

(ج) اللہ تعالیٰ سے　　(د) اپنے رشتہ داروں سے

5.4: عمومی جائزہ۔

خواجہ الطاف حسین حالی اردو کے ان اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے شاعری کو محض حسن و عشق اور تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا

بلکہ اسے معاشرتی اصلاح اور انسانی ہمدردی کا مؤثر وسیلہ بنایا۔نظم ''مناجاتِ بیوہ'' بھی اسی اصلاحی اور مقصدی شاعری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں حالؔی نے ایک بیوہ عورت کی زبان سے اس کے دکھ، محرومی، بے بسی اور معاشرتی مسائل کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔نظم کی بیوہ اپنے شوہر کی جدائی کے غم میں مبتلا ہے۔شوہر کی وفات کے بعد اس کی زندگی مشکلات اور پریشانیوں سے بھر جاتی ہے۔وہ خود کو تنہا، بے سہارا اور کمزور محسوس کرتی ہے۔معاشرے میں بیوہ عورت کو جن مشکلات، پابندیوں اور بے اعتنائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شاعر نے ان کی عکاسی بڑے دردمندانہ انداز میں کی ہے۔بیوہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی فریاد پیش کرتی ہے۔وہ اپنے دکھ اور مصائب بیان کرتے ہوئے خدا سے مدد، صبر اور سہارا طلب کرتی ہے۔اس کے کرب کے ذریعے حالؔی نے دراصل معاشرے کو یہ احساس دلایا ہے کہ بیوہ عورت بھی عزت، محبت، ہمدردی اور انسانی حقوق کی مستحق ہے۔اسے بوجھ یا منحوس سمجھنا انسانی اور اخلاقی اعتبار سے غلط ہے۔

اس نظم میں حالؔی کی انسان دوستی، اصلاحِ معاشرہ، عورتوں کے مسائل سے ہمدردی اور مذہبی احساس نمایاں ہے۔شاعر نے بیوہ کے دکھ کو صرف ایک فرد کا ذاتی غم نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک سماجی مسئلہ بنا کر پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ''مناجاتِ بیوہ'' اردو کی اصلاحی اور مقصدی شاعری میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

5.5:فرہنگ

مناجات	:	اللہ تعالیٰ سے دعا اور فریاد
بیوہ	:	جس عورت کا شوہر وفات پا چکا ہو
فریاد	:	مدد کے لیے پکار، التجا
الم	:	غم، دکھ
مصیبت	:	تکلیف، پریشانی
بے کسی	:	بے سہارا ہونے کی حالت
بے بسی	:	لاچاری، مجبوری
غم گسار	:	غم میں شریک ہونے والا

مونس	:	ساتھی، دل بہلانے والا
رفیق	:	ساتھی
آفت	:	مصیبت، بلا
ابتلا	:	آزمائش، سخت مصیبت
صبر	:	برداشت، تحمل
عجز	:	عاجزی، انکساری
نالہ	:	فریاد، آہ وزاری
ستم	:	ظلم، زیادتی
محرومی	:	کسی چیز سے محروم ہونے کی حالت
آسرا	:	سہارا
التفات	:	توجہ، مہربانی
دستگیری	:	مدد، مددگاری

5.6: امتحانی سوالات

سوال ۱: نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

سوال ۲: حالؔی نے ''مناجاتِ بیوہ'' میں بیوہ عورت کے کن مسائل اور جذبات کی عکاسی کی ہے؟

سوال ۳: ''مناجاتِ بیوہ'' کے حوالے سے حالؔی کی اصلاحی اور مقصدی شاعری پر روشنی ڈالیے۔

سوال ۴: ''مناجاتِ بیوہ'' میں بیوہ کی فریاد اور معاشرتی صورتِ حال کا تجزیہ کیجیے۔

5.7: مشقی سوالات

سوال ۱: مناجات سے کیا مراد ہے؟

سوال۲: حالؔی نے بیوہ عورت کو نظم کا موضوع کیوں بنایا؟

سوال۳: ''مناجاتِ بیوہ'' میں اللہ تعالیٰ سے بیوہ کی وابستگی کس طرح ظاہر ہوتی ہے؟

سوال۴: نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کا اصلاحی پہلو واضح کیجیے۔

5.8: جوابات سرگرمی

۱۔(ب) الطاف حسین حالؔی

۲۔(ج) بیوہ عورتوں کے

۳۔(ب) مقصدیت اور اصلاح

۴۔(ج) نظم

۵۔(ج) اللہ تعالیٰ سے

5.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال۱: مناجات سے کیا مراد ہے؟

جواب: مناجات سے مراد اللہ تعالیٰ کے حضور دعا، التجا اور فریاد کرنا ہے۔ اس میں انسان اپنے دکھ، مشکلات اور حاجات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا اور اس سے مدد اور رحمت کا طلب گار ہوتا ہے۔

سوال۲: حالؔی نے بیوہ عورت کو نظم کا موضوع کیوں بنایا؟

جواب: حالؔی نے بیوہ عورت کو نظم کا موضوع اس لیے بنایا کہ اس دور میں بیوہ عورتیں شدید معاشرتی مشکلات، محرومیوں اور بے اعتنائی کا شکار تھیں۔ شاعر نے ان کے دکھ اور بے بسی کو نمایاں کر کے معاشرے میں ہمدردی، انسانیت اور اصلاح کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

سوال۳: ''مناجاتِ بیوہ'' میں اللہ تعالیٰ سے بیوہ کی وابستگی کس طرح ظاہر ہوتی ہے؟

جواب: شوہر کی وفات کے بعد بیوہ خود کو بے سہارا اور تنہا محسوس کرتی ہے، لیکن وہ مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے منہ نہیں موڑتی۔ وہ اپنے غم

اور مشکلات اللہ کے حضور پیش کرتی ہے اور اسی سے مدد، صبر اور سہارا طلب کرتی ہے۔ اس طرح اس کی مذہبی وابستگی اور اللہ پر اعتماد نمایاں ہوتا ہے۔

سوال۴: نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کا اصلاحی پہلو واضح کیجیے۔

جواب: نظم کا اصلاحی پہلو یہ ہے کہ حالؔی نے بیوہ عورت کے مسائل کو سامنے لاکر معاشرے کو اس کی ذمہ داری کا احساس دلایا ہے۔ شاعر نے یہ پیغام دیا ہے کہ بیوہ عورت کو حقارت، بے اعتنائی یا ظلم کا نشانہ بنانے کے بجائے اس کے ساتھ ہمدردی، محبت اور عزت کا سلوک کیا جانا چاہیے۔ اس طرح نظم انسانی ہمدردی اور معاشرتی اصلاح کا مؤثر پیغام پیش کرتی ہے۔

5.9: امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر6 نظم ''کرزن سبھا'' اکبرالہ آبادی

ساخت

6.0 اغراض ومقاصد

6.1 تعارف

6.2 نظم ''کرزن سبھا'' کامتن

6.2.1 نظم ''کرزن سبھا'' کی تشریح

6.2.2 نظم ''کرزن سبھا'' کی فنی خصوصیات

6.3 سرگرمی: آؤاپنی معلومات جانچیں

6.4 عمومی جائزہ

6.5 فرہنگ

6.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

6.7 مشقی سوالات

6.8 جوابات سرگرمی

6.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

6.9 امدای کتب

6.0 :اغراض ومقاصد

اکبرالہ آبادی کی نظم ''کرزن سبھا'' کی تدریس کا بنیادی مقصد طلبہ کو اکبرالہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری، ان کے عہد کے سیاسی وسماجی حالات اوران کے مخصوص طرزِ اظہار سے روشناس کرانا ہے۔اس نظم کے مطالعے سے طلبہ یہ سمجھ سکیں گے کہ اکبرالہ آبادی نے برطانوی عہدِ حکومت میں ہندوستانی معاشرے، انگریز حکمرانوں اوران سے مرعوب ہندوستانی طبقے کے رویوں کو کس طرح طنز کا موضوع بنایا۔طلبہ نظم میں موجود طنز، ظرافت، رمز و کنایہ اور سیاسی شعور کی مختلف جہتوں کو سمجھنے کے ساتھ یہ بھی جان سکیں گے کہ شاعر نے بظاہر ہلکے پھلکے اور مزاحیہ انداز میں اپنے عہد کی سنگین سیاسی اور سماجی حقیقتوں کو کس مہارت سے پیش کیا ہے۔اس سبق کا مقصد طلبہ میں ادبی ذوق، تنقیدی شعور اور شاعری کے پس منظر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا بھی ہے تاکہ وہ اکبر کی شاعری کو محض مزاحیہ کلام کے بجائے اپنے عہد کی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی ایک بامعنی ترجمانی کے طور پر دیکھ سکیں۔

6.1: تعارف

اردو شاعری میں طنز ومزاح کو فکری گہرائی، سیاسی بصیرت اور سماجی شعور سے ہم آہنگ کرنے والے شاعروں میں اکبرالہ آبادی کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔انہوں نے ایسے زمانے میں شاعری کی جب ہندوستان برطانوی اقتدار کے زیرِ نگیں تھا اور مغربی تہذیب، انگریزی تعلیم اور نوآبادیاتی نظام ہندوستانی معاشرت اور تہذیبی اقدار پر گہرے اثرات مرتب کر رہے تھے۔اکبرالہ آبادی نے ان تبدیلیوں کو نہایت باریک بینی سے محسوس کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے انگریزی حکومت، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، نئی تعلیم سے پیدا ہونے والی ذہنی غلامی اور ہندوستانی اشرافیہ کے بدلتے ہوئے رویوں پر بھرپور طنز کیا۔نظم ''کرزن سبھا'' بھی اکبرالہ آبادی کے اسی سیاسی اور طنزیہ شعور کی نمائندہ نظم ہے۔اس نظم کا تعلق برطانوی ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کے عہد اور اس دور کے سیاسی وسماجی ماحول سے ہے۔اکبر نے اپنے مخصوص طنزیہ پیرایہ اظہار کے ذریعے حکمران طبقے کی شان وشوکت، سرکاری تقریبات اوران ہندوستانیوں کے طرزِ عمل کو موضوع بنایا ہے جو انگریز حکمرانوں کی قربت اور خوشنودی کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔نظم کے ظاہری مزاح کے پس منظر میں غلام ہندوستان کی سیاسی بے بسی، طبقاتی تفاوت اور ذہنی مرعوبیت کا گہرا احساس موجود ہے۔

''کرزن سبھا'' کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں اکبرالہ آبادی نے براہِ راست وعظ یا سیاسی نعرے کے بجائے طنز اور مزاح کو احتجاج کا وسیلہ بنایا ہے۔ان کا طنز محض ہنسانے کے لیے نہیں بلکہ قاری کو اپنے عہد کی حقیقتوں پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔یہی خصوصیت اس نظم کو ادبی اعتبار سے دل چسپ اور تاریخی وسماجی اعتبار سے اہم بناتی ہے۔اس نظم کے مطالعے سے اکبرالہ آبادی کی فکری بصیرت، ان کی سیاسی

حساسیت اوران کے منفرد طنزیہ اسلوب کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

6.2: نظم ''مناجات بیوہ'' کا متن

سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے
گلوں میں غیرت گلشن کی آمد آمد ہے

رئیس و راجہ و نواب منتظر ہیں بہ شوق
کہ نائب شہہ لندن کی آمد آمد ہے

وہ ہو کے آتے ہیں قائم مقام قیصر ہند
ستاروں میں مہ روشن کی آمد آمد ہے

ہیں ان کے ساتھ میں اتنے اکابر یورپ
کہ گویا دہلی میں لندن کی آمد آمد ہے

غرض یہ ہے کہ تو تکمیل زینت و رونق
ہر ایک علم کی ہرفن کی آمد آمد ہے

کمربندی نظر آتی ہے آب و آتش کی
ادھر سے نل اُدھر انجن کی آمد آمد ہے

دکھا رہے ہیں ہنرمند خواب مغناطیس
دلوں میں حالت روشن کی آمد آمد ہے

اُمنڈ رہی ہے ہر اک سمت سے فراوانی
ہر ایک جنس کے خرمن کی آمد آمد

ورود فوج سے ہے زرق برق کا عالم
جدھر کو دیکھئے پلٹن کی آمد آمد ہے

چمک ہے کرچوں کی ہر سو گمک ہے توپوں کی
چما چم اور دنادن کی آمد آمد ہے

چہل پہل ہے اُمنگیں ہیں جوش مستی ہے
بہار عیش پہ جوبن کی آمد آمد ہے

جو پیر ہیں انہیں ہیں ولولے جوانی کے
جوان ہیں تو لڑکپن کی آمد آمد ہے

جو پیر ہیں انہیں میں دو سے جانی کے
جو پیر ہیں انہیں ہیں ولولے جوانی کے

تمام مذاہب و ملت میں ہے کشش پیدا
مغان و شیخ و برہمن کی آمد آمد ہے

گرہ میں زر نہیں اور ٹیم ٹام لازم و فرض
اسی سبب سے مہا جن کی آمد آمد ہے

اُبھارے رکھتا ہے اکبر کے دل کو فیضِ سخن
اگر چہ پیری و پنشن کی آمد آمد ہے

6.2.1: نظم ''کرزن سبھا'' کی تشریح

یہ نظم,, کرزن سبھا'' اکبرالہ آبادی کی معروف طنزیہ ومزاحیہ نظم ہے۔اس میں شاعر نے لارڈ کرزن کی ہندوستان آمد، برطانوی حکومت کی شان وشوکت، ہندوستانی رئیسوں کی خوشامد اور انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات پر نہایت لطیف طنز کیا ہے۔اکبرالہ آبادی نے بظاہر لارڈ کرزن کی آمد کا خیر مقدم کرنے والے ہندوستانی معاشرے کی تصویر پیش کی ہے لیکن حقیقت میں وہ غلامانہ ذہنیت، انگریزوں کی مرعوبیت، دکھاوے، مادہ پرستی اور انگریزی حکومت کی خوشامد کا مذاق اڑاتے ہیں۔نظم میں مبالغہ، تضاد، طنز اور مزاح کے ذریعے شاعر نے اس دور کی سماجی اور سیاسی صورتِ حال کو نمایاں کیا ہے۔

اشعار کی تشریح

۱۔ سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے
گلوں میں غیرتِ گلشن کی آمد آمد ہے

شاعر اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ مجلس میں لارڈ کرزن کی آمد ہونے والی ہے۔ ہر طرف ایسا جوش وخروش ہے جیسے باغ میں نئے پھول کھلنے والے ہوں۔,, غیرتِ گلشن'' سے مراد باغ کی رونق اور خوب صورتی ہے۔شاعر نے کرزن کی آمد کے سلسلے میں ہونے والی غیر معمولی تیاریوں کو طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔

۲۔ رئیس و راجہ و نواب منتظر ہیں بہ شوق
کہ نائب شہِ لندن کی آمد آمد ہے

ہندوستان کے رئیس، راجے اور نواب بڑی بے تابی سے کرزن کا انتظار کر رہے ہیں، کیونکہ وہ برطانوی بادشاہ کے نمائندے کی حیثیت سے آ رہا ہے۔شاعر یہاں ہندوستانی حکمران طبقے کی خوشامد اور غلامانہ ذہنیت پر طنز کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی ملک میں ایک غیر ملکی حکمران کے نمائندے کی آمد پر اس قدر خوش ہو رہے ہیں۔

۳۔ وہ ہو کے آتے ہیں قائم مقام قیصرِ ہند
ستاروں میں مہِ روشن کی آمد آمد ہے

لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے آرہا ہے۔شاعر طنزیہ انداز میں اس کی آمد کو ایسے بیان کرتا ہے جیسے آسمان پر چمکتا ہوا روشن چاند نمودار ہونے والا ہو۔ یہاں ,,مہِ روشن'' سے مراد روشن چاند ہے۔شاعر نے کرزن کی غیر معمولی اہمیت ظاہر کرنے کے انداز میں دراصل طنز پیدا کیا ہے۔

۴۔ ہیں ان کے ساتھ میں اتنے اکابرِ یورپ
کہ گویا دہلی میں لندن کی آمد آمد ہے

کرزن کے ساتھ یورپ کے بہت سے بڑے لوگ بھی آئے ہیں۔ان کی کثرت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے لندن ہی اٹھ کر دہلی آ گیا ہو۔یہ شعر مبالغے اور طنز کی عمدہ مثال ہے۔شاعر ہندوستان پر یورپی اثر اور انگریزوں کی برتری کے احساس کو نمایاں کرتا ہے۔

۵۔ غرض یہ ہے کہ تو تکمیلِ زینت و رونق
ہر ایک علم کی، ہر فن کی آمد آمد ہے

شاعر کہتا ہے کہ کرزن کی آمد سے گویا ہر قسم کی علمی، فنی اور تہذیبی رونق مکمل ہو جائے گی۔ بظاہر یہ تعریف ہے، لیکن اندر سے طنز ہے۔ شاعر انگریزوں کی آمد کے ساتھ جڑی ہوئی مصنوعی شان و شوکت کا مذاق اڑا رہا ہے۔

۶۔ کمر بندی نظر آتی ہے آب و آتش کی
ادھر سے نل، اُدھر انجن کی آمد آمد ہے

ہر طرف جدید سائنس اور صنعتی ترقی کی چیزیں دکھائی دے رہی ہیں۔ پانی، آگ، نل اور انجن وغیرہ جدید مغربی تہذیب کی علامتیں ہیں۔شاعر بتاتا ہے کہ انگریزی حکومت اپنے ساتھ جدید مشینیں اور صنعتی تہذیب بھی لا رہی ہے۔

۷۔ دکھا رہے ہیں ہنرمند خوابِ مغناطیس
دلوں میں حالتِ روشن کی آمد آمد ہے

ہنرمند اور سائنس دان اپنی نئی نئی ایجادات اور سائنسی کمالات دکھا رہے ہیں۔مقناطیس اور دوسری سائنسی چیزوں کے مظاہرے لوگوں

کو حیران کر رہے ہیں۔ شاعر اس زمانے میں سائنس اور مغربی ترقی کی طرف لوگوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۸۔ اُمنڈ رہی ہے ہر اک سمت سے فراوانی
ہر ایک جنس کے خرمن کی آمد آمد ہے

ہر طرف مختلف اشیا اور سامان کی بہتات دکھائی دے رہی ہے۔ مختلف قسم کی چیزیں بڑی مقدار میں جمع ہو رہی ہیں۔ شاعر یہاں نمائش اور نمود و نمائش کے ماحول کو طنزیہ انداز میں بیان کرتا ہے۔

۹۔ ورودِ فوج سے ہے زرق برق کا عالم
جدھر کو دیکھیے پلٹن کی آمد آمد ہے

فوج کی آمد سے ہر طرف چمک دمک پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں دیکھو فوجی دستے ہی نظر آتے ہیں۔ ,, زرق برق'' کا مطلب چمک دمک اور شان و شوکت ہے۔ شاعر فوجی طاقت کے مظاہرے کو بھی طنزیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔

۱۰۔ چمک ہے کرچوں کی، ہر سو گمک ہے توپوں کی
چما چم اور دنادن کی آمد آمد ہے

فوجیوں کی تلواریں اور ہتھیار چمک رہے ہیں اور توپوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ ہر طرف فوجی مظاہرہ اور شور و غوغا ہے۔ ,, دنادن'' توپوں کی گھن گرج اور گولہ باری کی آواز کی طرف اشارہ ہے۔

۱۱۔ چہل پہل ہے، اُمنگیں ہیں، جوشِ مستی ہے
بہارِ عیش پہ جوبن کی آمد آمد ہے

ہر طرف لوگوں میں خوشی، جوش، ولولہ اور چہل پہل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیش و عشرت کی بہار اپنے عروج کو پہنچنے والی ہے۔ شاعر اس غیر معمولی جشن اور خوشی کو طنزیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔

۱۲۔ جو پیر ہیں انہیں ہیں ولولے جوانی کے
جوان ہیں تو لڑکپن کی آمد آمد ہے

کرزن کی آمد کی خوشی نے بوڑھوں میں بھی جوانی کا جوش پیدا کر دیا ہے اور جوانوں میں بچپن جیسی شوخی آ گئی ہے۔ شاعر نے مبالغے کے

ذریعے لوگوں کے غیر معمولی جوش وخروش کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔

۱۳۔ تمام مذاہب و ملت میں ہے کشش پیدا
مغان و شیخ و برہمن کی آمد آمد ہے

کرزن کی آمد نے مختلف مذاہب اور طبقوں کے لوگوں کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ مغان سے مراد مجوسی، شیخ سے مسلمان عالم اور برہمن سے ہندو مذہبی پیشوا مراد ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر مذہب اور طبقے کے لوگ اس موقع پر شریک ہونے کے لیے کھنچے چلے آ رہے ہیں۔

۱۴۔ گرہ میں زر نہیں اور ٹم ٹام لازم و فرض
اسی سبب سے مہاجن کی آمد آمد ہے

لوگوں کی جیب میں پیسے نہیں، مگر شان وشوکت، لباس اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ دکھانا ضروری سمجھا جا رہا ہے۔ اس لیے قرض دینے والے مہاجن بھی پہنچ گئے ہیں۔ یہ شعر اکبر کے طنز کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ شاعر بتاتا ہے کہ دکھاوے کی خاطر لوگ قرض لینے تک پر مجبور ہیں۔

۱۵۔ اُبھارے رکھتا ہے اکبر کے دل کو فیضِ سخن
اگرچہ پیری و پنشن کی آمد آمد ہے

آخر میں اکبر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ ان کی عمر بڑھ رہی ہے اور ریٹائرمنٹ و پنشن کا زمانہ قریب آ رہا ہے، لیکن شاعری کا فیض اب بھی ان کے دل میں جوش پیدا کرتا ہے۔ یعنی عمر کے بڑھنے کے باوجود ان کی شاعرانہ صلاحیت اور طنزیہ فکر زندہ ہے۔

6.2.2: نظم ''کرزن سبھا'' کی فنی خصوصیات

اس نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت طنز و مزاح ہے۔ اکبر بظاہر کرزن کی آمد کی تعریف کرتے ہیں مگر حقیقت میں انگریزوں کی خوشامد کرنے والے ہندوستانی معاشرے پر طنز کرتے ہیں۔ رئیسوں، راجوں اور نوابوں کا کرزن کے استقبال کے لیے بے تاب ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ہندوستانی اشرافیہ انگریز حکمرانوں سے کس قدر مرعوب تھی۔ نل، انجن، مقناطیس، فوج، توپیں اور یورپی اکابر وغیرہ کے ذریعے اکبر نے ہندوستان میں بڑھتے ہوئے مغربی اثرات کی تصویر پیش کی ہے ''دہلی میں لندن کی آمد''، بوڑھوں میں جوانی اور ہر طرف فراوانی وغیرہ مبالغے کی خوب صورت مثالیں ہیں۔ اس نظم کی زبان سادہ، رواں، برجستہ اور مزاحیہ ہے۔ اکبر نے روزمرہ الفاظ، فارسی تراکیب اور محاوراتی انداز

کواس طرح استعمال کیا ہے کہ طنز زیادہ مؤثر ہو گیا ہے۔اس نظم میں اکبرؔ الہ آبادی نے کرزن کی آمد کو موضوع بنا کر پورے غلام ہندوستان کی ذہنی اور سماجی کیفیت پیش کی ہے۔ بظاہر ہر طرف خوشی، ترقی، سائنس، فوجی شان وشوکت اور تہذیب کا جشن ہے، لیکن شاعر کی نظر میں اس چمک دمک کے پیچھے غلامی، خوشامد، دکھاوا اور احساسِ کمتری موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم اکبر کے طنزیہ شعری فن کی ایک نمایاں مثال سمجھی جاتی ہے۔

6.3: سرگرمی! آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال1: اکبرالہ آبادی کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) سید اکبر حسین (ب) سید احمد حسین

(ج) محمد اکبر علی (د) اکبر حسین خاں

سوال2: اکبرالہ آبادی اردو ادب میں بنیادی طور پر کس حیثیت سے مشہور ہیں؟

(الف) مرثیہ گو شاعر (ب) طنز و مزاح کے شاعر

(ج) مثنوی نگار (د) داستان گو

سوال3: نظم ''کرزن سبھا'' میں بنیادی طور پر کس دور کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے؟

(الف) مغلیہ دور (ب) برطانوی عہد

(ج) سلطنتِ دہلی کا دور (د) آزادی کے بعد کا دور

سوال4: لارڈ کرزن ہندوستان میں کس عہدے پر فائز تھا؟

(الف) گورنر جنرل/ وائسرائے (ب) وزیرِ تعلیم

(ج) فوجی کمانڈر (د) چیف جسٹس

سوال5: ''کرزن سبھا'' میں اکبرالہ آبادی نے اظہار کے لیے کس اسلوب سے نمایاں طور پر کام لیا ہے؟

(الف) رزمیہ (ب) صوفیانہ

(ج) طنزیہ و مزاحیہ (د) رومانوی

6.4:عمومی جائزہ-

''کرزن سبھا'' اکبرالہ آبادی کی طنزیہ شاعری کی ایک اہم نظم ہے جس میں شاعر نے برطانوی عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کو اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اکبرالہ آبادی ایسے دور کے شاعر تھے جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم تھی اور ہندوستانی معاشرے کا ایک بااثر طبقہ مغربی تہذیب اور انگریز حکمرانوں سے شدید طور پر مرعوب ہو رہا تھا۔ شاعر نے اس ذہنی مرعوبیت اور غلامانہ طرزِ فکر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ نظم کے عنوان میں ''کرزن'' سے مراد لارڈ کرزن ہے جو برطانوی ہندوستان کا وائسرائے رہا۔ اکبرالہ آبادی نے کرزن اور اس سے وابستہ سرکاری ماحول کو بنیاد بنا کر اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی سیاسی بے بسی اور اشرافیہ کے رویوں پر طنز کیا ہے۔ شاعر کی توجہ صرف انگریز حکمرانوں تک محدود نہیں بلکہ وہ ان ہندوستانیوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو انگریزی حکومت کی خوشنودی، سرکاری اعزازات اور حکمران طبقے کی قربت کو کامیابی اور عزت کی علامت سمجھتے تھے۔

اس نظم میں بظاہر ظرافت اور شگفتگی پائی جاتی ہے، لیکن اس ظرافت کے پس منظر میں گہرا سیاسی اور قومی شعور موجود ہے۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ غلامی صرف سیاسی اقتدار چھن جانے کا نام نہیں بلکہ جب کوئی قوم اپنے حکمرانوں کی تہذیب، رسم و رواج اور اقدار سے اس قدر متاثر ہو جائے کہ اپنی شناخت اور خودداری کو فراموش کرنے لگے تو یہ ذہنی غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اکبرالہ آبادی نے ''کرزن سبھا'' میں طنز کو سماجی اور سیاسی تنقید کے ایک مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم محض اپنے زمانے کے کسی واقعے یا مجلس کی تصویر نہیں رہتی بلکہ نوآبادیاتی معاشرے کی ذہنی کیفیت کی ترجمان بن جاتی ہے۔ نظم سے اکبر کی حاضر جوابی، ظرافت، سیاسی بصیرت اور معاشرتی مشاہدے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

6.5:فرہنگ

کرزن سبھا	:	برطانوی ہندوستان کا وائسرائے لارڈ کرزن
مجلس	:	اجتماع
حضور	:	جناب، صاحب، سامنے
امیر	:	دولت مند، صاحبِ ثروت

رئیس	:	معزز اور صاحبِ حیثیت شخص
دربار	:	شاہی یا سرکاری مجلس
اہلِ وطن	:	وطن کے باشندے
حکومت	:	اقتدار، حکمرانی
رعایا	:	حکومت کے زیرِ اقتدار لوگ
تہذیب	:	تمدن، شائستگی
تمدن	:	معاشرتی طرزِ زندگی
مرعوب	:	رعب یا اثر قبول کرنے والا
تقلید	:	پیروی، نقل کرنا
اعزاز	:	عزت، انعام یا خطاب
خوشامد	:	چاپلوسی
فرماں برداری	:	اطاعت، حکم ماننا
اقتدار	:	حکومت، اختیار
خودداری	:	عزتِ نفس
غلامی	:	محکومی، تابع داری
ظرافت	:	خوش طبعی، لطیف مزاح

6.6: امتحانی سوالات

سوال 1: اکبر الہ آبادی کی نظم ''کرزن سبھا'' کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

سوال 2: ''کرزن سبھا'' میں اکبر الہ آبادی کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال3:نظم ''کرزن سبھا'' میں برطانوی عہد کے ہندوستانی معاشرے کی کس طرح عکاسی کی گئی ہے؟

سوال4:''کرزن سبھا'' کی روشنی میں اکبرالہ آبادی کے سیاسی اور سماجی شعور پر روشنی ڈالیے۔

6.7:مشقی سوالات

سوال1:لارڈ کرزن کون تھا اور نظم کے عنوان میں اس کا ذکر کیوں آیا ہے؟

سوال2:اکبرالہ آبادی نے ہندوستانیوں کی ذہنی مرعوبیت کو کس نظر سے دیکھا ہے؟

سوال3:''کرزن سبھا'' میں طنز کی اہمیت واضح کیجیے۔

سوال4:اکبرالہ آبادی کی شاعری میں قومی اور تہذیبی شعور کی اہمیت بیان کیجیے۔

6.8:جوبات سرگرمی

1۔(الف) سید اکبر حسین

2۔(ب) طنز و مزاح کے شاعر

3۔(ب) برطانوی عہد

4۔(الف) گورنر جنرل/ وائسرائے

5۔(ج) طنزیہ و مزاحیہ

6.8.1امتحانی سوالات کے جوابات

سوال1:''کرزن سبھا'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

جواب:اکبرالہ آبادی کی نظم ''کرزن سبھا'' کا مرکزی خیال برطانوی عہد میں ہندوستان کی سیاسی محکومی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی و تہذیبی مرعوبیت پر طنز کرنا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے لارڈ کرزن کے عہد اور اس سے وابستہ سرکاری فضا کے حوالے سے ہندوستانی معاشرے کے اس طبقے کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو انگریز حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان کی قربت کو باعثِ عزت سمجھتا تھا۔

شاعر کے نزدیک سیاسی غلامی کے ساتھ ذہنی غلامی بھی ایک بڑا مسئلہ تھی۔اسی لیے وہ طنز ومزاح کے ذریعے ہندوستانیوں میں خودداری، قومی شعوراور اپنی تہذیبی شناخت کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں۔نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ کسی قوم کو اپنی تہذیبی شناخت اور عزتِ نفس کو محض حکمران طبقے کی خوشنودی کے لیے قربان نہیں کرنا چاہیے۔

سوال2:نظم کا طنزیہ ومزاحیہ اسلوب۔۔۔۔

جواب:اکبرالہ آبادی اردو کے عظیم طنز ومزاح نگار شاعر ہیں اور ''کرزن سبھا'' میں بھی ان کا مخصوص طنزیہ اسلوب نمایاں ہے۔وہ کسی سیاسی یا سماجی خرابی پر براہِ راست طویل وعظ کرنے کے بجائے لطیف طنز،ظرافت،اشارے اور کنایے سے کام لیتے ہیں۔ان کے کلام میں بظاہر مزاح اور شگفتگی محسوس ہوتی ہے،لیکن اس کے پس منظر میں سنجیدہ فکر موجود ہوتی ہے۔

''کرزن سبھا'' میں بھی شاعر نے برطانوی حکمرانوں کی شان وشوکت اور ان سے مرعوب ہندوستانی طبقے کے رویے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ان کا طنز قاری کو پہلے متوجہ کرتا ہے اور پھر اسے اپنے معاشرے کی کمزوریوں پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔سادہ زبان،برجستگی،روزمرہ کی کیفیت،اشاریت اور گہرا سیاسی شعور اس نظم کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

سوال3:برطانوی عہد کے ہندوستانی معاشرے کی عکاسی۔۔۔۔

جواب:''کرزن سبھا'' میں برطانوی عہد کے ہندوستانی معاشرے کی ایک معنی خیز تصویر سامنے آتی ہے۔اس زمانے میں ہندوستان سیاسی طور پر انگریزوں کے زیرِ اقتدار تھا۔سیاسی محکومی کے ساتھ معاشرے کے بعض طبقات مغربی تہذیب اور انگریز حکمرانوں کے طرزِ زندگی سے بھی بہت زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔سرکاری عہدوں،اعزازات اور حکمرانوں کی قربت کو معاشرتی مرتبے کی علامت سمجھا جانے لگا تھا۔اکبرالہ آبادی نے اس صورتِ حال کو گہری نظر سے دیکھا۔وہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کا ایک طبقہ اپنی تہذیبی شناخت اور خودداری سے زیادہ حکمرانوں کی خوشنودی کو اہمیت دے رہا ہے۔''کرزن سبھا'' میں اسی معاشرتی رویے پر طنز کیا گیا ہے۔یوں یہ نظم اپنے عہد کے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی اشرافیہ کی نفسیات اور ذہنی مرعوبیت کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

سوال4:اکبرالہ آبادی کا سیاسی اور سماجی شعور

جواب:اکبرالہ آبادی اپنے عہد کے سیاسی،سماجی اور تہذیبی حالات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔انہوں نے برطانوی اقتدار کے ہندوستانی معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات کو نہایت باریک بینی سے محسوس کیا۔ان کی شاعری میں انگریزی حکومت،مغربی تہذیب کی اندھی

تقلید، نئی معاشرتی اقدار اور ہندوستانیوں کی ذہنی مرعوبیت پر مسلسل تنقید ملتی ہے۔

''کرزن سبھا'' ان کے اسی سیاسی اور سماجی شعور کی نمائندہ نظم ہے۔ شاعر صرف غیر ملکی حکمرانوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا بلکہ اپنے ہم وطنوں کے رویوں کا بھی جائزہ لیتا ہے۔ وہ ان لوگوں پر طنز کرتا ہے جو ذاتی مفادات، سرکاری اعزازات اور حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے اپنی قومی خودداری کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے اکبر کا طنز محض تفریح نہیں بلکہ اصلاحِ معاشرہ اور قومی بیداری کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

5.9: امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 7۔ نظم ''خضر راہ'' ڈاکٹر اقبالؔ

ساخت

7.0 اغراض ومقاصد

7.1 تعارف

7.2 نظم ''خضر راہ'' کا متن

7.2.1 نظم ''خضر راہ'' کی تشریح

7.2.2 نظم ''خضر راہ'' کی خصوصیات

7.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

7.4 عمومی جائزہ

7.5 فرہنگ

7.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

7.7 مشقی سوالات

7.8 جوابات سرگرمی

7.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

7.9 امدادی کتب

7.0:اغراض ومقاصد

علامہ محمد اقبالؔ کی نظم ''خضرِ راہ'' کی تدریس کا بنیادی مقصد آپ کو اقبالؔ کے سیاسی، سماجی، قومی اور فکری شعور سے روشناس کرانا ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے آپ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں عالمِ اسلام کو درپیش سیاسی و معاشرتی مسائل اور اقبالؔ کے نقطہ نظر کو سمجھ سکیں گے۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ اقبالؔ نے خضر کی علامتی شخصیت کے ذریعے زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور عالمِ اسلام جیسے اہم موضوعات پر اپنے خیالات کس انداز میں پیش کیے ہیں۔ اس سبق کا مقصد آپ کو اقبالؔ کے تصورِ حیات، خودی، عمل، جدوجہد، آزادی اور اجتماعی بیداری کے پیغام سے آگاہ کرنا بھی ہے۔ نظم کے مطالعے سے ان میں یہ شعور پیدا ہوگا کہ قوموں کی ترقی صرف مادی وسائل سے نہیں بلکہ بلند حوصلے، مسلسل جدوجہد، خود اعتمادی اور مقصد سے وابستگی کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نظم میں استعمال ہونے والی علامتوں، استعارات، تشبیہات اور اقبال کے خطیبانہ و فلسفیانہ اسلوب کو سمجھنے کی صلاحیت بھی حاصل کریں گے۔

7.1:تعارف

علامہ محمد اقبالؔ اردو اور فارسی کے عظیم شاعر، مفکر اور فلسفی تھے۔ ان کی شاعری فقط جذبات و احساسات کا اظہار نہیں بلکہ ایک وسیع فکری، تہذیبی اور سیاسی شعور کی ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے فرد کو خود شناسی، خود اعتمادی اور عمل کا درس دیا اور ملتِ اسلامیہ کو اتحاد، بیداری اور جدوجہد کی تلقین کی۔ اقبال کی شاعری میں مشرق و مغرب کی تہذیب، مسلمانوں کا عروج و زوال، استعمار، سرمایہ داری، انسانی آزادی اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل جیسے موضوعات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ''خضرِ راہ'' اقبالؔ کی مشہور طویل نظموں میں شمار ہوتی ہے اور ان کے شعری مجموعے ''بانگِ درا'' میں شامل ہے۔ یہ نظم اقبالؔ کے فکری اور سیاسی شعور کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ نظم کا آغاز ایک خاص فکری اور جذباتی فضا سے ہوتا ہے، جہاں شاعر دنیا اور بالخصوص ملتِ اسلامیہ کے حالات کے بارے میں فکرمند نظر آتا ہے۔ اسی کیفیت میں خضر کی علامتی شخصیت سامنے آتی ہے۔ اسلامی اور مشرقی روایت میں خضر کو دانائی، رہنمائی اور اسرارِ حیات سے آگاہی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اقبال اسی شخصیت کو اپنے سوالات کے جوابات پیش کرنے کا وسیلہ بناتے ہیں۔

نظم میں شاعر خضر سے زندگی اور انسانی معاشرے سے متعلق اہم سوالات کرتا ہے اور خضر کے جوابات کے ذریعے اقبالؔ کے افکار سامنے آتے ہیں۔ نظم کے اہم موضوعات میں زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور دنیائے اسلام شامل ہیں۔ اقبال ایک طرف سامراجی طاقتوں اور

سرمایہ دارانہ استحصال پر تنقید کرتے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو اپنی قوت پہچاننے، مایوسی ترک کرنے اور عمل و جدوجہد کی راہ اختیار کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ ''خضرِ راہ'' صرف ایک فلسفیانہ نظم نہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات کی ایک مؤثر ترجمانی بھی ہے۔ اس میں اقبالؔ نے علامتی، خطیبانہ اور ولولہ انگیز انداز اختیار کرتے ہوئے انسان اور بالخصوص ملتِ اسلامیہ کو بیداری، آزادی، خود اعتمادی اور مسلسل جدوجہد کا درس دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم اقبالؔ کی فکری اور ملی شاعری میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

7.2: نظم ''خضرِ راہ'' کا متن

شاعر

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
گوشہ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگام محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

کشتی مسکین و جان پاک و دیوار یتیم
علم موسیٰ بھی ہے ترے سامنے حیرت فروش

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقِ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

جوابِ خضر

صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ وساماں وہ سفر بے سنگ ومیل

وہ نمودا ختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

زندگی

برتر از اندیش سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمان امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے

سوئے گردوں نالہ شبگیر کا بھیجے صفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بے دار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دل بری

خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمیء گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ ومحنت

بندہ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمہ بیداری جمہور ہے سامان عیش
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوری جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

دنیائے اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

لے رہا ہے مے فروشان فرنگستاں سے پارس
وہ مے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر حاجتے پیش سلیمانے مبر

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود — مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں — آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس — سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیش نظر لایخلف المیعاد دار

7.2.1: نظم ''خضر راہ'' کی تشریح

یہ علامہ اقبالؔ کی شہرہ آفاق نظم ,,خضرِ راہ'' ہے، جو بالِ جبریل میں شامل ہے۔ نظم میں اقبالؔ نے اپنے عہد کے اہم سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ملی مسائل کو حضرت خضر کے ساتھ مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ذیل میں نظم کی تفصیلی تشریح عنوانات کے تحت دی جارہی ہے۔

نظم کا پس منظر: نظم کا آغاز ایک پُرسکون رات کے منظر سے ہوتا ہے۔ شاعر دریا کے کنارے بیٹھا کائنات اور زندگی کے مسائل پر غور کر رہا ہے۔ اس کے دل میں بے شمار سوالات اور اضطراب موجود ہیں۔ اسی دوران اسے حضرت خضر نظر آتے ہیں۔ حضرت خضر کو روایت میں دانائی، بصیرت اور اسرارِ حیات سے واقف شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ شاعر ان سے زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور عالمِ اسلام کے بارے میں سوالات کرتا ہے، اور خضر ان سوالات کے جواب دیتے ہیں۔

ابتدائی حصہ: شاعر اور خضر کی ملاقات

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشہ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شاعر بیان کرتا ہے کہ ایک رات وہ دریا کے کنارے بیٹھا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بظاہر وہ دریا کے پُرسکون منظر کو دیکھ رہا تھا، لیکن اس کے دل کے اندر بے شمار فکری، سیاسی اور روحانی سوالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ یہاں شاعر کی داخلی بے چینی دراصل اپنے عہد اور پوری انسانیت کے مسائل کی بے چینی ہے۔

شب سکوت افزا ہوا، آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

رات کے گہرے سکوت نے ہر طرف خاموشی پیدا کر دی تھی۔ دریا بھی نہایت سکون اور نرمی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ شاعر کی نگاہ حیران تھی کہ سامنے واقعی پانی بہہ رہا ہے یا کسی مصور کی بنائی ہوئی پانی کی تصویر ہے۔ اس سے فضا کی غیر معمولی خاموشی اور سکون کا اندازہ ہوتا ہے۔

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار

موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

دریا کی سطح اتنی پُرسکون تھی جیسے گہوارے میں شیر خوار بچہ سویا ہوا ہو، لیکن اس کی گہرائیوں میں موجیں موجود تھیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری سکون کے باوجود دریا کے اندر حرکت اور اضطراب موجود ہے۔ یہ دریا دراصل انسانی زندگی اور دنیا کی علامت بھی ہے، جس کے ظاہری سکون کے پیچھے بڑی تبدیلیاں اور انقلاب پوشیدہ ہوتے ہیں۔

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر

انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

رات کے سحر نے پرندوں کو اپنے گھونسلوں میں خاموش کر دیا تھا۔ مدھم ستارے بھی چاندنی کے طلسم میں گم معلوم ہوتے تھے۔ پوری کائنات خاموش اور ساکت نظر آتی ہے۔

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر

جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

اچانک شاعر حضرت خضر کو دیکھتا ہے، جو دنیا کے اسرار سے واقف اور کائنات کا سفر کرنے والی شخصیت ہیں۔ اگرچہ وہ عمر رسیدہ ہیں لیکن ان کی شخصیت میں صبح کی طرح تازگی اور جوانی موجود ہے۔ یہاں خضر ابدی دانش اور بصیرت کی علامت ہیں۔

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل

چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

حضرت خضر شاعر سے کہتے ہیں کہ اے کائنات اور زندگی کے راز تلاش کرنے والے! اگر انسان کی باطنی بصیرت کی آنکھ کھل جائے تو دنیا کی تقدیر اور زندگی کے راز اس پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یعنی حقیقی علم صرف ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔

دل میں یہ سن کر بپا ہنگام محشر ہوا

میں شہیدِ جستجو تھا، یوں سخن گستر ہوا

یہ بات سن کر شاعر کے دل میں سوالات کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ چونکہ وہ حقیقت کی تلاش میں ہمیشہ بے چین رہتا ہے، اس لیے اس نے حضرت خضر کے سامنے اپنے عہد کے بنیادی مسائل پیش کیے۔

شاعر کے سوالات

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار

جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

شاعر خضر سے کہتا ہے کہ آپ کی بصیرت ایسی ہے کہ آپ ان آنے والے انقلابات اور طوفانوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو ابھی دنیا کی سطح پر ظاہر نہیں ہوئے۔ گویا خضر مستقبل کے حالات اور تاریخ کی پوشیدہ تبدیلیوں سے واقف ہیں۔

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم

علمِ موسیٰ بھی ہے ترے سامنے حیرت فروش

شاعر خضر کی عظیم بصیرت کی تعریف کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے علم کے سامنے بھی خضر کا علم ایک الگ اور گہرا مقام رکھتا ہے۔ یہاں کشتی، بچے اور دیوار کے واقعات حضرت موسیٰ اور خضر کے قرآنی واقعے کی طرف اشارہ ہیں۔

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد

زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

شاعر حیرت سے پوچھتا ہے کہ آپ آبادیوں سے دور صحرا میں کیوں رہتے ہیں؟ آپ کی زندگی وقت کی پابندیوں سے آزاد کیوں معلوم ہوتی ہے؟ آپ کے لیے نہ ماضی اہم ہے، نہ حال اور نہ مستقبل۔ پھر شاعر زندگی، سلطنت، سرمایہ دار اور مزدور کے تعلقات، عالمِ اسلام کے حالات اور مشرق و مغرب کی سیاسی تبدیلیوں کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

صحرانوردی

خضر کہتے ہیں:

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے

یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

خضر کہتے ہیں کہ میری مسلسل سفر اور حرکت کی زندگی پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ مسلسل کوشش، جدوجہد اور حرکت ہی زندگی کی اصل علامت ہے۔ جو قوم اور فرد حرکت چھوڑ دیتا ہے، وہ جمود اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں

گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

جو شخص گھر کی آسائشوں کا قیدی ہو، وہ صحرا کی آزادی اور سفر کی لذت نہیں سمجھ سکتا۔ جب صحرا میں کوچ کا اعلان ہوتا ہے تو زندگی، حرکت اور آزادی کا ایک عظیم منظر سامنے آتا ہے۔

اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل

اقبال کے نزدیک ضرورت سے زیادہ آباد اور آسودہ زندگی انسان کو زمین، جائیداد اور مادی آسائشوں کا غلام بنا دیتی ہے۔ صحرا کی زندگی آزادی، حرکت اور جدوجہد کی علامت ہے۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی

ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زندگی مسلسل حرکت اور جدوجہد سے مضبوط ہوتی ہے۔ حرکت ہی زندگی کے دوام اور بقا کا راز ہے۔

زندگی

برتر از اندیشِ سود و زیاں ہے زندگی

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

زندگی نفع اور نقصان کے عام حساب سے بلند ہے۔ زندگی کبھی اپنی جان کی حفاظت کا نام ہے اور کبھی کسی عظیم مقصد کے لیے اپنی جان قربان کر دینے کا نام ہے۔

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

زندگی کو صرف آج اور کل کے پیمانے سے نہیں ناپنا چاہیے۔ زندگی مسلسل آگے بڑھنے والی، ہمیشہ تازہ اور متحرک حقیقت ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

سرِ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

انسان اگر واقعی زندہ ہے تو اسے اپنی دنیا خود پیدا کرنی چاہیے۔ زندگی میں ایسی تخلیقی قوت موجود ہے جو انسان کو حالات کا غلام بننے کے بجائے اپنے حالات خود پیدا کرنے کی صلاحیت دیتی ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب

اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

غلامی میں زندگی محدود، کمزور اور بے اثر ہو جاتی ہے، جیسے پانی کی ایک چھوٹی ندی۔ لیکن آزادی میں یہی زندگی سمندر کی طرح وسیع، طاقت ور اور بے کنار بن جاتی ہے۔

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو

پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

جب انسان کی شخصیت ناپختہ ہوتی ہے تو وہ محض مٹی کا ایک ڈھیر ہے، لیکن جب اس کا کردار، شعور اور خودی پختہ ہو جائے تو وہ بے مثال طاقت بن جاتا ہے۔

عمل اور خودی: اس حصے میں خضر انسان کو عملی زندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

جس انسان میں سچائی اور حق کے لیے قربانی دینے کا جذبہ ہو، اسے پہلے اپنے اندر حقیقی زندگی، قوتِ عمل اور بلند کردار پیدا کرنا

چاہیے۔

اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

انسان کو حالات کے سامنے شکست قبول نہیں کرنی چاہیے بلکہ تباہی اور مایوسی کے بعد بھی اپنے لیے ایک نئی دنیا پیدا کرنی چاہیے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے

پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اقبال انسان کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کن وقت ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی عمل اور کارنامہ ہے تو اسے پیش کرو۔ صرف خواب، خیالات اور دعووں سے زندگی نہیں بدلتی؛ عمل ضروری ہے۔

سلطنت: اس حصے میں اقبال نے اقتدار اور مغربی جمہوریت پر تنقید کی ہے۔

سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

طاقتور قوموں کی حکومت محض طاقت کے استعمال کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی سیاسی اور ذہنی حکمت عملی ہے جس کے ذریعے محکوم قوموں کو اپنے اثر میں رکھا جاتا ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جب غلام قوم بیدار ہونے لگتی ہے تو حکمران طبقہ مختلف سیاسی چالوں، نعروں اور نظاموں کے ذریعے اسے دوبارہ غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام

جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اقبال کے نزدیک مغربی جمہوریت بظاہر عوامی حکومت کا نام ہے، لیکن اس کے پیچھے اکثر طاقت ور طبقوں اور سرمایہ داروں کی حکمرانی موجود ہوتی ہے۔

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

یہاں اقبال کا مشہور اعتراض ہے کہ بعض اوقات آمریت اور استبداد جمہوریت کا لباس پہن لیتے ہیں اور لوگ اسے حقیقی آزادی سمجھ لیتے ہیں۔

سرمایہ اور محنت: یہ حصہ مزدور اور سرمایہ دار کے تعلق سے متعلق ہے۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر

خضر مزدور کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ چالاک سرمایہ دار نے تمہاری محنت اور صلاحیت سے فائدہ اٹھایا اور تمہیں محروم رکھا۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

محنت کش طبقہ دولت پیدا کرتا ہے، لیکن اسے اس کی محنت کے مطابق حصہ نہیں ملتا۔ اسے معمولی اجرت دی جاتی ہے، جیسے کوئی دولت مند غریب کو خیرات دے رہا ہو۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

سرمایہ دار اپنی چالاکیوں اور نظام کی طاقت سے کامیاب ہو جاتا ہے جبکہ مزدور اپنی سادگی اور کمزوری کی وجہ سے شکست کھا جاتا ہے۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال مزدور طبقے کو بیدار ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ اب محنت کش طبقے کو اپنی قوت پہچاننی چاہیے۔ انقلاب اور بیداری

نغمہ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش

قصہ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

اب پرانے بادشاہوں اور حکمرانوں کی داستانوں میں کھوئے رہنے کا وقت گزر چکا ہے۔ عوام کی بیداری اور شعور ہی اصل خوشی اور مستقبل کی بنیاد ہے۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

دنیا میں ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے، لہٰذا ماضی کے ختم ہو جانے والے نظاموں پر ہمیشہ ماتم نہیں کرنا چاہیے۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو

اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

انسان کو دوسروں کی اندھی تقلید چھوڑ کر اپنی صلاحیت، اپنی فطرت اور اپنی تخلیقی قوت پر اعتماد کرنا چاہیے۔

دنیائے اسلام: اس حصے میں خضر عالمِ اسلام کی سیاسی اور تہذیبی زبوں حالی پر گفتگو کرتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اقبال افسوس کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی سرزمین اور اسلامی تہذیب کی عظیم میراث پر دوسروں نے غلبہ حاصل کر لیا۔

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی

ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

مغربی سیاسی حکمت عملی اور استعمار نے اسلامی دنیا کو مختلف قوموں اور ریاستوں میں تقسیم کر کے کمزور کر دیا۔

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست: اقبال کے نزدیک کسی طاقت ور قوم کی غلامی اور اس سے مدد مانگنے کے بجائے شکست بھی بہتر ہے۔ قوم کو اپنی عزت، خودداری اور آزادی برقرار رکھنی چاہیے۔

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات: مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کی نجات ان کے اتحاد اور اجتماعی نظم میں ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

یہ شعر مسلمانوں کے وسیع تر اتحاد کے تصور کو ظاہر کرتا ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان جغرافیائی، نسلی اور علاقائی تقسیم سے بلند ہو کر اپنے مشترکہ مقصد کے لیے متحد ہوں۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں مٹ جائے گا

جو شخص نسل، رنگ اور خون کی بنیاد پر دوسروں سے برتری قائم کرنے کی کوشش کرے گا، وہ بالآخر تاریخ میں مٹ جائے گا۔ اقبال کے نزدیک اسلام کی بنیاد نسل پر نہیں بلکہ مشترکہ عقیدے اور انسانی اخوت پر ہے۔

آخری حصہ: مستقبل کی امید نظم کے آخری اشعار میں اقبال مسلمانوں کو مستقبل کی طرف دیکھنے اور امید قائم رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے

اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اسلام نے انسانی آزادی اور مساوات کا جو تصور پیش کیا تھا، دنیا میں مختلف سیاسی اور سماجی تحریکوں کے ذریعے اس کے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود

مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ

دنیا کی زندگی مسلسل تبدیلی کا نام ہے۔ ایک نظام ختم ہوتا ہے تو دوسرے نظام کے لیے راستہ پیدا ہوتا ہے۔ موت اور زوال کے اندر بھی نئی زندگی کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اقبالؔ کہتے ہیں کہ میری باتوں میں مستقبل کے آنے والے زمانے کی ایک جھلک موجود ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا میں آنے والی تبدیلیوں کے آثار نمایاں ہیں۔

مسلم استی، سینہ را از آرزو آباد دار

ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

خضر مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو تو اپنے دل کو بلند امیدوں سے آباد رکھو اور ہمیشہ اللہ کے اس وعدے کو سامنے رکھو کہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

7.2.2:نظم ''خضرراہ'' کی خصوصیات

نظم میں اقبالؔ نے زندگی کا راز مسلسل جدوجہداور حرکت کوقرار دیا ہے۔ فردکواپنی شخصیت اورخودی کومضبوط بنانے کی تلقین کی گئی ہے، جبکہ قوموں کواتحاد، آزادی اورعملی جدوجہد کا پیغام دیا گیا ہے۔سرمایہ دارانہ استحصال، سامراج، غلامی اورظاہری جمہوریت کی کمزوریوں پرتنقید کرتے ہوئے اقبال ایک ایسے مستقبل کی امید دلاتے ہیں جس میں انسان اپنی تخلیقی اور روحانی قوت کو پہچانے۔,,خضرِ راہ'' فنی اعتبار سے بھی اقبالؔ کی نہایت اہم نظموں میں شمار ہوتی ہے۔اس نظم میں مکالمے کی تکنیک اختیار کی گئی ہے،جس سے نظم میں ڈرامائیت اوردلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ حضرت خضرکوحکمت اوربصیرت کی علامت کےطور پراستعمال کیا گیا ہے۔

نظم میں علامت نگاری نہایت مؤثر ہے۔ دریا دنیا اور زندگی کی علامت ہے،موج انقلاب اور پوشیدہ حرکت کی علامت ہے،صحرا آزادی اورمسلسل جدوجہد کی علامت ہے، جبکہ شمع،ستارے،آفتاب اورسمندرمختلف سیاسی، روحانی اورانقلابی تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اقبالؔ کی زبان شاعرانہ،فلسفیانہ،خطیبانہ اورانقلابی ہے۔نظم میں قرآن،اسلامی تاریخ،حضرت موسیٰؑ،حضرت ابراہیمؑ،حضرت خلیلؑ،محمودوایاز اور دیگرتاریخی ومذہبی حوالوں سے معنی کی گہرائی پیدا ہوئی ہے۔خضرِ راہ'' کا مرکزی خیال انسان اور بالخصوص ملتِ اسلامیہ کوجمود، غلامی، مایوسی اور بےعملی سے نکال کرحرکت،آزادی،خودی،عمل اور بیداری کی طرف راغب کرنا ہے۔

,,خضرِ راہ'' صرف ایک نظم نہیں بلکہ زندگی، سیاست،معیشت،قومیت،آزادی،مزدور،سرمایہ داراورعالمِ اسلام کے مسائل پراقبال کا ایک فکری منشور ہے۔نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے،غلامی موت ہے،آزادی قوت ہے،عمل کامیابی کا راستہ ہےاورملتوں کی بقا اتحاد،خودی اورمسلسل جدوجہد میں پوشیدہ ہے۔

7.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں۔

سوال1: **نظم ''خضرِ راہ'' کے شاعر کون ہیں؟**

(الف) اکبر الہ آبادی (ب) علامہ محمد اقبال

(ج) فیض احمد فیض (د) جوش ملیح آبادی

سوال2: **نظم ''خضرِ راہ'' اقبال کے کس شعری مجموعے میں شامل ہے؟**

(الف) بانگِ درا (ب) بالِ جبریل

(ج) ضربِ کلیم (د) ارمغانِ حجاز

سوال3: **نظم میں شاعر کی رہنمائی کرنے والی علامتی شخصیت کون ہے؟**

(الف) ساقی (ب) مردِ مومن

(ج) خضر (د) درویش

سوال4: **''خضرِ راہ'' میں اقبال نے بنیادی طور پر کن مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے؟**

(الف) صرف حسن و عشق (ب) ملت، سیاست، سرمایہ و محنت اور عالمِ اسلام

(ج) صرف فطرت (د) صرف تصوف

سوال5: **نظم ''خضرِ راہ'' میں ''خضر'' کس چیز کی علامت ہیں؟**

(الف) دولت (ب) حسن

(ج) رہنمائی اور بصیرت (د) بادشاہت

7.4: عمومی جائزہ

''خضرِ راہ'' علامہ محمد اقبال کی ایک اہم فکری، سیاسی اور ملی نظم ہے جو ان کے شعری مجموعے ''بانگِ درا'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں

اقبالؔ نے خضر کی روایتی شخصیت کو ایک علامتی رہنما کے طور پر پیش کیا ہے۔ شاعر ایک ایسے دور میں اپنے گردوپیش کے حالات سے پریشان اور فکرمند ہے جب دنیا سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیوں سے گزر رہی تھی اور مسلمان زوال اور محکومی کا شکار تھے۔ ایسے حالات میں خضر شاعر کے سامنے رہنما کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں اور زندگی کے اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نظم میں اقبالؔ زندگی، حکومت، سرمایہ ومحنت اور عالمِ اسلام جیسے اہم موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی مسلسل حرکت، جدوجہد، عمل اور جستجو کا نام ہے۔ جو قومیں حرکت وعمل ترک کر دیتی ہیں وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح اقبال ایسی سیاست اور حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جس کا مقصد عوام کی خدمت کے بجائے اقتدار اور مفادات کا تحفظ ہو۔

اقبالؔ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں۔ وہ محنت کش طبقے کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہوئے اس معاشی نظام پر تنقید کرتے ہیں جس میں مزدور محنت کرتا ہے مگر اس کی محنت کے ثمرات سے زیادہ فائدہ سرمایہ دار اٹھاتا ہے۔ شاعر محنت، خودداری اور معاشی انصاف کا حامی نظر آتا ہے۔ نظم کا ایک نہایت اہم پہلو عالمِ اسلام کی حالت ہے۔ اقبال مسلمانوں کی سیاسی کمزوری، انتشار اور غلامی پر افسوس کرتے ہیں، لیکن انہیں مایوسی کا درس نہیں دیتے۔ وہ مسلمانوں کو اتحاد، خودی، عمل، جرأت اور بیداری کی تلقین کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ''خضرِ راہ'' مسلمانوں کے لیے بیداری، جدوجہد اور امید کا پیغام ہے۔ اقبال کا یقین ہے کہ قومیں عزم، عمل، اتحاد اور خوداعتمادی کے ذریعے اپنے حالات بدل سکتی ہیں۔

7.5: فرہنگ

خضر	روایتی طور پر رہنمائی سے منسوب بزرگ شخصیت
راہ	راستہ
دشت	بیابان، صحرا
صحرا	بیابان
محمل	اونٹ پر رکھا جانے والا کجاوہ
کارواں	قافلہ

جستجو	تلاش
اضطراب	بے چینی
فطرت	قدرت، سرشت
محکومی	غلامی، تابع داری
فرماں روائی	حکومت، حکمرانی
سرمایہ	دولت، مال
محنت	کوشش، مشقت
مزدور	محنت کرنے والا شخص
ملت	قوم، بالخصوص امتِ مسلمہ
تدبیر	حکمتِ عملی، سوچا سمجھا طریقہ
حریت	آزادی
بیداری	آگہی، ہوشیاری
انقلاب	بڑی اور بنیادی تبدیلی

7.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: نظم ''خضرِ راہ'' کے عنوان کی معنویت واضح کیجیے۔

سوال2: اقبال کے نزدیک ایک زندہ قوم کے لیے حرکت اور عمل کیوں ضروری ہیں؟

سوال3: نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو کن باتوں کی تلقین کی ہے؟

سوال4: ''خضرِ راہ'' کو اقبال کی فکری اور ملی شاعری کی اہم نظم کیوں قرار دیا جاتا ہے؟

7.7: مشقی سوالات

سوال1: نظم ''خضرِ راہ'' کا مرکزی خیال تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال2: نظم ''خضرِ راہ'' میں علامہ اقبال نے زندگی اور جدوجہد کے متعلق کیا تصور پیش کیا ہے؟

سوال3: ''خضرِ راہ'' میں سرمایہ اور محنت کے مسئلے کو اقبال نے کس انداز میں پیش کیا ہے؟

سوال4: نظم ''خضرِ راہ'' میں عالمِ اسلام کے متعلق اقبال کے خیالات کی وضاحت کیجیے۔

سوال5: نظم ''خضرِ راہ'' میں خضر کی علامتی حیثیت اور اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

7.8: جوابات سرگرمی

1۔(ب) علامہ محمد اقبالؔ

2۔(الف) بانگِ درا

3۔(ج) خضر

4۔(ب) ملت، سیاست، سرمایہ و محنت اور عالمِ اسلام

5۔(ج) رہنمائی اور بصیرت

7.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: نظم ''خضرِ راہ'' کا مرکزی خیال تفصیل سے بیان کیجیے۔

جواب: ''خضرِ راہ'' کا مرکزی خیال انسان اور بالخصوص ملتِ اسلامیہ کو زندگی کی حقیقت، عمل و جدوجہد، سیاسی بیداری، معاشی انصاف اور قومی خودداری سے آگاہ کرنا ہے۔ اقبال نے خضر کی علامتی شخصیت کے ذریعے اپنے عہد کے اہم سیاسی، معاشی اور ملی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی سکون اور جمود کا نام نہیں بلکہ مسلسل حرکت، جستجو اور عمل کا نام ہے۔ وہ مسلمانوں کو مایوسی اور بے عملی سے نکال کر خود اعتمادی، اتحاد اور جدوجہد کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ نظم کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ قوموں کی ترقی کا راز بیداری، عمل، حریت اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے عزم میں پوشیدہ ہے۔

سوال2: نظم ''خضرِ راہ'' میں علامہ اقبال نے زندگی اور جدوجہد کے متعلق کیا تصور پیش کیا ہے؟

جواب: علامہ اقبالؔ کے نزدیک زندگی مسلسل حرکت اور جدوجہد کا نام ہے۔ انسان کو مشکلات سے خوف زدہ ہو کر گوشہ عافیت اختیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ زندگی کے میدان میں سرگرم رہنا چاہیے۔ اقبال جمود اور بے عملی کو زوال کا سبب سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندہ انسان اور زندہ قوم ہمیشہ نئی منزلوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ''خضرِ راہ'' میں بھی یہی پیغام دیا گیا ہے کہ زندگی کا حقیقی حسن جدوجہد، جستجو اور مسلسل آگے بڑھنے میں ہے۔ قومیں اسی وقت ترقی کرتی ہیں جب ان کے افراد اپنے اندر عزم، خود اعتمادی اور عمل کی قوت پیدا کرتے ہیں۔

سوال3: ''خضرِ راہ'' میں سرمایہ اور محنت کے مسئلے کو اقبال نے کس انداز میں پیش کیا ہے؟

جواب: ''خضرِ راہ'' میں اقبالؔ نے سرمایہ اور محنت کے باہمی تعلق کو اہم معاشی مسئلے کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ ایسے سرمایہ دارانہ نظام کے ناقد ہیں جس میں محنت کش طبقہ اپنی جسمانی اور ذہنی قوت صرف کرتا ہے لیکن اس کی محنت کا پورا فائدہ اسے حاصل نہیں ہوتا۔ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے معاشرے میں معاشی عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔ اقبال مزدور کو اپنی قوت اور اہمیت کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک عادلانہ معاشی نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں محنت کا احترام ہو، استحصال ختم ہو اور انسان کو اس کی محنت کا مناسب صلہ ملے۔

سوال4: نظم ''خضرِ راہ'' میں عالمِ اسلام کے متعلق اقبال کے خیالات کی وضاحت کیجیے۔

جواب: نظم میں اقبالؔ نے عالمِ اسلام کی سیاسی اور سماجی حالت پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ان کے عہد میں مسلم دنیا مختلف سیاسی مسائل، بیرونی غلبے اور داخلی انتشار کا شکار تھی۔ اقبال مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھ کر افسردہ ضرور ہوتے ہیں لیکن مایوسی کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ مسلمانوں کو اپنی قوت پہچاننے، باہمی اختلافات ختم کرنے، اتحاد پیدا کرنے اور خودداری کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عالمِ اسلام کی نجات صرف اسی صورت ممکن ہے جب مسلمان بیدار ہوں، اپنی فکری اور روحانی قوت کو پہچانیں اور عملی جدوجہد کے ذریعے اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کریں۔

سوال5: نظم ''خضرِ راہ'' میں خضر کی علامتی حیثیت اور اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

جواب: ''خضرِ راہ'' میں خضر محض ایک روایتی یا داستانی شخصیت نہیں بلکہ رہنمائی، دانائی، بصیرت اور حقیقت شناسی کی علامت ہیں۔ شاعر اپنے عہد

کے پیچیدہ حالات میں مختلف سوالات کے جوابات تلاش کرتا ہے اور خضر اسے زندگی، سیاست، معاشیات اور عالمِ اسلام کے مسائل کے بارے میں فکری رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ خضر کی شخصیت کے ذریعے اقبال نے اپنے افکار کو زیادہ مؤثر اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس اعتبار سے خضر ایک ایسے رہنما کی علامت بن جاتے ہیں جو تاریک اور مشکل حالات میں انسان اور قوم کو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔

7.9 :امدای کتب

1 ۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 8 نظم ''کسان'' جوشؔ ملیح آبادی

ساخت

8.0 اغراض ومقاصد

8.1 تعارف

8.2 نظم ''کسان'' کا متن

8.2.1 نظم ''کسان'' کی تشریح

8.2.2 نظم ''کسان'' کی فنی خصوصیات

8.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

8.4 عمومی جائزہ

8.5 فرہنگ

8.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

8.7 مشقی سوالات

8.8 جوابات سرگرمی

8.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

8.9 امدای کتب

8.0 :اغراض ومقاصد

جوشؔ ملیح آبادی اردو شاعری کے ان ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زندگی، انسان، محنت، انقلاب اور سماجی انصاف کے مختلف پہلوؤں کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ ان کی نظم ''کسان'' کی تدریس کا بنیادی مقصد آپ کو کسان کی عظمت، اس کی محنت و مشقت اور انسانی معاشرے میں اس کے بنیادی کردار سے آگاہ کرنا ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ کسان صرف کھیتی باڑی کرنے والا ایک فرد نہیں بلکہ انسانی زندگی اور معاشرتی نظام کا ایک اہم ستون ہے۔ وہ اپنی شب و روز کی محنت سے زمین کو زرخیز بناتا، بیج بوتا، فصلیں اگاتا اور دنیا کے لیے خوراک کا سامان مہیا کرتا ہے۔

اس سبق کے ذریعے آپ کو کسان کی عملی زندگی، اس کی جدوجہد، مشکلات اور محرومیوں سے بھی واقف کرانا مقصود ہے۔ کسان موسم کی سختیوں، دھوپ، گرمی، سردی اور دیگر دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مسلسل محنت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اکثر معاشی آسودگی اور بنیادی سہولتوں سے محروم رہتا ہے۔ نظم کے مطالعے سے آپ میں محنت کش طبقے کے مسائل کو سمجھنے، ان کی محنت کا احترام کرنے اور معاشرتی ناہمواریوں کے بارے میں غور و فکر کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس نظم کی تدریس کا ایک اہم مقصد آپ کو جوشؔ ملیح آبادی کے انقلابی مزاج، بلند آہنگ لہجے، قوتِ بیان، زبان و اسلوب اور شعری خصوصیات سے روشناس کرانا بھی ہے۔ طلبہ نظم میں استعمال ہونے والی تشبیہات، استعارات، علامتوں اور دیگر شعری وسائل کو سمجھ سکیں گے اور یہ جان سکیں گے کہ شاعر نے کس طرح کسان کی شخصیت کو قوت، محنت، تخلیق اور عظمت کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ یوں اس سبق کے مطالعے سے آپ کی ادبی صلاحیتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ آپ کے اندر محنت کی قدر، کسان کے احترام، انسانی مساوات، سماجی انصاف اور محنت کش طبقے سے ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

8.1: تعارف

جوشؔ ملیح آبادی اردو ادب کے ایک عظیم شاعر، بلند پایہ نظم نگار اور انقلابی فکر کے نمائندہ ادیب تھے۔ ان کی شاعری میں جوش و ولولہ، حریت پسندی، انقلاب، انسانی عظمت، محنت کی اہمیت اور سماجی ناانصافی کے خلاف احتجاج نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کا شعری لہجہ بلند آہنگ، پُرجوش اور اثر انگیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو ادب میں ''شاعرِ انقلاب'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جوش نے اپنی شاعری کو محض حسن و عشق کے اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے زندگی کے حقیقی مسائل اور انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ خصوصاً معاشرے کے

محنت کش اور محروم طبقات کے بارے میں ان کے یہاں گہرا احساس پایا جاتا ہے۔

نظم ''کسان'' جوشؔ ملیح آبادی کی اسی فکر اور سماجی شعور کی نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے کسان کی محنت، قوت، عظمت اور معاشرے میں اس کے بنیادی کردار کو نہایت پُر جوش اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ کسان اپنی محنت سے بنجر زمین کو زرخیز بناتا ہے، زمین کے سینے میں بیج ڈالتا ہے، فصلوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور بالآخر اپنی محنت کے نتیجے میں اناج پیدا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے کسان صرف اپنی ذات یا اپنے خاندان کے لیے کام نہیں کرتا بلکہ اس کی محنت سے پورا معاشرہ مستفید ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت یعنی خوراک کی فراہمی میں کسان کا کردار سب سے زیادہ اہم ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اس نظم میں کسان کی جسمانی محنت کے ساتھ ساتھ اس کی قوتِ ارادی، عزم اور حوصلے کو بھی نمایاں کیا ہے۔ کسان فطرت کی سختیوں سے گھبراتا نہیں بلکہ گرمی، سردی، دھوپ، بارش اور دیگر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ اس کا پسینہ زمین کی زرخیزی اور معاشرے کی خوش حالی کا وسیلہ بنتا ہے۔ شاعر کی نگاہ میں کسان ایک عام مزدور نہیں بلکہ محنت، تخلیق، عزم، قوت اور زندگی کی علامت ہے۔

نظم کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر کسان کی عظمت بیان کرتے ہوئے معاشرتی اور معاشی ناہمواری کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ جو شخص دوسروں کے لیے اناج پیدا کرتا اور معاشرے کی خوش حالی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، وہ خود اکثر غربت، محرومی اور مشکلات میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس طرح شاعر کسان کی عظمت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حالات کے بارے میں ایک گہرا سماجی شعور بھی پیدا کرتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی نظم ''کسان'' جوش ملیح آبادی کے مخصوص شعری مزاج کی عمدہ نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں بلند آہنگی، الفاظ کی توانائی، جذبات کی شدت، منظر نگاری اور انقلابی جوش نمایاں ہے۔ شاعر نے کسان کو محض ایک فرد کے بجائے محنت کش انسان کی اجتماعی قوت کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم طلبہ کو نہ صرف کسان کی اہمیت اور عظمت سے آگاہ کرتی ہے بلکہ ان میں محنت کے احترام، سماجی مساوات، انسانی ہمدردی اور معاشرتی ذمہ داری کا احساس بھی بیدار کرتی ہے۔

8.2: نظم ''کسان'' کا متن

جھٹپٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب
کھیتیاں میدان خاموشی غروب آفتاب

دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ

زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود

وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزہ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا

خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان
بام گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان

دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل زمیں پر تتلیاں سر پر طیور

پارہ پارہ ابر سرخی سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشت کار
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار
کرتی ہے دریوزہ تابش کلاہ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرور شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

کون ہل ظلمت شکن قندیل بزم آب و گل
قصر گلشن کا دریچہ سینہ گیتی کا دل

خوش نما شہروں کا بانی راز فطرت کا سراغ
خاندان تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شام زیر ارض کو صبح درخشاں کا پیام

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا

جس کے چھو جاتے ہی مثل نازنین مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلال عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی

طفل باراں تاجدار خاک امیر بوستاں
ماہر آئین قدرت ناظم بزم جہاں

ناظر گل پاسبان رنگ و بو گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

وارث اسرار فطرت فاتح امید و بیم
محرم آثار باراں واقف طبع نسیم

صبح کا فرزند خورشید زر افشاں کا علم
محنت پیہم کا پیماں سخت کوشی کی قسم

جلوہ قدرت کا شاہد حسن فطرت کا گواہ
ماہ کا دل مہر عالم تاب کا نور نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاج صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب

قلب آہن جس کے نقش پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق

خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہ آفتاب

لہر کھاتا ہے رگ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیل رنگ و بو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبض خاک پر

جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبض تاک
جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک

ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ

خون جس کا دوڑتا ہے نبض استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں

جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
اپنی دولت کو جگر پر تیر غم کھاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکی حرماں سے راہ
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
دیکھ کر تیرے ستم اے حامء امن و اماں
ادعائے پیروی دین و ایماں اور تو
ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں

اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے
جن کے آگے خنجر چنگیز کی مڑتی ہے دھار
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو
کتنے طوفان تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

8.2.1: نظم ''کسان'' کی تشریح

جوش ملیح آبادی کی نظم " کسان" ایک بلند آہنگ، انقلابی اور حقیقت پسندانہ نظم ہے جس میں شاعر نے کسان کی عظمت، اس کی محنت، فطرت سے اس کے گہرے تعلق اور سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں اس کے استحصال کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کا آغاز شام کے ایک دل کش منظر سے ہوتا ہے، پھر کسان کی جسمانی محنت اور تہذیب کی تعمیر میں اس کے کردار کو بیان کیا جاتا ہے، اور آخر میں اس کے معاشی استحصال اور سرمایہ داری کے خلاف شدید احتجاج سامنے آتا ہے۔ ابتدائی منظر نگاری

جھٹپٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب

کھیتیاں میدان خاموشی غروب آفتاب

ان شعر میں شاعر شام کے وقت کا نہایت حسین منظر پیش کرتا ہے۔سورج غروب ہو رہا ہے، آسمان پر شفق کی سرخی پھیلی ہوئی ہے اور دریا خاموشی سے بہہ رہا ہے۔کھیت، میدان اور فضا ایک گہری خاموشی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔شاعر نے فطرت کی مختلف تصویروں کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ شام کا منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتا ہے۔

دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ

دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ

دن بھر کی گرمی اور مشقت کے بعد صحرا اور زمین گویا سکون کا سانس لے رہے ہیں۔دور دریا کے کنارے جلتے ہوئے چراغ دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔اس منظر میں دن کی تھکن اور شام کے سکون کا حسین امتزاج موجود ہے۔شام کی خاموشی اور فطرت کا حسن

زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود

مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود

شاعر کے تخیل میں زمین اور آسمان آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہیں۔سورج کے غروب ہونے کے بعد آسمان پر ہلکی سی دھندیا دھواں سا پھیل گیا ہے۔یہاں شاعر نے فطرت کو انسانی صفات عطا کر کے منظر کو زیادہ جاندار بنا دیا ہے۔

وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ

سبزہ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

دن کے وقت جو میدان وسیع اور روشن دکھائی دیتے تھے، سورج کے غروب ہوتے ہی ان کی وسعت سمٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔سبزے پر شام کا ہلکا سا رنگ پھیل گیا ہے اور فضا خواب ناک ہو گئی ہے۔

خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا

شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا

ہر طرف خاموشی ہے لیکن اس خاموشی کے اندر بھی ہوا کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔شام کی ٹھنڈک نے گویا دن کی شدید گرمی کا گلا

گھونٹ دیا ہے۔شاعر نے یہاں دن اور شام کو جاندار بنا کر ایک خوب صورت پیکر تراشی کی ہے۔اندھیرے کا پھیلاؤ

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا

اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے اور کھیتوں کے درمیان موجود فاصلے کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہے۔شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ چیزیں دھندلی ہوتی جارہی ہیں۔

خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان
بام گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان

خشک گھاس اور جھاڑیوں پر شام کا منظر کسی دردناک کہانی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔آسمان کی فضا ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی محبوب روٹھ کر چلا گیا ہو۔شاعر نے شام کی اداسی کو انسانی جذبات سے وابستہ کر دیا ہے۔فطرت میں سکون اور زندگی

دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل زمیں پر تتلیاں سر پر طیور

زمین پر گھاس کی خوشبو، شبنم کی نمی اور فضا میں ایک خوش گوار کیفیت موجود ہے۔آسمان پر بادل ہیں، زمین پر تتلیاں ہیں اور سر کے اوپر پرندے اڑ رہے ہیں۔یہ فطرت کی رنگارنگی اور زندگی کی خوب صورتی کا منظر ہے۔

پارہ پارہ ابر سرخی سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں کھویا ہوا سا آسماں

بادل ٹکڑوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور شفق کی سرخی میں دھوئیں کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔زمین اور آسمان دونوں پر ایک خواب ناک اور پراسرار کیفیت طاری ہے۔

پتیاں مخمور کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

پتیاں اور کلیاں گویا نشے میں جھوم رہی ہیں اور آنکھیں جھپکا رہی ہیں۔نازک پودوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نیند آ رہی ہو۔شاعر نے

فطرت کوانسانی انداز میں پیش کر کے منظر میں زندگی پیدا کر دی ہے۔کسان کی عظمت

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشت کار

ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار

فطرت کے اس حسین منظر کے درمیان شاعر کی نظر ایک طاقت ور انسان، یعنی کسان پر پڑتی ہے۔شاعر کے نزدیک کسان صرف کھیت میں کام کرنے والا شخص نہیں بلکہ انسانی ارتقا کا رہنما اور تہذیب کا پرورش کرنے والا ہے۔

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار

کرتی ہے دریوزہ تابش کلاہ تاجدار

کسان کے ماتھے کا پسینہ اتنا عظیم ہے کہ بادشاہ کا تاج بھی اپنی چمک کے لیے گویا اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ بادشاہوں کی شان وشوکت اور ریاستوں کی طاقت بھی کسان کی محنت کی مرہونِ منت ہے۔

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی

جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

کسان کی تعمیری قوت کے سامنے تباہی کی طاقتیں سر جھکاتی ہیں۔پوری انسانی تہذیب اسی کی محنت کے سہارے قائم اور زندہ ہے۔

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ

جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

آرام وآسائش کی زندگی کسان کی محنت کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے۔شاعر کا مطلب ہے کہ جو لوگ آرام سے زندگی گزارتے ہیں، ان کی آسائشوں کی بنیاد کسان کی سخت محنت ہے۔تمدن کی روشنی کسان کے ہاتھوں کی محنت سے روشن ہے۔کسان کی جسمانی مشقت

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں

کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

دن بھر سخت دھوپ میں کام کرنے کے بعد کسان کا چہرہ جھلس گیا ہے اور اس پر محنت کے آثار نمایاں ہیں۔اب وہ کھیت سے اپنا رخ موڑ کر گھر کی طرف جا رہا ہے۔

ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

کسان کے سر پر ٹوکرا ہے، بغل میں پھاوڑا ہے اور پیشانی پر محنت کی شکنیں ہیں۔ اس کے سامنے بیلوں کی جوڑی ہے جبکہ ہل اس کے کندھے پر رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک محنت کش کسان کی نہایت جاندار تصویر ہے۔ کسان: تہذیب اور زندگی کا معمار

کون ہل ظلمت شکن قندیل بزم آب و گل
قصر گلشن کا دریچہ سین گیتی کا دل

شاعر کسان کے ہل کو روشنی پھیلانے والی قندیل قرار دیتا ہے۔ ہل زمین کے سینے کو چیرتا ہے اور اسی سے زندگی، فصل اور خوش حالی پیدا ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہل انسانی تہذیب کے محل کا دروازہ ہے۔

خوش نما شہروں کا بانی راز فطرت کا سراغ
خاندان تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ

شاعر کے مطابق خوب صورت اور ترقی یافتہ شہروں کی بنیاد بھی کسان کی محنت پر ہے۔ وہ فطرت کے رازوں سے واقف ہے اور قوم کی طاقت و توانائی کا حقیقی سرچشمہ ہے۔

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا

کسان جب ہل چلاتا ہے تو وہ خود مٹی میں جھک جاتا ہے، مگر اپنی محنت سے مردہ اور خاموش زمین میں نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ زمین کے بے جان ذرے گویا اس کی محنت سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

جس کے چھو جاتے ہی مثل نازنین مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

کسان کے ہاتھ لگتے ہی زمین ایک حسین محبوبہ کی طرح جاگ اٹھتی ہے اور کروٹیں لینے لگتی ہے۔ یہاں زمین کو لیلائے زمیں کہہ کر نہایت دل کش تشبیہ استعمال کی گئی ہے۔

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

کسان کی محنت سے زمین کی غفلت اور خاموشی ختم ہو جاتی ہے۔ مٹی گویا اپنی چادر ہٹا کر مسکرا دیتی ہے اور اس سے نئی فصلیں اور زندگی جنم لیتی ہے۔ کسان کے مختلف روپ پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد شاعر کسان کی عظمت بیان کرنے کے لیے اس کے لیے متعدد القابات استعمال کرتا ہے:

طفل باراں تاجدار خاک امیر بوستاں
ماہر آئین قدرت ناظم بزم جہاں

کسان بارش کا بچہ، مٹی کا بادشاہ اور باغوں کا امیر ہے۔ وہ فطرت کے قوانین کو سمجھتا ہے اور دنیا کی زندگی کو منظّم رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

ناظر گل پاسبان رنگ و بو گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

کسان پھولوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا محافظ ہے۔ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اسی کی محنت سے وجود میں آتی ہیں، اس لیے وہ کھیتوں کا حقیقی بادشاہ ہے۔

وارث اسرار فطرت فاتح امید و بیم
محرم آثار باراں واقف طبع نسیم

کسان فطرت کے رازوں کا وارث ہے۔ وہ امید اور خوف دونوں کا سامنا کرتا ہے کیونکہ اس کی زندگی بارش، موسم اور قدرت کے بدلتے ہوئے حالات سے وابستہ ہے۔ وہ بارش کے آثار اور ہوا کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ محنت اور سخت کوشی کا پیکر

صبح کا فرزند خورشید زر افشاں کا علم
محنت پیہم کا پیماں سخت کوشی کی قسم

کسان صبح کا بیٹا ہے کیونکہ اس کا دن سورج نکلنے کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ وہ مسلسل محنت اور سخت کوشی کی علامت ہے۔

خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

معاشرے کی خوش حالی کسان کی جوانی اور خون سے وابستہ ہے۔ دوسروں کی آسودگی اور خوش حالی دراصل کسان کی قربانیوں اور دکھوں پر قائم ہے۔

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب

کسان کے پسینے کی بدولت زندگی کی نعمتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شاعر نے مبالغہ اور استعاراتی انداز میں کسان کے پسینے کو زندگی اور حسن کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔

کسان اور فطرت کا گہرا تعلق

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبض خاک پر

رات کو کسان کی نظریں آسمان کی طرف ہوتی ہیں تاکہ موسم اور بارش کے آثار کو دیکھ سکے، جبکہ دن کے وقت اس کی انگلیاں زمین کی نبض پر ہوتی ہیں۔ وہ آسمان اور زمین دونوں کے مزاج سے واقف ہے۔

جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبض تاک
جس کے دم سے لالہ وگل بن کے اتراتی ہے خاک

کسان کی سخت محنت سے انگور کی بیلیں پھل دیتی ہیں اور زمین پھولوں سے بھر جاتی ہے۔ زمین کی خوب صورتی اور اس کی زرخیزی کسان کی محنت کا نتیجہ ہے۔

کسان کی عظمت کے باوجود اس کی غربت

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں

شام کی سرخیاں کسان کے ہل پر چمک رہی ہیں، لیکن کسان خود سر جھکائے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ یہاں شاعر نے فطرت کے حسن اور کسان کی زندگی کی اداسی میں تضاد پیدا کیا ہے۔

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر

جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر

کسان کی نظر اس سیاسی اور جنگی نظام پر ہے جو اس کے کھیتوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس سے مراد ایسے سیاسی اور معاشی نظام ہیں جو کسان کی محنت اور اس کے وسائل کو تباہ کرتے ہیں۔

اپنی دولت کو جگر پر تیر غم کھاتے ہوئے

دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے

کسان اپنی پیدا کی ہوئی دولت کو دوسروں کے ہاتھوں جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی محنت کے ثمرات سے محروم ہے جبکہ اس کی پیدا کردہ دولت طاقت ور طبقے اور نظام کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ بھوک اور غربت کا المیہ

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکی حرماں سے راہ

فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ

کسان کی زندگی کی محرومیوں کی رات ختم نہیں ہوتی۔ گھر جاتے ہوئے اس کی نظر اپنے بھوکے بچوں کے آنسوؤں کی طرف ہے۔

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا

بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا

وہ سوچتا ہے کہ گھر پہنچ کر اپنی بیوی اور بچوں کا سامنا کیسے کرے گا۔ بیوی کے پاس مناسب لباس نہیں اور بچوں کے چہرے بھوک اور محرومی سے مرجھائے ہوئے ہیں۔

سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں

گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

کسان کے گھر میں دولت، روٹی، نمک، پانی اور کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں۔ پورا گھر بھوک اور غم کی خاموش فضا میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ نظم کا انتہائی دردناک پہلو ہے۔

سرمایہ داری کے خلاف احتجاج

ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے

یہاں شاعر براہِ راست سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔کسان کے پاس صرف ایک دل ہے لیکن اس پر غموں اور دکھوں کا بہت بڑا ہجوم ہے۔شاعر سرمایہ داری کو سنگ دل قرار دیتا ہے۔

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجر چنگیز کی مڑتی ہے دھار

سرمایہ داری کی سفا کی اتنی شدید ہے کہ اس کے مقابلے میں چنگیز خان کی تلوار کی سختی بھی کم محسوس ہوتی ہے۔یہ شاعر کا شدید مبالغہ اور سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف احتجاج ہے۔

بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات

شاعر سرمایہ داری کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تیرے ہاتھ غریبوں اور بے کسوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔وہ سوال کرتا ہے کہ کیا یہ ظالمانہ نظام پوری دنیا کو نگل جانا چاہتا ہے؟

ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

سرمایہ داری کے استحصالی نظام کو ایک خون خوار درندے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے،جس کے جبڑوں میں غریب انسانوں کا گوشت ہے۔یہ انتہائی طاقت ور اور انقلابی استعارہ ہے۔

آخری اشعار:انقلاب کی پیش گوئی

ادعائے پیروی دین و ایماں اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

شاعر سرمایہ دار طبقے کی مذہبی اور اخلاقی منافقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ایک طرف وہ دین وایمان کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے ہاتھ غریبوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفان تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

نظم کے آخری شعر میں شاعر سرمایہ دارانہ نظام کو تنبیہ کرتا ہے کہ اب مظلوموں کے دلوں میں بغاوت اور انقلاب کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔بہت سے طوفان اس ظالم نظام کو تباہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔یوں نظم ایک انقلابی پیغام اور مستقبل کی تبدیلی کی امید پر ختم ہوتی ہے۔

8.2.2:نظم ''کسان'' کی فنی خصوصیات

فنی اعتبار سے " کسان" جوشؔ ملیح آبادی کی بلند پایہ نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔اس نظم میں دل کش منظر نگاری،قوتِ بیان،خطیبانہ انداز،انقلابی جوش اور الفاظ کی شان وشوکت نمایاں ہے۔نظم کے آغاز میں شام اور فطرت کی انتہائی خوب صورت تصویر کشی کی گئی ہے۔شاعر نے تشبیہ،استعارہ اور پیکر تراشی کے ذریعے فطرت کو جاندار بنا دیا ہے۔مثلاً زمین کو "لیلائے زمیں" اور ہل کو "ظلمت شکن قندیل" کہنا نہایت مؤثر استعارات ہیں۔

نظم میں تضاد کا فنی حسن بھی موجود ہے۔ایک طرف کسان کو تہذیب کا پروردگار اور دنیا کی خوش حالی کا خالق قرار دیا گیا ہے،جبکہ دوسری طرف اسی کسان کو بھوک،فاقہ کشی اور محرومی کا شکار دکھایا گیا ہے۔یہی تضاد نظم کے جذباتی اور انقلابی اثر کو مزید گہرا کرتا ہے۔

نظم " کسان" کا مرکزی خیال کسان کی عظمت،اس کی محنت کی اہمیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں اس کے استحصال کو بیان کرنا ہے۔جوش ملیح آبادی نے ثابت کیا ہے کہ کسان صرف اناج پیدا کرنے والا فرد نہیں بلکہ انسانی تہذیب،معیشت اور ترقی کا حقیقی معمار ہے۔دنیا کی آسائشیں،شہروں کی رونقیں اور معاشرے کی خوش حالی سب کسان کی محنت کی مرہونِ منت ہیں،لیکن المیہ یہ ہے کہ خود کسان بھوک،غربت اور محرومی کی زندگی گزارتا ہے۔نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ محنت کرنے والے طبقے کو اس کی محنت کا جائز حق ملنا چاہیے اور ظلم،استحصال اور سرمایہ دارانہ ناانصافی کے خلاف آواز بلند ہونی چاہیے۔

جوش ملیح آبادی کی نظم " کسان" محض ایک کسان کی زندگی کا بیان نہیں بلکہ محنت کش طبقے کی عظمت کا ایک بھرپور منظوم اعلان ہے۔

شاعر نے کسان کو فطرت کا رازداں، زمین کا بادشاہ، تہذیب کا معمار اور انسانی ترقی کا پیشوا قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے استحصال پر شدید احتجاج کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی بے رحمی کو بے نقاب کیا ہے۔ اس طرح یہ نظم حسنِ فطرت، عظمتِ محنت، سماجی حقیقت نگاری اور انقلابی شعور کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

8.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال 1: جوش ملیح آبادی کی شاعری کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

(الف) صرف عشقیہ مضامین (ب) انقلابی جوش اور خطیبانہ آہنگ

(ج) صرف طنز و مزاح (د) صرف صوفیانہ خیالات

سوال 2: نظم ''کسان'' میں شاعر نے کس طبقے کی محنت کو موضوع بنایا ہے؟

(الف) تاجروں کی (ب) مزدوروں کی

(ج) کسانوں کی (د) صنعت کاروں کی

سوال 3: کسان اپنی محنت سے کس چیز کو سرسبز و شاداب بناتا ہے؟

(الف) بازار (ب) کھیت اور زمین

(ج) کارخانے (د) شہر

سوال 4: نظم ''کسان'' میں کسان کی شخصیت کس جذبے کی نمائندگی کرتی ہے؟

(الف) مایوسی (ب) عیش پسندی

(ج) محنت، جدوجہد اور خودداری (د) بے عملی

سوال 5: جوش ملیح آبادی کو عمومی طور پر کس لقب سے یاد کیا جاتا ہے؟

(الف) شاعرِ مشرق (ب) شاعرِ انقلاب

(ج) ملک الشعرا (د) شاعرِ فطرت

8.4: عمومی جائزہ

جوشؔ ملیح آبادی اردو شاعری کے ان ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کی شاعری میں جوش، ولولہ، حریت، انقلاب اور انسانی عظمت کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی نظم ''کسان'' میں ہندوستانی کسان کی محنت، جدوجہد، مشقت اور عظمت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کسان انسانی معاشرے کا ایک نہایت اہم فرد ہے۔ وہ سخت گرمی، سردی، دھوپ اور بارش کی پروا کیے بغیر زمین میں ہل چلاتا، بیج بوتا، فصلوں کی نگہداشت کرتا اور اپنی محنت سے زمین کو سرسبز بناتا ہے۔ اس کی محنت سے انسانوں کے لیے غلہ اور دوسری ضروریاتِ زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود کسان کی اپنی زندگی اکثر مشکلات، غربت اور محرومیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ شاعر کسان کو محض ایک کھیتی باڑی کرنے والا انسان نہیں سمجھتا بلکہ اسے محنت، قوت، تخلیق اور زندگی کی علامت قرار دیتا ہے۔ کسان کا پسینہ زمین میں شامل ہو کر زندگی، سبزہ اور خوش حالی پیدا کرتا ہے۔ اس لیے شاعر کے نزدیک کسان کا مقام نہایت بلند ہے۔ نظم میں کسان کی جسمانی محنت کے ساتھ اس کی ہمت، خودداری، استقامت اور حوصلے کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ وہ مشکلات سے نہیں گھبراتا بلکہ اپنی مسلسل محنت کے ذریعے بنجر زمین کو زرخیز بنا دیتا ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اس نظم کے ذریعے سماج کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ کسان کی محنت ہی معاشرے کی معاشی اور غذائی زندگی کی بنیاد ہے۔ اس لیے کسان کی محنت کا احترام کرنا اور اس کے مسائل کو سمجھنا ضروری ہے۔ نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ محنت عظمت کی علامت ہے اور کسان معاشرے کی تعمیر و ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

8.5: فرہنگ

1۔ کسان	کھیتی باڑی کرنے والا شخص
2۔ محنت	مشقت، سخت کوشش
3۔ مشقت	سخت کام، محنت
4۔ عرق	پسینہ
5۔ زرخیز	زیادہ پیداوار دینے والی زمین

6۔بنجر	غیر آباد، بے پیداوار
7۔شاداب	ہرا بھرا
8۔کشت	کھیتی، کاشت
9۔فصل	کھیت کی پیداوار
10۔ہل	زمین جوتنے کا آلہ
11۔کاشت	کھیتی کرنا
12۔استقامت	ثابت قدمی
13۔جدوجہد	مسلسل کوشش
14۔خودداری	عزتِ نفس
15۔عظمت	بزرگی، بڑائی
16۔محرومی	کسی چیز سے محروم ہونا
17۔رزق	روزی
18۔تخلیق	پیدا کرنا، وجود میں لانا
19۔ولولہ	جوش اور شدید جذبہ
20۔انقلاب	بڑی تبدیلی

8.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: جوش ملیح آبادی کی نظم ''کسان'' کا مرکزی خیال تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال2: نظم ''کسان'' میں کسان کی محنت اور جدوجہد کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے؟

سوال3: جوش ملیح آبادی نے کسان کو عظمت اور محنت کی علامت کیسے بنایا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

سوال4: نظم ''کسان'' کے فنی اور اسلوبی محاسن پر روشنی ڈالیے۔

سوال5: نظم ''کسان'' کے سماجی اور اصلاحی پہلوؤں کو واضح کیجیے۔

8.7: مشقی سوالات

1۔جوش ملیح آبادی کو شاعرِ انقلاب کیوں کہا جاتا ہے؟

2۔نظم ''کسان'' میں کسان کی تین نمایاں خصوصیات لکھیے۔

3۔کسان معاشرے کے لیے کیوں اہم ہے؟

4۔نظم ''کسان'' ہمیں کیا پیغام دیتی ہے؟

8.8: جوابات سرگرمی

1۔(ب) انقلابی جوش اور خطیبانہ آہنگ

2۔(ج) کسانوں کی

3۔(ب) کھیت اور زمین

4۔(ج) محنت، جدوجہد اور خودداری

5۔(ب) شاعرِ انقلاب

8.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: جوش ملیح آبادی کی نظم ''کسان'' کا مرکزی خیال تفصیل سے بیان کیجیے۔

جواب: نظم ''کسان'' کا مرکزی خیال کسان کی محنت، عظمت، جدوجہد اور معاشرے کے لیے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔کسان سخت حالات میں بھی زمین کو آباد کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لیے غذا فراہم کرتا ہے۔وہ گرمی، سردی اور موسم کی سختیوں کی پروا کیے بغیر مسلسل محنت کرتا

رہتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کسان کو ایک ایسے محنت کش انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کی کوششوں سے بنجر زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ کسان کا پسینہ زمین میں شامل ہو کر فصلوں اور خوش حالی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ کسان اپنی بے پناہ محنت کے باوجود اکثر غربت اور محرومی کا شکار رہتا ہے۔ چنانچہ نظم کسان کے مقام و مرتبے کو تسلیم کرنے اور اس کی محنت کا احترام کرنے کا درس دیتی ہے۔

سوال 2: نظم ''کسان'' میں کسان کی محنت اور جدوجہد کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے؟

جواب: نظم میں کسان کو مسلسل محنت کرنے والے انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ علی الصبح کھیتوں میں پہنچتا ہے، زمین کو جوتتا ہے، بیج بوتا ہے، فصل کی دیکھ بھال کرتا ہے اور مختلف موسمی مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ کسان کی زندگی آرام و آسائش کے بجائے سخت محنت سے عبارت ہے۔ کبھی اسے تیز دھوپ کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی سردی اور بارش میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوتا بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے۔ شاعر نے کسان کی محنت کو عزت و عظمت سے جوڑتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ انسانی تہذیب اور زندگی کا تسلسل کسان کی اسی جدوجہد سے وابستہ ہے۔

سوال 3: جوش ملیح آبادی نے کسان کو عظمت اور محنت کی علامت کیسے بنایا ہے؟

جواب: جوش ملیح آبادی کی نظر میں کسان صرف کھیت میں کام کرنے والا فرد نہیں بلکہ محنت، طاقت، ہمت اور تخلیقی قوت کی علامت ہے۔ وہ زمین کو اپنی محنت کے ذریعے زرخیز بناتا اور اس سے رزق پیدا کرتا ہے۔ کسان کے ہاتھوں کی محنت سے پورے معاشرے کی خوراک کا بندوبست ہوتا ہے۔ اگر کسان کھیتی نہ کرے تو معاشرے کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اسے ایک عظیم اور قابلِ احترام انسان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ نظم میں کسان کی ثابت قدمی، جفاکشی اور خودداری اس کی عظمت میں اضافہ کرتی ہیں۔ اس طرح کسان ایک فرد سے بڑھ کر محنت کی اجتماعی علامت بن جاتا ہے۔

سوال 4: نظم ''کسان'' کے فنی اور اسلوبی محاسن پر روشنی ڈالیے۔

جواب: نظم ''کسان'' جوش ملیح آبادی کے مخصوص پرجوش، پُراثر اور خطیبانہ اسلوب کی عمدہ مثال ہے۔ نظم میں الفاظ کا انتخاب ایسا ہے جو کسان کی قوت، محنت اور جدوجہد کو بھرپور انداز میں سامنے لاتا ہے۔ شاعر نے منظر نگاری کے ذریعے کھیت، زمین، محنت، پسینے اور فصل کے مناظر کو زندہ کر دیا ہے۔ زبان میں روانی، جوش اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ تشبیہات، استعارات اور علامتی انداز نظم کے حسن میں اضافہ کرتے

ہیں۔نظم کا آہنگ بھی پُر جوش ہے،جس کے باعث قاری کے دل میں کسان کے لیے احترام اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔جوش کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت الفاظ کا جلال اور بلند آہنگی ہے، جو اس نظم میں بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

سوال5:نظم ''کسان'' کے سماجی اور اصلاحی پہلوؤں کو واضح کیجیے۔

جواب: نظم ''کسان'' میں ایک اہم سماجی پیغام موجود ہے۔شاعر معاشرے کی توجہ اس طبقے کی طرف مبذول کراتا ہے جو سب کے لیے خوراک پیدا کرتا ہے لیکن خود اکثر غربت،محرومی اور مشکلات میں زندگی بسر کرتا ہے۔

یہ نظم معاشرے کو کسان کے حقوق اور اس کی محنت کی قدر کرنے کا درس دیتی ہے۔شاعر چاہتا ہے کہ محنت کش طبقے کو عزت،انصاف اور مناسب مقام دیا جائے۔نظم کا اصلاحی پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں محنت،خودداری،استقلال اور جدوجہد کی تلقین کی گئی ہے۔کسان کی مثال کے ذریعے شاعر یہ پیغام دیتا ہے کہ محنت ہی ترقی اور خوش حالی کا بنیادی ذریعہ ہے۔

8.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت،تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی،جدیدیت،مابعد جدیدیت — مرتب:ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب:مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 9 نظم ''علم''، تلوک چند محرومؔ

ساخت

9.0 اغراض ومقاصد

9.1 تعارف

9.2 نظم ''علم'' کا متن

9.2.1 نظم ''علم'' کی تشریح

9.2.2 نظم ''علم'' کی فنی خصوصیات

9.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

9.4 عمومی جائزہ

9.5 فرہنگ

9.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

9.7 مشقی سوالات

9.8 جوابات سرگرمی

9.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

9.9 امدای کتب

9.0 :اغراض ومقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو تلوک چند محروم کی نظم ''علم'' کے مرکزی خیال، فکری وسعت اور ادبی اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔ اس نظم کے مطالعے کے ذریعے آپ علم کی قدر و منزلت، انسانی زندگی میں اس کی ضرورت اور فرد و معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اس کے بنیادی کردار کو سمجھ سکیں گے۔ شاعر نے علم کو محض کتابی معلومات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے انسان کی فکری، اخلاقی، روحانی، سائنسی اور تہذیبی ترقی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اس سبق کے مطالعے سے آپ یہ جان سکیں گے کہ علم کس طرح انسان کو جہالت، گمراہی، تعصب، سستی اور فکری جمود سے نکال کر شعور، معرفت، تحقیق اور ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

اس نظم کے مطالعے کا ایک اہم مقصد آپ کو علم کے تاریخی اور تہذیبی سفر سے بھی آگاہ کرنا ہے۔ شاعر نے ہندوستان، یونان، مصر اور یورپ کے حوالے سے مختلف تہذیبوں میں علم کے فروغ اور اس کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ اس طرح آپ اس حقیقت کو سمجھ سکیں گے کہ علم کسی ایک قوم، خطے یا عہد کی میراث نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ ساتھ ہی نظم میں ہندوستان کی قدیم علمی عظمت اور جدید دور میں یورپ کی سائنسی ترقی کا ذکر کر کے یہ احساس پیدا کیا گیا ہے کہ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو علم، تحقیق، محنت اور اہلِ علم کی قدر کرتی ہیں۔

اس سبق کے ذریعے آپ علم کی مختلف صورتوں اور شعبوں، مثلاً ادب، فلسفہ، ریاضی، منطق، سائنس، انجینئرنگ اور جدید ایجادات سے اس کے تعلق کو بھی سمجھ سکیں گے۔ آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ شاعر نے ریل، بجلی، بھاپ، بحری سفر اور ہوائی پرواز جیسے سائنسی کارناموں کو علم کی قوت کے مظاہر کے طور پر کس طرح پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نظم میں استعمال ہونے والی تشبیہات، استعارات، تشخیص، مبالغہ، تلمیحات اور فارسی آمیز تراکیب سے واقف ہوں گے اور تلوک چند محروم کے اسلوبِ بیان اور شعری ہنر کا ادراک کر سکیں گے۔ مجموعی طور پر اس سبق کا مقصد آپ کے اندر علم دوستی، تحقیق و جستجو، محنت، خود آگہی اور علمی ترقی کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

9.1: تعارف

تلوک چند محروم اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی، روانی، قومی جذبہ، اخلاقی شعور، مقصدیت اور انسان دوستی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنایا اور بالخصوص تعلیم، علم، اخلاق، وطن دوستی اور انسانی اقدار کو بڑی اہمیت دی۔ زیرِ مطالعہ نظم ''علم'' بھی ان کی ایک اہم مقصدی نظم ہے جس میں انہوں نے علم کی عظمت، افادیت

اور ہمہ گیری کو نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

نظم کا آغاز ایک رباعی سے ہوتا ہے جس میں شاعر یہ احساس دلاتا ہے کہ علم کی عظمت کو اپنی زبان سے بیان کرنا آسان نہیں۔ اس لیے شاعر خود خاموش ہو جاتا ہے اور علم کو ایک زندہ اور متحرک کردار کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد پوری نظم میں ''علم'' خود اپنی داستان سناتا ہے۔ یہ نظم کی ایک نہایت اہم فنی خصوصیت ہے۔ علم اپنے آپ کو آبِ بقا، خاکِ شفا، ابرِ بہار، نسیمِ صبا، خورشیدِ معرفت، چراغِ ہدایت، آفتابِ حقیقت نما، کوہِ زر، کانِ گہر اور کیمیا جیسی مختلف علامتوں اور استعارات کے ذریعے متعارف کراتا ہے۔ ان علامتوں سے شاعر یہ واضح کرتا ہے کہ علم زندگی کو روشنی، توانائی، حسن، شعور اور دوام بخشتا ہے۔ نظم میں علم کے روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرف اسے معرفت، حقیقت، انبیا کی میراث اور قربِ خدا کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے، تو دوسری طرف اسے انسانی ایجادات، صنعت، سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیاد بتایا گیا ہے۔ شاعر کے نزدیک پہاڑوں کو چیر کر راستے بنانا، سمندروں پر سفر کرنا، انسان کا فضا میں پرواز کرنا، بجلی اور بھاپ سے کام لینا، ریل چلانا اور مختلف علوم و فنون میں ترقی کرنا سب علم ہی کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ اس طرح نظم میں علم کو ایک ایسی ہمہ گیر قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔

تلوک چند محروم نے نظم میں ہندوستان کی قدیم علمی عظمت کو بھی بڑے فخر سے بیان کیا ہے۔ گنگا، ہمالہ، یونان، مصر اور یورپ کے ذکر کے ذریعے شاعر علم کے تاریخی سفر کو سامنے لاتا ہے۔ وہ اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ کبھی ہندوستان علم و حکمت کا عظیم مرکز تھا، جب کہ جدید دور میں یورپ نے علم اور سائنس سے استفادہ کر کے غیر معمولی مادی ترقی حاصل کی۔ اس تقابل کے ذریعے شاعر بالواسطہ یہ پیغام دیتا ہے کہ کسی قوم کی سربلندی اور ترقی کا راز علم، تحقیق، محنت اور علمی شعور میں پوشیدہ ہے۔ نظم ''علم'' محض علم کی تعریف و توصیف نہیں بلکہ ایک فکری اور اصلاحی پیغام کی حامل نظم ہے۔ اس میں علم کو انسان کی سب سے قیمتی دولت، اس کی فکری آزادی کا وسیلہ اور تہذیبی ترقی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ شاعر کا پیغام واضح ہے کہ انسان کو غرور، سستی اور جہالت سے بچ کر علم، تحقیق، جستجو اور عمل کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ حقیقی عظمت اور پائیدار ترقی کا سرچشمہ علم ہی ہے۔

9.2: نظم ''علم'' کا متن

بیکار ہے یاں شیوا بیانی اپنی　　بے سود ہے اے طبع روانی اپنی

محروم ہے خاموش قلم ہے ساکت
خود علم سناتا ہے کہانی اپنی

بزمِ جہاں میں ساغرِ آبِ بقا ہوں میں
آزارِ مرگ کیا ہے کہ خاکِ شفا ہوں میں

میرے ہی دم سے ہے گلِ ہستی میں رنگ و بو
ابرِ بہار ہوں میں، نسیمِ صبا ہوں میں

رونقِ طلسم خانہ امکاں کی مجھ سے ہے
ہوں وہ طلسمِ ہوش کہ حیرت فزا ہوں میں

وہ میری گفتگو ہے، فدا جس پہ تازگی
دورِ قدیم سے ہوں، مگر نت نیا ہوں میں

سب شوخیاں ہیں عالمِ ایجاد میں مری
میرے ہیں سب کرشمے، جدھر دیکھتا ہوں میں

سب جانتے ہیں نورِ جبینِ ازل مجھے
رنگِ ظہورِ خالقِ ارض و سما ہوں میں

عارف کے واسطے ہوں میں خورشیدِ معرفت
برہم زنِ طلسمِ شبِ ماسوا ہوں میں

گمراہ میری راہ پہ ہوتا نہیں کوئی
پرتو دہِ چراغِ طریقِ صفا ہوں میں

مشکل نہیں ہیں راہِ حقیقت کے مرحلے
منزل نہیں ہے دور اگر رہنما ہوں میں

دیتا ہوں بے نشاں کا نشاں کچھ نہ کچھ ضرور
طالب زمانہ جس کا ہے، اُس کا پتا ہوں میں

ہر چند وہ رسائیِ دانش سے دور ہے
ہے یہ بھی جاننا کہ نہیں جانتا ہوں میں

میراثِ انبیا مرا مشہور نام ہے
سیدھا سا اک وسیلہ قربِ خدا ہوں میں

دیتا ہے گو کہ سارے زمانے کو روشنی
رتبے میں آفتاب سے لیکن سوا ہوں میں

اس آفتاب میں تو ہے ظاہری روشنی
دراصل آفتابِ حقیقت نما ہوں میں

ظلمت فزائے دل، مہ و خورشید ہوں ابھی
چشمِ جہاں سے آج نہاں گر ذرا ہوں میں

میرا وطن نہ پوچھئے مجھ سے کہ صبح و شام
غربت میں مثلِ بادیہ گرد و صبا ہوں میں

اُس سرزمیں پہ کرتا ہوں چندے قیام بھی
جو میری اپنی قدر جہاں دیکھتا ہوں میں

نفرت غرور و کبر سے ہے، کاہلی سے ہے
ان کا جہاں عمل ہو، وہاں سے اُٹھا ہوں میں

اس مملکت میں میں نے گزاری ہیں مدتیں
سچ پوچھئے تو ہند میں پیدا ہوا ہوں میں

جنت نشاں یہی ہے پرانا وطن مرا
پرورده اسی میں، اسی میں بڑھا ہوں میں

پالا اسی نے دامنِ شفقت میں ہے مجھے
سائے میں اسکی مہر کے صدیوں رہا ہوں میں

یونان و مصر میں بھی پھرا مدتوں، مگر
جس ملک میں گیا ہوں یہیں سے گیا ہوں میں

گنگا کے یہ کنارے، ہمالہ کی چوٹیاں
تھے میری سیرگاہ، انہیں جانتا ہوں میں

یورپ میں آج کل ہیں مرے قدرداں، مگر
واں صرف صرف مادّہ بقا ہوں میں

بھارت ورش میں جب تھے مرے دن عروج کے
اُس وقت کیا تھا، آہ! مگر آج کیا ہوں میں

جس رنگ میں ہوں، خیر یہی رنگ خوب ہے
ظاہر ہوں جس ادا میں، بہت دلربا ہوں میں

کچھ ذوقِ دید ہے، تو جو انسان زندہ دل
دیکھو مجھے کہ شاہدِ رنگیں ادا ہوں میں

ایسے مرے نصیب کہاں ہیں حواس کو
مجھ میں وہ رس ہے، لاکھ مزوں کا مزا ہوں میں

رکھتا ہوں اپنے طالبِ صادق کو شاد کام
مائل کوئی مرا ہے تو اُس پر فدا ہوں میں

رہتا ہوں مثلِ مردمکِ چشم آنکھ میں
مٹتا نہیں ہوں دل سے، وہ نقشِ وفا ہوں میں

ہر ملک، ہر دیار میں عالم کی قدر ہے
سارا زمانہ دوست ہے، گر آشنا ہوں میں

بوڑھوں میں رکھتا ہوں میں جوانوں کی آن بان
وہ ہاتھ ناتواں نہیں، جس میں عصا ہوں میں

مفلس نہیں رہا کہیں طالب کوئی مرا
میں کوہِ زر ہوں، کانِ گہر، کیمیا ہوں میں

اقبال جس کو کہتے ہیں، پرورده ہے مرا
کیا سایہ ہما ہے، ہما کا ہما ہوں میں

یورپ کو دیکھیے کہ ہے دولت سے مالا مال
وہ غوطہ زن ہے مجھ میں کہ بحرِ سخا ہوں میں

محتاج ہر ہنر ہے مرا اور ہر ایک فن
میں ابتدا کمال کی ہوں، انتہا ہوں میں

خاک، آب و باد و آتش سرکش بدیں جلال
سب میرے زیرِ حکم ہیں، فرمانروا ہوں میں

رستے بنائے میں نے پہاڑوں کو چیر کر
ہمدم ذرا جو انجینئر کا ہوا ہوں میں

مثلِ زمیں بنے ہیں سمندر پہ شاہراہ
بیڑے کو خوف کیا ہے، اگر ناخدا ہوں میں

ادنیٰ سا ہے کرشمہ، تعجب ہے اس میں کیا
لے کر اگر بشر کو ہوا میں اُڑا ہوں میں

لونڈی ہے میری برق، بخارات ہیں غلام
دونوں سے تار ریل کو چلوا رہا ہوں میں

ظاہر نظر فریب ہے، باطن ہے دلپذیر
ہر رنگ اور روپ میں جلوہ نما ہوں میں

موجود ہر الاپ میں ہوں، ہر خیال میں
ہوں شاعری کہیں تو کہیں فلسفہ ہوں میں

میں ہوں کہیں نقوشِ ریاضی میں جلوہ گر
منطق کے سلسلوں میں کہیں بولتا ہوں میں

پیدا کروں میں شیکسپیر اور والمیک
ہے لطف گر معاونِ طبعِ رسا ہوں میں

اظہارِ امرِ واقعی نے محروؔم کر دیا
ورنہ نہ خود فروش، نہ کچھ خود نما ہوں میں

9.2.1: نظم ''علم'' کی تشریح

ابتدائی رباعی کی تشریح

بیکار ہے یاں شیو بیانی اپنی
بے سود ہے اے طبعِ روانی اپنی
محروم ہے خاموش، قلم ہے ساکت
خود علم سناتا ہے کہانی اپنی

تلوک چند محروم نے نظم علم کا آغاز ایک رباعی سے کیا ہے۔ محروم اس رباعی میں اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ علم جیسی عظیم، وسیع اور ہمہ گیر حقیقت کو اپنی زبان اور شاعرانہ قوت کے ذریعے مکمل طور پر بیان کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس موقع پر اس کی قوتِ بیان، طبع کی روانی اور قلم سب بے بس اور خاموش ہیں۔ اس لیے شاعر اپنی ذات کو پسِ پشت ڈال کر خود علم کو بولنے کا موقع دیتا ہے۔ گویا علم ایک زندہ اور باشعور کردار بن کر اپنی عظمت، افادیت، تاریخ اور کارناموں کی داستان خود سناتا ہے۔ یہی انداز پوری نظم کی بنیاد ہے۔

شعر1 بزمِ جہاں میں ساغرِ آبِ بقا ہوں میں

آزارِ مرگ کیا ہے کہ خاکِ شفا ہوں میں

علم کہتا ہے کہ دنیا کی محفل میں میری حیثیت آبِ حیات کے جام جیسی ہے۔ میں انسان، تہذیب اور قوموں کو فنا سے بچانے اور زندگی کو دوام بخشنے والا ہوں۔ علم کے ذریعے انسان اپنے افکار، تجربات اور دریافتوں کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرتا ہے۔ اسی لیے علم موت اور فنا کے مقابل ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو فکری طور پر زندہ رکھتی ہے۔

شعر2 میرے ہی دم سے ہے گلِ ہستی میں رنگ و بو

ابرِ بہار ہوں میں، نسیمِ صبا ہوں میں

علم انسانی زندگی کے حسن، رونق اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ جس طرح بہار کا بادل اور صبح کی خوشگوار ہوا پھولوں کو تازگی دیتی ہے، اسی طرح علم زندگی میں شعور، حسن، تہذیب اور ترقی پیدا کرتا ہے۔ علم کے بغیر انسانی زندگی بے رنگ اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔

شعر3 رونقِ طلسم خانہ امکاں کی مجھ سے ہے

ہوں وہ طلسمِ ہوش کہ حیرت فزا ہوں میں

کائنات امکانات اور اسرار سے بھری ہوئی ہے۔ ان اسرار کو سمجھنے اور نئے امکانات دریافت کرنے کا ذریعہ علم ہے۔ علم جوں جوں کائنات کے راز کھولتا ہے، انسان کی حیرت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ شاعر علم کو ایسا طلسم قرار دیتا ہے جو عقل کو بیدار کرتا اور انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

شعر4 وہ میری گفتگو ہے، فدا جس پہ تازگی

دورِ قدیم سے ہوں، مگر نِت نیا ہوں میں

علم اگرچہ انسانی تاریخ جتنا قدیم ہے، لیکن اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہر عہد میں نئی صورت اختیار کرتا رہتا ہے۔ نئی تحقیقات، دریافتوں اور نظریات سے علم میں تازگی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح علم قدیم ہونے کے باوجود ہمیشہ جدید اور تازہ رہتا ہے۔

شعر5 سب شوخیاں ہیں عالمِ ایجاد میں مری

میرے ہیں سب کرشمے، جدھر دیکھتا ہوں میں

دنیا میں جتنی ایجادات، دریافتیں اور سائنسی ترقی نظر آتی ہے، ان سب کے پیچھے علم کی قوت کارفرما ہے۔ انسان نے اپنی علمی صلاحیت

کی مدد سے بے شمار حیرت انگیز چیزیں ایجاد کی ہیں۔اس لیے علم ان تمام کارناموں کو اپنی جلوہ گری قرار دیتا ہے۔

شعر6 سب جانتے ہیں نورِ جبینِ ازل مجھے
رنگِ ظہورِ خالقِ ارض و سما ہوں میں

علم اپنے آپ کو ازلی روشنی قرار دیتا ہے۔کائنات اور اس کے نظام کو سمجھنے سے انسان خالق کی قدرت اور حکمت کا ادراک کرتا ہے۔یوں علم محض دنیاوی معلومات کا نام نہیں بلکہ وہ خدا کی تخلیقی عظمت کو پہچاننے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

شعر7 عارف کے واسطے ہوں میں خورشیدِ معرفت
برہم زنِ طلسمِ شبِ ماسوا ہوں میں

صاحبِ معرفت انسان کے لیے علم سورج کی طرح روشنی فراہم کرتا ہے۔علم جہالت،گمراہی اور باطل تصورات کی تاریکی کو ختم کرتا ہے۔ وہ انسان کو ظاہری دنیا سے بلند کر کے حقیقت اور معرفت تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شعر8 گمراہ میری راہ پہ ہوتا نہیں کوئی
پرتو دہِ چراغِ طریقِ صفا ہوں میں

علم کا صحیح راستہ اختیار کرنے والا انسان گمراہی سے بچ سکتا ہے۔علم پاکیزگی،صداقت اور درست فکر کے راستے کو روشن کرتا ہے۔شاعر نے علم کو ایسے چراغ سے تشبیہ دی ہے جو انسان کی منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

شعر9 مشکل نہیں ہیں راہِ حقیقت کے مرحلے
منزل نہیں ہے دور اگر رہنما ہوں میں

حقیقت تک پہنچنا بظاہر مشکل ہے،لیکن اگر علم انسان کا رہنما بن جائے تو یہ سفر آسان ہو جاتا ہے۔علم انسان کو صحیح اور غلط میں فرق کرنا سکھاتا ہے اور اسے حقیقت کی منزل تک پہنچنے کا راستہ دکھاتا ہے۔

شعر10 دیتا ہوں بے نشاں کا نشاں کچھ نہ کچھ ضرور
طالب زمانہ جس کا ہے، اُس کا پتا ہوں میں

انسان جن نامعلوم حقیقتوں کی تلاش کرتا ہے،علم اسے ان کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک آگاہ کرتا ہے۔تحقیق اور جستجو کے ذریعے علم

نامعلوم کو معلوم میں تبدیل کرتا ہے۔ گویا جس حقیقت کی انسان تلاش کرتا ہے، اس تک پہنچنے کا راستہ علم بتاتا ہے۔

شعر11 ہر چند وہ رسائیِ دانش سے دور ہے
ہے یہ بھی جاننا کہ نہیں جانتا ہوں میں

کائنات میں بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جن تک انسانی عقل مکمل طور پر نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن اپنی علمی حدود کو پہچان لینا بھی علم ہی کی ایک صورت ہے۔ سچا عالم وہ ہے جو یہ جانتا ہو کہ اس کے علم کی بھی ایک حد ہے۔

شعر12 میراثِ انبیا مرا مشہور نام ہے
سیدھا سا اک وسیلہ قربِ خدا ہوں میں

علم کو دینی روایت میں انبیا کی میراث کہا گیا ہے۔ علم انسان کو خدا، کائنات اور اپنی ذات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی اعتبار سے علم قربِ خدا حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

شعر13 دیتا ہے گو کہ سارے زمانے کو روشنی
رتبے میں آفتاب سے لیکن سوا ہوں میں

سورج دنیا کو ظاہری روشنی دیتا ہے، لیکن علم انسان کے ذہن اور باطن کو روشن کرتا ہے۔ اسی بنا پر علم اپنے مرتبے کو سورج سے بھی بلند قرار دیتا ہے، کیونکہ اس کی روشنی جسمانی نہیں بلکہ فکری اور روحانی بھی ہے۔

شعر14 اس آفتاب میں تو ہے ظاہری روشنی
دراصل آفتابِ حقیقت نما ہوں میں

سورج کی روشنی صرف ظاہری اشیا کو دکھاتی ہے، جبکہ علم حقائق کے باطن تک رسائی دیتا ہے۔ علم ایسا آفتاب ہے جو انسان کو حقیقت، معرفت اور زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں سے روشناس کرتا ہے۔

شعر15 ظلمت فزائے دل، مہ و خورشید ہوں ابھی
چشمِ جہاں سے آج نہاں گر ذرا ہوں میں

اس شعر کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ علم دل و دماغ کی تاریکی دور کرنے والی روشنی ہے۔ اگر کسی دور یا معاشرے میں علم وقتی طور پر نظر انداز

ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ علم کی روشنی بالآخر دوبارہ ظاہر ہوتی ہے۔

شعر16 میرا وطن نہ پوچھئے مجھ سے کہ صبح و شام
غربت میں مثلِ بادیہ گرد و صبا ہوں میں

علم کسی ایک ملک یا قوم کی ملکیت نہیں۔ وہ دنیا بھر میں سفر کرتا اور مختلف تہذیبوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ شاعر علم کو صحرا میں پھرنے والی ہوا سے تشبیہ دے کر اس کی آفاقیت بیان کرتا ہے۔

شعر17 اُس سرزمیں پہ کرتا ہوں چندے قیام بھی
جو میری اپنی قدر جہاں دیکھتا ہوں میں

علم وہاں زیادہ دیر ٹھہرتا اور ترقی کرتا ہے جہاں اس کی قدر کی جاتی ہے۔ جو قومیں اہلِ علم کی عزت، تحقیق کی سرپرستی اور تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، علم انہی معاشروں میں پھلتا پھولتا ہے۔

شعر18 نفرت غرور و کبر سے ہے، کاہلی سے ہے
ان کا جہاں عمل ہو، وہاں سے اُٹھا ہوں میں

علم کو تکبر، غرور اور سستی پسند نہیں۔ علم کے حصول کے لیے عاجزی، محنت، جستجو اور مسلسل کوشش ضروری ہے۔ جہاں سستی، خود پسندی اور جمود غالب ہوں، وہاں علم ترقی نہیں کر سکتا۔

شعر19 اس مملکت میں میں نے گزاری ہیں مدتیں
سچ پوچھئے تو ہند میں پیدا ہوا ہوں میں

یہاں شاعر ہندوستان کی قدیم علمی روایت پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ علم اپنی زبان سے کہتا ہے کہ ہندوستان قدیم زمانے سے فلسفہ، ریاضی، طب، مذہب اور دیگر علوم کا مرکز رہا ہے۔ اس لیے ہندوستان کے ساتھ علم کا گہرا تاریخی تعلق ہے۔

شعر20 جنت نشاں یہی ہے پرانا وطن مرا
پروردہ اسی میں، اسی میں بڑھا ہوں میں

علم ہندوستان کو اپنا قدیم وطن اور پرورش کی جگہ قرار دیتا ہے۔ شاعر ہندوستان کی قدیم علمی اور تہذیبی عظمت کو نمایاں کرتا ہے اور اسے علم

ودانش کی سرزمین کے طور پر پیش کرتا ہے۔

شعر21 پالا اسی نے دامنِ شفقت میں ہے مجھے

سائے میں اس کی مہر کے صدیوں رہا ہوں میں

ہندوستان نے صدیوں تک مختلف علوم وفنون کی آبیاری کی۔علم کہتا ہے کہ اسے اس سرزمین نے محبت اور شفقت سے پروان چڑھایا۔ اس شعر میں شاعر کا قومی اور تہذیبی افتخار نمایاں ہے۔

شعر22 یونان و مصر میں بھی پھرا مدتوں، مگر

جس ملک میں گیا ہوں یہیں سے گیا ہوں میں

شاعر علم کے سفر کو مختلف قدیم تہذیبوں سے جوڑتا ہے۔ ہندوستان، یونان اور مصر قدیم علوم کے بڑے مراکز رہے ہیں۔شعر میں ہندوستانی علمی روایت کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے علم کی بین الاقوامی منتقلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

شعر23 گنگا کے یہ کنارے، ہمالہ کی چوٹیاں

تھے میری سیرگاہ، انہیں جانتا ہوں میں

گنگا اور ہمالہ ہندوستان کی تہذیبی اور جغرافیائی علامتیں ہیں۔علم ان مقامات کو اپنی قدیم سیرگاہ قرار دے کر ہندوستان سے اپنی دیرینہ وابستگی ظاہر کرتا ہے۔

شعر24 یورپ میں آج کل ہیں مرے قدرداں، مگر

واں صرف صرف مادّہ بقا ہوں میں

جدید دور میں یورپ نے علم، سائنس اور تحقیق کو بہت اہمیت دی، لیکن شاعر کے نزدیک وہاں علم کا زیادہ زور مادی ترقی پر ہے۔ یہاں روحانی و اخلاقی علم اور محض مادی علم کے درمیان ایک فرق قائم کیا گیا ہے۔

شعر25 بھارت ورش میں جب تھے مرے دن عروج کے

اُس وقت کیا تھا، آہ! مگر آج کیا ہوں میں

شاعر ہندوستان کے علمی ماضی اور اپنے زمانے کی صورتِ حال کا تقابل کرتا ہے۔ایک زمانہ تھا جب ہندوستان علم وحکمت کا عظیم مرکز

تھا،مگراب اس علمی عظمت میں کمی آ گئی ہے۔اس شعر میں حسرت اور ماضی کی یاد کا رنگ نمایاں ہے۔

شعر26 جس رنگ میں ہوں، خیر یہی رنگ خوب ہے

ظاہر ہوں جس ادا میں، بہت دلربا ہوں میں

علم ہر دور میں نئی صورت اختیار کرتا ہے۔خواہ وہ فلسفہ ہو، ادب ہو، سائنس ہو یا ٹیکنالوجی، ہر شکل میں علم انسان کے لیے دلکش اور مفید ہے۔

شعر27 کچھ ذوقِ دید ہے، تو جو انسان زندہ دل

دیکھو مجھے کہ شاہدِ رنگیں ادا ہوں میں

اگر انسان میں علم کو سمجھنے اور اس کے حسن کو دیکھنے کا ذوق موجود ہو تو اسے ہر طرف علم کے جلوے نظر آئیں گے۔شاعر علم کو ایک خوب صورت محبوب یا شاہدِ رنگیں ادا کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

شعر28 ایسے مرے نصیب کہاں ہیں حواس کو

مجھ میں وہ رس ہے، لاکھ مزوں کا مزا ہوں میں

علم کی لذت محض حواسِ خمسہ کی لذت سے بلند ہے۔علم و معرفت کا لطف ذہنی، روحانی اور فکری لطف ہے، جو عام جسمانی لذتوں سے کہیں زیادہ گہرا اور پائیدار ہے۔

شعر29 رکھتا ہوں اپنے طالبِ صادق کو شاد کام

مائل کوئی مرا ہے تو اُس پر فدا ہوں میں

جو شخص اخلاص اور سچی طلب کے ساتھ علم حاصل کرتا ہے، علم اسے محروم نہیں کرتا۔علم اپنے مخلص طالب کو کامیابی، شعور اور عزت عطا کرتا ہے۔

شعر30 رہتا ہوں مثلِ مردمکِ چشم آنکھ میں

مٹتا نہیں ہوں دل سے، وہ نقشِ وفا ہوں میں

حاصل شدہ حقیقی علم انسان کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔جس طرح آنکھ کی پتلی آنکھ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اسی طرح علم انسان کے ذہن اور دل میں راسخ ہو جاتا ہے اور آسانی سے مٹتا نہیں۔

شعر31 ہر ملک، ہر دیار میں عالم کی قدر ہے

سارا زمانہ دوست ہے، گر آشنا ہوں میں

عالم اور صاحبِ علم کی قدر ہر معاشرے میں کی جاتی ہے۔علم انسان کے لیے ایسی دولت ہے جو اسے ہر جگہ عزت اور قبولیت دلا سکتی ہے۔

شعر32 بوڑھوں میں رکھتا ہوں میں جوانوں کی آن بان

وہ ہاتھ ناتواں نہیں، جس میں عصا ہوں میں

علم بڑھاپے میں بھی انسان کو ذہنی قوت، وقار اور سرگرمی عطا کرتا ہے۔علم کو عصا سے تشبیہ دی گئی ہے جو کمزور انسان کو سہارا دیتا ہے۔جسم کمزور ہو سکتا ہے، مگر علم ذہنی توانائی قائم رکھتا ہے۔

شعر33 مفلس نہیں رہا کہیں طالب کوئی مرا

میں کوہِ زر ہوں، کانِ گہر، کیمیا ہوں میں

علم سب سے بڑی دولت ہے۔جو شخص علم حاصل کر لیتا ہے وہ حقیقی معنوں میں مفلس نہیں رہتا۔شاعر علم کو سونے کے پہاڑ، موتیوں کی کان اور کیمیا سے تشبیہ دیتا ہے تا کہ اس کی بے پایاں قدر واضح ہو۔

شعر34 اقبال جس کو کہتے ہیں، پروردہ ہے مرا

کیا سای ؟ ہما ہے، ہما کا ہما ہوں میں

شاعر علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر اور شاعر کو بھی علم ہی کی پرورش کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ہما خوش بختی اور سعادت کی علامت ہے؛ علم کہتا ہے کہ میں محض ہما کا سایہ نہیں بلکہ خود ایسی عظیم نعمت ہوں جو انسان کو عزت و عظمت عطا کرتی ہے۔

شعر35 یورپ کو دیکھیے کہ ہے دولت سے مالا مال

وہ غوطہ زن ہے مجھ میں کہ بحرِ سخا ہوں میں

یورپ کی سائنسی، صنعتی اور اقتصادی ترقی کا بنیادی سبب علم سے اس کی وابستگی ہے۔یورپ نے علم کے سمندر میں غوطہ لگا کر دولت، قوت اور ترقی حاصل کی۔علم اپنی فیاضی کو ایک وسیع سمندر کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

شعر36 محتاج ہر ہنر ہے مرا اور ہر ایک فن

میں ابتدا کمال کی ہوں، انتہا ہوں میں

کوئی ہنر اور فن علم کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ہر مہارت کی ابتدا سیکھنے اور جاننے سے ہوتی ہے، اور مسلسل علم ہی اسے کمال تک پہنچاتا ہے۔اس لیے علم ہر فن کی بنیاد بھی ہے اور اس کے عروج کا وسیلہ بھی۔

شعر37 خاک، آب و باد و آتش سرکش بدیں جلال

سب میرے زیرِ حکم ہیں، فرمانروا ہوں میں

قدیم تصور کے مطابق خاک، پانی، ہوا اور آگ بنیادی عناصر ہیں۔انسان نے علم کی مدد سے فطرت کی ان قوتوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔شاعر اسے علم کی فرمانروائی سے تعبیر کرتا ہے۔

شعر38 رستے بنائے میں نے پہاڑوں کو چیر کر

ہمدم ذرا جو انجینئر کا ہوا ہوں میں

انجینئرنگ علم ہی کی عملی صورت ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر راستے، سرنگیں اور شاہراہیں بنانا انسانی علم اور ٹیکنالوجی کا کارنامہ ہے۔علم نے قدرتی رکاوٹوں پر قابو پانے میں انسان کی مدد کی ہے۔

شعر39 مثلِ زمیں بنے ہیں سمندر پہ شاہراہ

بیڑے کو خوف کیا ہے، اگر ناخدا ہوں میں

علم کی بدولت انسان نے بحری سفر کے اصول معلوم کیے، جہاز بنائے اور سمندروں کو آمد و رفت کے راستوں میں بدل دیا۔ جب علم رہنما ہو تو سمندر کی وسعت اور خطرات بھی انسان کو خوف زدہ نہیں کرتے۔

شعر40 ادنیٰ سا ہے کرشمہ، تعجب ہے اس میں کیا

لے کر اگر بشر کو ہوا میں اُڑا ہو

ہوائی جہاز کی ایجاد کو شاعر علم کا ایک کرشمہ قرار دیتا ہے۔جس چیز کا کبھی تصور بھی مشکل تھا، علم نے اسے ممکن بنا دیا اور انسان فضا میں پرواز کرنے لگا۔

شعر41 لونڈی ہے میری برق، بخارات ہیں غلام

دونوں سے تار، ریل کو چلوا رہا ہوں میں

بجلی اور بھاپ کی طاقت کو انسان نے علم کے ذریعے اپنے قابو میں کیا۔ ٹیلی گراف اور ریل جیسی ایجادات سائنسی علم کی بدولت وجود میں آئیں۔ شاعر مبالغے کے ساتھ برق اور بھاپ کو علم کے تابع قرار دیتا ہے۔

شعر42 ظاہر نظر فریب ہے، باطن ہے دلپذیر
ہر رنگ اور روپ میں جلوہ نما ہوں میں

علم کی مختلف شاخیں بظاہر ایک دوسرے سے جدا دکھائی دیتی ہیں، مگر ان سب کی بنیاد جستجوئے حقیقت ہے۔ علم سائنس، فلسفہ، ادب اور فن سمیت بے شمار صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

شعر43 موجود ہر الاپ میں ہوں، ہر خیال میں
ہوں شاعری کہیں تو کہیں فلسفہ ہوں میں

علم صرف سائنس تک محدود نہیں۔ موسیقی، شاعری، فکر اور فلسفے میں بھی علم موجود ہے۔ انسانی تخلیقی صلاحیت کی ہر صورت کسی نہ کسی علم اور شعور سے وابستہ ہے۔

شعر44 میں ہوں کہیں نقوشِ ریاضی میں جلوہ گر
منطق کے سلسلوں میں کہیں بولتا ہوں میں

ریاضی اور منطق علم کی اہم شاخیں ہیں۔ کہیں علم اعداد، اشکال اور فارمولوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے اور کہیں استدلال اور منطقی اصولوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔

شعر45 پیدا کروں میں شیکسپیر اور والمیک
ہے لطف گر معاونِ طبعِ رسا ہوں میں

علم جب بلند تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ملتا ہے تو عظیم ادیب، شاعر، مفکر اور فن کار پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر شیکسپیر اور دوسرے بڑے اہلِ فن کی مثال دے کر واضح کرتا ہے کہ فطری صلاحیت کو نکھارنے میں علم بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

شعر46 اظہارِ امرِ واقعی نے مجبور کر دیا
ورنہ نہ خود فروش، نہ کچھ خود نما ہوں میں

آخر میں علم کہتا ہے کہ میں نے اپنی اتنی تعریف خودنمائی یا غرور کی وجہ سے نہیں کی۔ حقیقتِ حال بیان کرنے کی ضرورت نے مجھے اپنی اہمیت اور کارنامے خود بیان کرنے پر مجبور کیا ہے۔ یوں شاعر نظم کے اختتام پر علم کی عظمت کے بیان کو خودستائی کے اعتراض سے بھی پاک کر دیتا ہے۔

9.2.2: نظم ''علم'' کی فنی خصوصیات

تلوک چند محروم کی نظم ,, علم'' موضوع، اسلوب اور اظہار کے اعتبار سے ایک کامیاب مقصدی نظم ہے۔ اس کی سب سے اہم فنی خصوصیت تشخیص یا Personification ہے۔ شاعر نے علم کو ایک جاندار، باشعور اور متکلم شخصیت بنا دیا ہے جو خود اپنی داستان بیان کرتی ہے۔ پوری نظم میں ,, میں'' کا صیغہ اسی فنی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ نظم کی ابتدا ایک رباعی نما تمہید سے ہوتی ہے جس میں شاعر خود خاموش ہو جاتا ہے اور علم کو گفتگو کا موقع دیتا ہے۔ اس کے بعد نظم ایک مسلسل خودکلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طریق؟ اظہار سے نظم میں ڈرامائی کیفیت اور دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ نظم میں ردیف ,, ہوں میں'' نمایاں طور پر استعمال ہوئی ہے اور اس سے کلام میں صوتی آہنگ اور تسلسل پیدا ہوا ہے۔ ,, شفا، صبا، فزا، نیا، سما، ماسوا، صفا، رہنما، پتا، خدا، سوا، نما'' وغیرہ قافیوں کے باعث نظم میں غزل جیسی موسیقیت بھی محسوس ہوتی ہے، اگرچہ موضوع اور تسلسل کے اعتبار سے یہ ایک مسلسل نظم ہے۔ شاعر نے تشبیہ، استعارہ اور پیکر تراشی سے بھرپور کام لیا ہے۔ علم کو ساغرِ آبِ بقا، خاکِ شفا، ابرِ بہار، نسیمِ صبا، خورشیدِ معرفت، چراغ، رہنما، آفتابِ حقیقت نما، کوہِ زر، کانِ گہر، کیمیا اور بحرِ سخا جیسے پیکروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ ان استعارات نے علم کی مختلف جہتوں کو مؤثر انداز میں نمایاں کیا ہے۔

نظم میں تلمیح اور تہذیبی حوالوں کا بھی استعمال ملتا ہے۔ انبیا، اقبال، ہما، ہندوستان، یونان، مصر، گنگا، ہمالہ اور یورپ کے ذکر سے نظم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ شاعر علم کی تاریخ کو صرف کسی ایک قوم یا دور تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے پوری انسانی تہذیب کے سفر سے جوڑ دیتا ہے۔ ایک اور اہم خوبی قدیم و جدید کا امتزاج ہے۔ ایک طرف معرفت، انبیا، قربِ خدا، نورِ ازل اور حقیقت جیسے روحانی تصورات ہیں تو دوسری طرف انجینئر، ریل، برق، بھاپ، ہوائی سفر، ریاضی اور منطق جیسے جدید علمی اور سائنسی حوالہ جات ہیں۔ اس طرح شاعر علم کے روحانی، اخلاقی، ادبی، فلسفیانہ اور سائنسی پہلوؤں کو ایک ہی نظم میں سمیٹتا ہے۔ زبان شستہ، ادبی اور فارسی آمیز ہے۔ طلسم خان امکاں، نورِ جبینِ ازل، خورشیدِ معرفت، طریقِ صفا، رسائیِ دانش، آفتابِ حقیقت نما، طالبِ صادق اور نقوشِ ریاضی جیسی تراکیب نظم کو ادبی وقار عطا کرتی ہیں۔ اس کے باوجود مرکزی خیال واضح ہے اور اشعار کا مفہوم تدریسی نقطہ نظر سے قابلِ فہم رہتا ہے۔ نظم میں مبالغہ بھی ایک مؤثر فنی وسیلہ ہے، مثلاً علم کا اپنے آپ کو آفتاب سے بلند، کوہِ زر، کانِ گہر، کیمیا اور فطری عناصر کا فرمانروا کہنا۔ یہ مبالغہ محض لفظی آرائش نہیں بلکہ علم کی بے پناہ قوت اور انسانی تہذیب پر اس کے اثرات کو واضح کرنے

کے لیے استعمال ہوا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے نظم علم کی عظمت، علم و معرفت، تہذیبی ترقی، سائنسی ایجادات، انسانی فلاح، قومی بیداری اور جہالت کے خلاف جدوجہد کا جامع اظہار ہے۔ شاعر کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ فرد اور قوم کی حقیقی ترقی علم سے وابستہ ہے۔ جس معاشرے میں علم کی قدر، تحقیق، محنت اور اہلِ علم کا احترام موجود ہو، وہ معاشرہ ترقی کرتا ہے؛ اور جہاں جہالت، سستی اور غرور غالب ہوں، وہاں زوال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

9.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال 1: نظم "علم" کے آغاز میں شاعر نے کس صنفِ سخن کو اختیار کیا ہے؟

(الف) مرثیہ (ب) رباعی

(ج) قصیدہ (د) غزل

سوال 2: نظم کے آغاز میں شاعر نے کس کو اپنی کہانی خود سنانے کا موقع دیا ہے؟

(الف) انسان کو (ب) فطرت کو

(ج) علم کو (د) زمانے کو

سوال 3: علم نے اپنے آپ کو عارف کے لیے کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

(الف) نسیمِ صبا (ب) خورشیدِ معرفت

(ج) ابرِ بہار (د) خاکِ شفا

سوال 4: شاعر کے مطابق علم کو کن چیزوں سے نفرت ہے؟

(الف) محبت اور محنت سے (ب) غرور، کبر اور کاہلی سے

(ج) ادب اور فلسفے سے (د) سائنس اور تحقیق سے

سوال 5: نظم میں علم کی بدولت یورپ کی کس چیز کو نمایاں کیا گیا ہے؟

(الف) زراعت (ب) مادی اور سائنسی ترقی

(ج) شاعری (د) مذہبی ترقی

9.4: عمومی جائزہ

تلوک چند محروم کی نظم ''علم'' ایک مقصدی، اصلاحی اور فکری نظم ہے جس میں شاعر نے علم کی عظمت، افادیت، وسعت اور انسانی زندگی میں اس کی بنیادی اہمیت کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کے آغاز میں شاعر اپنی قوتِ بیان کو علم کی عظمت بیان کرنے سے قاصر سمجھتا ہے، اس لیے وہ خود خاموش ہو جاتا ہے اور علم کو ایک جاندار کردار بنا کر اپنی داستان خود سنانے کا موقع دیتا ہے۔ علم اپنے آپ کو زندگی بخشنے والی قوت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسی کی بدولت زندگی میں حسن، رنگ، خوشبو، تازگی اور ترقی پیدا ہوتی ہے۔ علم انسان کو جہالت اور گمراہی سے نکال کر حقیقت، معرفت اور شعور کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ وہ انسان کے لیے چراغِ راہ اور رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو اپنی علمی حدود کا احساس دلاتا ہے۔ اسی لیے یہ جاننا بھی علم ہے کہ انسان بہت سی حقیقتوں سے ناواقف ہے۔

شاعر علم کو انبیا کی میراث اور قربِ خدا کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ سورج ظاہری دنیا کو روشن کرتا ہے، لیکن علم انسان کے دل و دماغ کو روشن کرتا اور حقیقت کے پوشیدہ پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔ علم کسی ایک ملک یا قوم کا سرمایہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔ وہ اسی جگہ پھلتا پھولتا ہے جہاں اس کی قدر کی جاتی ہے، محنت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اہلِ علم کو عزت ملتی ہے۔ نظم میں ہندوستان کی قدیم علمی عظمت کا بھی ذکر ہے۔ علم ہندوستان کو اپنی قدیم پرورش گاہ قرار دیتا اور گنگا و ہمالہ سے اپنی وابستگی ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ یونان، مصر اور یورپ کا ذکر کر کے علم کے تاریخی سفر کو واضح کیا گیا ہے۔ شاعر کو اس بات کا افسوس ہے کہ ہندوستان کبھی علم و حکمت کا مرکز تھا لیکن بعد میں اس کی علمی عظمت کم ہو گئی، جبکہ یورپ نے علم اور سائنس کو اپنا کر ترقی حاصل کی۔

نظم کے آخری حصے میں علم کی سائنسی اور عملی قوت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ پہاڑوں کو چیر کر راستے بنانا، سمندروں کو عبور کرنا، جہاز رانی، ہوائی سفر، بجلی، بھاپ اور ریل جیسی ایجادات سب علم کے ثمرات ہیں۔ شاعر یہ بھی واضح کرتا ہے کہ علم صرف سائنس تک محدود نہیں بلکہ شاعری، فلسفہ، ریاضی، منطق اور دوسرے تمام علوم و فنون میں جلوہ گر ہے۔ مجموعی طور پر نظم کا پیغام یہ ہے کہ علم انسان کی سب سے بڑی دولت، قوموں کی ترقی کا ذریعہ اور جہالت کی تاریکی دور کرنے والی روشنی ہے۔

9.5: فرہنگ

شیوہ بیانی	بیان کرنے کا انداز

طبعِ رواں	روانی رکھنے والی شاعرانہ طبیعت
ساغرِ آبِ بقا	حیاتِ جاوداں کا جام
آزارِ مرگ	موت کی تکلیف
خاکِ شفا	شفا دینے والی مٹی
طلسم خانہ امکاں	امکانات سے بھری ہوئی دنیا
حیرت فزا	حیرت بڑھانے والا
عالمِ ایجاد	ایجادات کی دنیا
نورِ جبینِ ازل	ازلی نور، ابدی روشنی
خورشیدِ معرفت	معرفت کا سورج
ماسوا	خدا کے سوا باقی سب کچھ
طریقِ صفا	پاکیزگی کا راستہ
رسائیِ دانش	عقل و علم کی پہنچ
میراثِ انبیا	پیغمبروں کی وراثت
حقیقت نما	حقیقت دکھانے والا
بادیہ گرد	صحرا میں گھومنے والا
قدرداں	قدر کرنے والا
طالبِ صادق	سچا علم کا طالب
کانِ گہر	موتیوں کی کان
بحرِ سخا	سخاوت کا سمندر

9.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

1 تلوک چند محروم کی نظم ''علم'' کا مرکزی خیال تفصیل سے بیان کیجیے۔

2 نظم ''علم'' کی روشنی میں علم کی عظمت اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت پر بحث کیجیے۔

3 تلوک چند محروم نے ہندوستان کی قدیم علمی عظمت اور یورپ کی جدید ترقی کو کس انداز میں پیش کیا ہے؟

4 نظم ''علم'' میں سائنسی ترقی اور جدید ایجادات کے حوالے سے علم کی قوت کو واضح کیجیے۔

5 نظم ''علم'' کی فنی اور اسلوبی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

9.7: مشقی سوالات

1 شاعر نے علم کو ''خورشیدِ معرفت'' اور ''آفتابِ حقیقت نما'' کیوں کہا ہے؟

2 نظم کے مطابق علم کن انسانی برائیوں کو ناپسند کرتا ہے؟

3 ہندوستان کے ساتھ علم کے تعلق کو شاعر نے کن حوالوں سے بیان کیا ہے؟

4 نظم میں علم کی بدولت ہونے والی اہم سائنسی ایجادات اور ترقیات کا ذکر کیجیے۔

5 علم کو ''کوہِ زر، کانِ گہر اور کیمیا'' کہنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

9.8: جوابات سرگرمی

(ب) تلوک چند محروم

(ج) علم کو

(ب) خورشیدِ معرفت

(ب) غرور، کبر اور کاہلی سے

(ب) مادی اور سائنسی ترقی۔

9.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: شاعر نے علم کو ''خورشیدِ معرفت'' اور ''آفتابِ حقیقت نما'' کیوں کہا ہے؟

جواب: شاعر نے علم کو ''خورشیدِ معرفت'' اس لیے کہا ہے کہ جس طرح سورج دنیا کی تاریکی دور کر کے اشیا کو روشن کر دیتا ہے، اسی طرح علم انسان کے ذہن و دل سے جہالت کی تاریکی دور کر کے اسے معرفت اور شعور عطا کرتا ہے۔ اسی طرح ''آفتابِ حقیقت نما'' سے مراد یہ ہے کہ علم انسان کو حقائق کا ادراک کراتا، کائنات کے پوشیدہ رازوں سے آگاہ کرتا اور صحیح و غلط میں فرق کرنا سکھاتا ہے۔ سورج صرف ظاہری اشیا کو روشن کرتا ہے، جبکہ علم ظاہری اور باطنی دونوں حقیقتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

سوال2: نظم کے مطابق علم کن انسانی برائیوں کو ناپسند کرتا ہے؟

جواب: نظم کے مطابق علم کو غرور، کبر اور کاہلی سے سخت نفرت ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے عاجزی، محنت، جستجو، مستقل مزاجی اور سچی لگن ضروری ہیں۔ جو انسان خود کو سب کچھ جاننے والا سمجھتا ہے یا سستی اور غفلت کا شکار رہتا ہے وہ علم کی حقیقی دولت حاصل نہیں کر سکتا۔ شاعر یہ پیغام دیتا ہے کہ علمی ترقی کے لیے انسان کو غرور ترک کر کے محنت اور تحقیق کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

سوال3: ہندوستان کے ساتھ علم کے تعلق کو شاعر نے کن حوالوں سے بیان کیا ہے؟

جواب: تلوک چند محروم نے ہندوستان کو علم کی قدیم پرورش گاہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ علم خود کہتا ہے کہ اس نے اس ملک میں مدتیں گزاری ہیں اور گویا اسی سرزمین میں پرورش پائی ہے۔ شاعر گنگا کے کناروں اور ہمالہ کی چوٹیوں کو علم کی سیرگاہ قرار دیتا ہے۔ وہ ہندوستان کے قدیم علمی عروج کو یاد کرتے ہوئے اس کے ماضی پر فخر کرتا ہے، لیکن موجودہ علمی زوال پر افسوس بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح شاعر ہندوستان کی قدیم علمی اور تہذیبی عظمت کو نمایاں کرتا ہے۔

سوال4: نظم میں علم کی بدولت ہونے والی اہم سائنسی ایجادات اور ترقیات کا ذکر کیجیے۔

جواب: نظم کے آخری حصے میں شاعر نے علم کی سائنسی قوت کو بہت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ علم کی مدد سے انسان نے پہاڑوں کو چیر کر راستے بنائے، سمندروں پر جہاز چلائے اور فضا میں پرواز کرنے کے قابل ہوا۔ انسان نے بجلی اور بھاپ کی قوت کو اپنے کام میں لایا اور ریل، تار اور دوسرے ذرائعِ مواصلات ایجاد کیے۔ ان مثالوں کے ذریعے شاعر واضح کرتا ہے کہ جدید تہذیب، انجینئرنگ، آمد و رفت اور سائنسی ترقی کی اصل بنیاد علم ہے۔

9.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 10 حلقہ اربابِ ذوق اور نظمِ جدید

ساخت

10.0 اغراض ومقاصد

10.1 تعارف

10.2 حلقہ اربابِ ذوق کا پس منظر

10.2.1 حلقہ اربابِ ذوق اور نظمِ جدید

10.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

10.4 عمومی جائزہ

10.5 فرہنگ

10.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

10.7 مشقی سوالات

10.8 جوابات سرگرمی

10.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

10.9 امدای کتب

10.0 :اغراض ومقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو اردو ادب کی اہم ادبی تحریک حلقہ اربابِ ذوق کے قیام، پس منظر، ادبی نظریات اور اردو نظمِ جدید کے

فروغ میں اس کی خدمات سے روشناس کرانا ہے۔ اردو شاعری کی جدید تشکیل میں حلقہ اربابِ ذوق نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس لیے اس سبق کے مطالعے کے ذریعے آپ کو یہ سمجھنے کا موقع فراہم کرنا مقصود ہے کہ بیسویں صدی میں بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور فکری حالات نے اردو شاعری، بالخصوص جدید نظم، کو کس طرح متاثر کیا اور حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ شعراء نے ان تبدیلیوں کو اپنے تخلیقی تجربات کا حصہ کس انداز سے بنایا۔ اس سبق کا ایک اہم مقصد آپ کو حلقہ اربابِ ذوق کے قیام اور اس کے ادبی ماحول سے واقف کرانا بھی ہے تاکہ آپ اس ادبی تنظیم کے تاریخی پس منظر کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کسی ایک مخصوص سیاسی یا سماجی نظریے کی پابندی کے بجائے ادب کی تخلیقی آزادی، انفرادی تجربے اور فن کی داخلی قدروں کو اہمیت دیتا تھا۔ حلقے سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے تخلیق کار کے شخصی احساسات، باطنی کیفیات، نفسیاتی پیچیدگیوں اور جمالیاتی تجربات کو ادب میں اظہار کا حق دینے پر زور دیا۔

سبق کے مطالعے سے آپ اردو نظم کے روایتی اور جدید تصورات کے درمیان فرق کو سمجھ سکیں گے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جدید نظم کے شعراء نے صرف موضوعات ہی میں تبدیلی پیدا نہیں کی بلکہ نظم کی ہیئت، زبان، اسلوب، علامت، استعارے، پیکر تراشی اور طرزِ اظہار میں بھی نئے تجربات کیے۔ آپ کو نظمِ معریٰ، آزاد نظم اور جدید علامتی نظم کے ارتقاء کے بارے میں بنیادی آگہی فراہم کرنا بھی اس سبق کے مقاصد میں شامل ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ اہم شاعروں اور ادیبوں کی ادبی خدمات سے بھی واقف ہوں گے اور یہ سمجھ سکیں گے کہ جدید اردو نظم میں انفرادی احساس، تنہائی، وجودی مسائل، انسانی نفسیات، حسن و عشق، زندگی اور موت، خواب و حقیقت اور جدید عہد کے تہذیبی مسائل جیسے موضوعات کو کس طرح شعری اظہار عطا کیا گیا۔ اس طرح یہ سبق آپ میں جدید اردو شاعری کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی، تنقیدی اور تجزیاتی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

10.1: تعارف

بیسویں صدی اردو ادب میں فکری، فنی اور اسلوبی تبدیلیوں کا ایک اہم دور ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ ایک طرف آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی تو دوسری طرف مغربی تعلیم، جدید فلسفے، نفسیات اور عالمی ادب کے اثرات اردو ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں پر مرتب ہو رہے تھے۔ ان حالات کے نتیجے میں اردو ادب میں نئی ادبی تحریکوں اور رجحانات نے جنم لیا۔ انہی میں حلقہ اربابِ ذوق ایک ایسی اہم ادبی تنظیم کے طور پر سامنے آیا جس نے بالخصوص اردو کی جدید شاعری اور نظم کے فکری و فنی ارتقا

میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔

حلقہ اربابِ ذوق کا آغاز لاہور میں 1939ء میں ہوا۔ ابتدا میں ادیبوں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کی ایک مختصر سی محفل کی صورت میں اس کی بنیاد پڑی لیکن جلد ہی اس نے ایک منظّم ادبی انجمن کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے اجلاسوں میں نئی تخلیقات پیش کی جاتیں، ان پر آزادانہ گفتگو ہوتی اور ادبی و فنی خوبیوں اور خامیوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ اس طرح حلقے نے ادب میں صحت مند تنقیدی روایت، تخلیقی آزادی اور نئے ادبی تجربات کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق ایسے زمانے میں وجود میں آیا جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک بھی خاصی فعال تھی۔ ترقی پسند ادیب عموماً ادب کو سماجی تبدیلی، طبقاتی شعور اور معاشرتی مسائل کے اظہار کا ایک مؤثر وسیلہ تصور کرتے تھے۔ اس کے برعکس حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ ادیبوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب کو کسی ایک سیاسی، سماجی یا نظریاتی مقصد کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک تخلیق کار کو اپنے داخلی تجربات، انفرادی احساسات، نفسیاتی کیفیات اور جمالیاتی تصورات کے اظہار کی مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ اسی تصور نے حلقہ اربابِ ذوق کو اردو ادب میں ایک الگ فکری اور تخلیقی شناخت عطا کی۔

حلقہ اربابِ ذوق نے بالخصوص نظمِ جدید کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس سے وابستہ شعرا نے روایتی شاعری کے موضوعات اور مقررہ ہیئتوں سے آگے بڑھ کر زندگی کے نئے تجربات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ انسانی شخصیت کے باطنی مسائل، تنہائی، خوف، اضطراب، محبت، شکستِ خواب، زندگی کی بے معنویت، جدید تہذیب کی پیچیدگیاں اور انسان کے داخلی تضادات جدید نظم کے اہم موضوعات قرار پائے۔ ان موضوعات کے اظہار کے لیے شعرا نے زبان و بیان کے نئے امکانات تلاش کیے اور علامت، استعارے، تمثیل، پیکر تراشی اور نئے شعری اسالیب سے بھرپور استفادہ کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے ادبی ماحول نے اردو نظم کو روایتی پابندیوں سے نکل کر نئے فنی تجربات کی طرف بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ جدید شاعروں نے نظم کی ہیئت میں بھی تجربات کیے اور نظمِ معریٰ اور آزاد نظم جیسی صورتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں شاعر کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے تجربے اور احساس کو موضوع کی مناسبت سے زیادہ آزاد اور فطری انداز میں پیش کر سکے۔ چنانچہ جدید نظم محض خارجی واقعات کے بیان تک محدود نہ رہی بلکہ انسانی ذہن اور باطن کی پیچیدہ دنیا کی ترجمان بن گئی۔

حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ یا اس کے ادبی ماحول سے متاثر ہونے والے شعرا میں ن۔م۔ راشد، میراجی، قیوم نظر، مختار صدیقی، یوسف ظفر اور دوسرے اہم تخلیق کاروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بالخصوص ن۔م۔ راشد اور میراجی نے جدید اردو نظم کو نئی فکری وسعت اور فنی جہت عطا کی۔ ان شعراء نے جدید انسان کے ذہنی و نفسیاتی مسائل، تہذیبی کشمکش اور داخلی تجربات کو ایسے اسلوب میں پیش کیا جس نے اردو نظم کی روایت

میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔

حلقہ اربابِ ذوق کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے کسی ایک ادبی نظریے کو حرفِ آخر قرار دینے کے بجائے تخلیق، تجربے اور آزاد تنقید کو اہمیت دی۔ حلقے کے اجلاسوں میں تخلیق کار اپنی نظم، افسانہ یا دوسری ادبی تحریر پیش کرتا اور حاضرین اس پر بے تکلف تنقیدی گفتگو کرتے تھے۔ اس روایت نے نئے لکھنے والوں کی تربیت، ادبی شعور کی نشوونما اور اردو ادب میں تنقیدی مکالمے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح حلقہ اربابِ ذوق کو اردو ادب، بالخصوص جدید اردو نظم کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس نے اردو شاعری کو موضوع، ہیئت، زبان اور اسلوب کی سطح پر نئے تجربات سے آشنا کیا اور شاعر کو اپنے انفرادی اور باطنی تجربات کے اظہار کے لیے وسیع تر تخلیقی فضا فراہم کی۔ اردو نظم کو جدید ذہن، جدید احساس اور نئے فنی وسائل سے ہم آہنگ کرنے میں حلقہ اربابِ ذوق کی خدمات نہایت اہم ہیں۔ اسی لیے جدید اردو نظم کے ارتقا اور اس کی فکری و فنی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے حلقہ اربابِ ذوق کے پس منظر، نظریات اور ادبی خدمات کا مطالعہ ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔

10.2: حلقہ اربابِ ذوق کا پس منظر

اردو ادب کی تاریخ میں مختلف ادبی تحریکوں اور رجحانات نے اپنے اپنے عہد کے ادبی شعور، فکری میلانات اور تخلیقی رویوں کو متاثر کیا ہے۔ بیسویں صدی خصوصاً اردو ادب کے لیے فکری اور فنی اعتبار سے بڑی تبدیلیوں کا زمانہ تھی۔ اس دور میں ایک طرف ترقی پسند تحریک نے ادب کو سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے وابستہ کیا اور اجتماعی زندگی کے دکھ درد کو ادب کا موضوع بنایا تو دوسری طرف ایک ایسے ادبی رجحان نے جنم لیا جس نے انسانی شخصیت کے باطنی اور نفسیاتی پہلوؤں کو مرکزِ توجہ بنایا۔ اس رجحان نے ادب کو فقط خارجی حقیقتوں کی ترجمانی تک محدود رکھنے کے بجائے انسانی باطن، داخلی کرب، نفسیاتی پیچیدگیوں، انفرادی تجربات، علامت، ابہام اور تجرید کی دنیا سے روشناس کرایا۔ یہ رجحان آگے چل کر حلقہ اربابِ ذوق کی صورت میں اردو ادب کی ایک اہم اور مؤثر تحریک بن کر سامنے آیا۔

حلقہ اربابِ ذوق کا آغاز 1939ء میں لاہور میں ہوا۔ اس حلقے نے اردو ادب، بالخصوص اردو نظم نگاری میں ایسے نئے فکری اور فنی امکانات پیدا کیے جنھوں نے جدید اردو نظم کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے شعراء نے روایتی نظم کے پابند سانچوں سے آگے بڑھ کر آزاد نظم اور نظمِ معریٰ کے تجربات کو فروغ دیا۔ انہوں نے نظم کو موضوع، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے زیادہ آزاد اور وسیع بنایا۔ اس تحریک کا بنیادی امتیاز یہ تھا کہ اس نے انسان کو صرف ایک سماجی اور سیاسی وجود کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اس کی داخلی زندگی، اس کے احساسات،

جذبات، خوابوں، خوف، تنہائی، خواہشات اور نفسیاتی الجھنوں کو بھی ادب کا اہم موضوع قرار دیا۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک طوفانی تحریک تھی جس نے اپنے عہد کے ادبی اور سماجی ماحول کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس تحریک نے اپنے دور کے بکھرے ہوئے غیر اہم اور منتشر عناصر کو بھی اپنے اثر میں لے لیا اور معاشرے کی بیرونی یا اجتماعی زندگی میں تبدیلی اور حرکت کے عمل کو تیز کر دیا۔ بلاشبہ اس تحریک میں روشن مستقبل کی طرف لپکنے کا رجحان بھی موجود تھا اور اس نے انسان کو ظلم، استحصال، غربت، طبقاتی کشمکش اور سیاسی جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیا۔ ترقی پسند ادیبوں نے ادب کو زندگی کی اجتماعی جدوجہد سے وابستہ کیا اور انقلاب و تبدیلی کے مخصوص نظریات کے فروغ کے لیے ادب کو ایک مؤثر ذریعہ بنایا۔ تاہم اس تحریک کے متوازی ایک ایسا ادبی رجحان بھی مائل بہ عمل ہوا جس نے سماجی جمود کے ساتھ ساتھ ادبی انجماد کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس رجحان نے نہ صرف زندگی کے خارج کو اہمیت دی بلکہ انسان کے داخل کی پراسرار آواز کو بھی بگوشِ ہوش سنا۔ یہی رجحان حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔

ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کو اکثر ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے، لیکن دونوں تحریکوں کے تعلق کو محض مخالفت کی بنیاد پر سمجھنا درست نہیں۔ دونوں تقریباً ایک ہی عہد کے سماجی اور معاشی حالات میں پیدا ہوئیں اور دونوں نے اردو ادب میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ حلقہ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک ایک دوسرے کی ضد قرار دیے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مادیات اور روحانیت، داخلیت اور خارجیت، مستقیم ابلاغ اور غیر مستقیم ابلاغ کی بنیاد پر ان تحریکوں میں واضح حدودِ اختلاف موجود ہیں۔ تاہم دونوں تحریکیں تقریباً ایک جیسے سماجی اور معاشی حالات اور ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئیں، پروان چڑھیں اور معنوی طور پر رومانیت کے بطن سے ہی پھوٹی تھیں۔ حقیقت نگاری سے امتزاج کی بنا پر ترقی پسند تحریک نے افقی جہت اختیار کی اور اجتماعی عمل کو مادی سطح پر بروئے کار لانے کی کوشش کی، جبکہ حلقہ اربابِ ذوق نے عمودی جہت اختیار کی اور اجتماع میں گم ہو جانے کے بجائے ابنِ آدم کو اپنی شخصیت کے عرفان کی طرف متوجہ کیا۔ یہی بنیادی فرق دونوں تحریکوں کی شعریات کو بھی ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے خارجیت اور اجتماعیت پر زور دیا، جبکہ حلقہ اربابِ ذوق کے ادیبوں اور شاعروں نے انسان کو اپنی ذات اور شخصیت کی طرف متوجہ کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کی شاعری میں داخلی کیفیات، احساسات، جذبات، نفسیاتی تجربات اور انسانی وجود کے پیچیدہ مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ اس تحریک کے نزدیک ادب کسی سیاسی یا سماجی نظریے کی تشہیر کا محض ذریعہ نہیں تھا بلکہ انسانی تجربے کی گہرائی اور انفرادیت کو دریافت کرنے کا وسیلہ بھی تھا۔

حلقہ اربابِ ذوق کے آغاز کی تاریخ 29 اپریل 1939ء سے وابستہ ہے۔ اس روز سید نصیر احمد جامعی نے اپنے چند دوستوں کو ایک ادبی

نشست کے لیے مدعو کیا۔ ان دوستوں میں نسیم حجازی، تابش صدیقی، محمد فاضل، اقبال احمد، محمد سعید اور دیگر ادیب شامل تھے۔ اس دعوت کو ایک ادبی محفل کا رنگ دیا گیا اور اس کی صدارت حفیظ ہوشیار پوری کو سونپی گئی۔ اس ابتدائی نشست میں نسیم حجازی نے اپنا تقریباً پینتیس صفحات پر مشتمل افسانہ ''تلافی'' پڑھ کر سنایا۔ افسانے کے بعد شرکائے محفل نے اس پر اپنی اپنی آرا پیش کیں اور ایک آزاد اور بے تکلف ادبی ماحول پیدا ہوا۔ اس نشست کی کامیابی نے شرکا کو اس قسم کی ادبی محفلوں کو باقاعدگی سے جاری رکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ ابتدا میں اس محفل کا نام ''مجلسِ داستان گویان'' رکھا گیا لیکن جب اس کا دائرہ وسیع ہوا اور اس کی ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا تو اس کے لیے ایک موزوں اور جامع نام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بعدازاں اس ادبی اجتماع کے لیے ''لٹریری سرکل'' کا نام تجویز کیا گیا۔ لٹریری سرکل کا لغوی ترجمہ ''ادبی حلقہ'' بنتا تھا۔ ڈاکٹر محمد باقر کے بیان کے مطابق سب لوگ اس نام کے متقاضی تھے۔ ''حلقہ'' کا لفظ بار بار دہرایا گیا اور بالآخر ڈاکٹر محمد باقر کی تجویز پر اس تنظیم کا نام ''حلقہ اربابِ ذوق'' طے پایا۔ یہ نام نہ صرف اس ادبی تنظیم کی نوعیت کا عکاس تھا بلکہ اس کے بنیادی مزاج کی بھی ترجمانی کرتا تھا، کیونکہ یہاں ایسے افراد جمع ہوتے تھے جن کا رشتہ ادب اور ذوقِ ادب سے وابستہ تھا۔

حلقہ اربابِ ذوق کے قیام کے بنیادی مقاصد اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت، اردو لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت، نوجوان لکھنے والوں کی اصلاح و تعلیم، تخلیقات پر بے لاگ تنقید اور اردو ادب کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا تھے۔ حلقے کا سب سے نمایاں وصف اس کا آزاد اور غیر رسمی ادبی ماحول تھا۔ یہاں ادیبوں اور شاعروں کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع ملتا اور پھر ان تخلیقات پر کھل کر تنقید کی جاتی۔ اس تنقید کا مقصد محض خامیاں تلاش کرنا نہیں بلکہ تخلیقی صلاحیتوں کی اصلاح اور ادب کے معیار کو بلند کرنا تھا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے حلقہ اربابِ ذوق کے طریقِ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ حلقے کی ہر نشست میں نظمیں اور مضامین پڑھے جائیں گے اور ان کو سننے کے بعد ان پر بے لاگ تنقید کی جائے گی۔ حلقے کا جلسہ ہر ہفتے کسی ایک رکن کے مکان پر منعقد ہوتا اور میزبان کی ذمہ داری ہوتی کہ وہ شرکا کی تواضع کرے۔ حلقے کی رکنیت محدود رکھی جاتی اور ارکان کو اختیار ہوتا کہ وہ مناسب شخص کو حلقے کی رکنیت دیں۔ رکن بننے کے لیے کوئی چندہ یا فیس مقرر نہیں تھی۔ ہر سال کے لیے ایک سیکرٹری منتخب کیا جاتا، جبکہ حلقے کا کوئی مستقل صدر نہیں ہوتا تھا۔ اس غیر رسمی اور جمہوری طریقِ کار نے حلقہ اربابِ ذوق کو دیگر ادبی تنظیموں سے منفرد بنا دیا۔

ابتدائی زمانے میں حلقہ اربابِ ذوق کی مجالس ہر اتوار کو کسی نہ کسی رکن کے گھر منعقد ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں افسانے، نظمیں، غزلیں، مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین اور ناولوں کے ابواب پڑھے جاتے۔ ان تخلیقات پر آزادانہ اور بے لاگ تنقیدی گفتگو ہوتی اور

حاضرین ان مباحث سے ادبی اور فکری استفادہ کرتے۔ اس طرح حلقہ اربابِ ذوق محض ایک ادبی انجمن نہیں رہا بلکہ تخلیق اور تنقید کی ایک ایسی تجربہ گاہ بن گیا جہاں نئے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع ملا۔

حلقہ اربابِ ذوق کی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور اپریل 1939ء سے اگست 1940ء تک، یعنی ابتدا سے میراجی کی شمولیت تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دور بنیادی طور پر تعارفی نوعیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں حلقہ اپنی شناخت تشکیل دے رہا تھا اور اس کے بنیادی طریقِ کار اور ادبی مزاج کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس دور میں حلقے کی سرگرمیاں محدود تھیں لیکن یہی دور آگے چل کر ایک بڑی ادبی تحریک کی بنیاد بنا۔ حلقہ اربابِ ذوق کا دوسرا دور اگست 1940ء سے دسمبر 1940ء تک کا زمانہ ہے، جسے تشکیلی نوعیت کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ میراجی کی شمولیت نے حلقے کے ادبی مزاج اور سرگرمیوں کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ اس دور میں مضامین اور تخلیقات پر باقاعدہ تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور حلقے کی مجالس میں نئے ادبی اور شعری تجربات پیش کیے جانے لگے۔ میراجی کی شخصیت نے حلقے کو تخلیقی اور فکری اعتبار سے نئی سمت دی۔ ان کے ذریعے حلقہ اربابِ ذوق کی توجہ زیادہ نمایاں طور پر شاعری، بالخصوص جدید نظم کی طرف منتقل ہوئی۔

تیسرا دور دسمبر 1940ء سے 1947ء میں قیامِ پاکستان تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ حلقہ اربابِ ذوق کی تاریخ کا نہایت اہم اور فعال دور ہے۔ اس زمانے میں حلقے نے نئی نظم کی تحریک کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لفظ اور خیال کو علامتی اور اشارتی انداز میں پیش کر کے نظم کے مفاہیم میں گہرائی پیدا کی گئی۔ معنی کی معلوم اور روایتی حدود کو توڑ کر لفظ کے اندر پوشیدہ توانائی اور امکانات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس دور میں حلقے نے ادبی انجماد کو دور کرنے اور اردو شاعری کو جدید فکری اور فنی رجحانات سے روشناس کرانے میں اہم خدمات انجام دیں۔

اسی دور میں حلقہ اربابِ ذوق کی شاخیں دہلی، بمبئی اور کراچی میں بھی قائم ہوئیں۔ محمد حسن عسکری، تابش دہلوی، اکرام قمر اور مختار صدیقی جیسے ادیبوں اور شاعروں نے مختلف شہروں میں حلقے کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لیے ابتدائی کام کیا۔ میراجی لاہور سے دہلی اور پھر بمبئی منتقل ہوئے اور اپنے ساتھ حلقہ اربابِ ذوق کے تخلیقی مزاج اور فکری روح کو بھی ان علاقوں تک پہنچایا۔ اس طرح حلقہ اربابِ ذوق لاہور تک محدود نہ رہا بلکہ اردو ادب کی ایک وسیع تحریک کی صورت اختیار کرتا گیا۔

حلقہ؟ اربابِ ذوق کا چوتھا دور 1947ء سے مارچ 1972ء تک پھیلا ہوا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد حلقے کو نئے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دور کا سب سے اہم اور افسوس ناک واقعہ میراجی کی وفات تھی۔ میراجی کی وفات نے حلقہ؟ اربابِ ذوق کو گہرے طور پر متاثر کیا، کیونکہ وہ اس حلقے کی ایک مرکزی اور فعال شخصیت تھے۔ ان کی فکری اور تخلیقی شخصیت کے گرد حلقے کی بہت سی ادبی سرگرمیاں گردش

کرتی تھیں اور مختلف مزاج رکھنے والے ادیب بھی ان کی ادبی حیثیت کا احترام کرتے تھے۔ میراجی کی وفات کے بعد حلقہ ایک ایسی مرکزی شخصیت سے محروم ہو گیا جس نے اس کی فکری اور تخلیقی سمت کے تعین میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس دور میں حلقے پر بعض کمزوریاں بھی نمایاں ہونے لگیں۔ ہفتہ وار مجالس میں تنقید کا رخ بعض اوقات تخلیقی اور علمی بحث کے بجائے ذاتیات کی طرف مڑنے لگا اور انتظامی معاملات میں اختلافات پیدا ہوئے۔ تاہم اس کے باوجود حلقہ ؟ اربابِ ذوق نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور اردو ادب کی خدمت میں اپنا کردار ادا کرتا رہا۔ اس دور میں حلقہ ؟ اربابِ ذوق کا ایک اہم کارنامہ لاہور سے ''نئی تحریریں'' کا اجرا تھا۔ یہ ایک ایسا ادبی تجربہ تھا جس نے رسالے کو محض ایک وقتی جریدے کے بجائے کتاب جیسا وقار عطا کیا۔ حلقے نے عمومی طور پر نمود و نمائش سے گریز کیا اور ادیبوں کو مقبول بنانے کے بجائے تخلیقات کو اہمیت دینے کی کوشش کی۔

''نئی تحریریں'' بھی حلقہ اربابِ ذوق کی مجالس کی طرح آزادانہ اظہار کا ایک فریم تھا۔ اس میں دوسری زبانوں کے اہم فکری اور نظریاتی مضامین کے تراجم کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ اس کے ذریعے اردو ادب کے قارئین کو یورپی ادب اور جدید مغربی تنقیدی نظریات کے ایسے سرچشموں تک رسائی حاصل ہوئی جن سے اردو ادب پہلے پوری طرح روشناس نہیں تھا۔ ایلیٹ کے مضمون ''شاعری کی تین آوازیں'' کا ن۔م۔ راشد نے ترجمہ کیا، پال دلیری کے مضمون ''شاعری اور فکرِ مجرد'' کو محمد حسن عسکری نے اردو میں منتقل کیا اور سینٹ ہیو کے مضمون ''کلاسیک کیا ہے؟'' کا ترجمہ غلام یعقوب انور نے کیا۔ ان تراجم اور نظریاتی مباحث نے اردو ادب کے فکری دائرے کو وسیع کیا اور جدید شعری اور تنقیدی تصورات سے اردو کے ادیبوں کو روشناس کرایا۔ اس دور میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی سیاسی پابندیوں اور ادبی فضا میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں نے بھی حلقہ اربابِ ذوق کو بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر متاثر کیا۔ نظریاتی تنقید کے مقابلے میں علمی اور فنی تنقید کا رجحان نمایاں ہونے لگا۔ حلقہ اربابِ ذوق نے ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو خاص اہمیت دی اور تخلیق کو محض نظریاتی پیمانوں پر جانچنے کے بجائے اس کی داخلی ساخت، اسلوب، علامتی نظام اور جمالیاتی تاثیر کو بھی اہم قرار دیا۔

حلقہ اربابِ ذوق کی تاریخ کا پانچواں دور مارچ 1972ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ حلقے کی تقسیم نے اس کے استحکام اور ادبی اثر کو متاثر کیا۔ 1972ء سے 1975ء تک کے زمانے میں مختلف ادبی حلقوں نے پرانی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن ایک بڑے اور متحد ادبی کل سے کٹ جانے کے بعد ذاتی رنجشوں اور انتظامی اختلافات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اگرچہ ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہے اور ادب کا ایک مخصوص معیار قائم رکھنے کی کوشش بھی کی جاتی رہی، لیکن حلقہ اربابِ ذوق کو پہلے جیسا استحکام حاصل نہ ہو سکا۔

تقسیم کے بعد ایک دلچسپ صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ ایک حلقے کے ادیب دوسرے حلقے کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ بعض اوقات کوئی ادیب ایک حلقے میں غزل پڑھتا اور اسی روز دوسرے حلقے میں اپنی نظم پیش کرتا۔ بعض ممتاز ادیب اور دانش ور بھی بلا تخصیص دونوں حلقوں کی صدارت قبول کرتے۔ اس صورت حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظریاتی اور تنظیمی اختلافات کے باوجود دونوں حلقے ایک دوسرے کے حقیقی حریف نہیں بن سکے۔ تاہم تقسیم کے اس عمل نے حلقے کی اجتماعی قوت کو ضرور متاثر کیا اور اس کے نتیجے میں ادب میں نئے امکانات پیدا کرنے اور کسی بڑی ادبی سمت کی تشکیل کا عمل کمزور پڑ گیا۔

حلقہ اربابِ ذوق کا سب سے بڑا کارنامہ اردو نظم کی ترقی اور جدید نظم کے فروغ میں اس کا کردار ہے۔ اگرچہ حلقے کی ابتدا افسانہ خوانی سے ہوئی تھی، لیکن میراجی کی شمولیت کے بعد اس کا رخ بتدریج شاعری اور تنقید کی طرف ہو گیا۔ حلقے کے رفقا میں یوسف ظفر، قیوم نظر، تابش صدیقی اور خصوصاً میراجی کا شمار نئے شعری رجحانات کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا تھا۔ بعد میں ن۔م۔ راشد، اختر الایمان اور دوسرے جدید شعراء کے فکری اور فنی رجحانات نے بھی جدید اردو نظم کے ارتقا کو مزید مضبوط کیا۔

میراجی کو حلقہ اربابِ ذوق کی روحِ رواں اور اس کے بنیادی تخلیقی مزاج کی ایک اہم نمائندہ شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری میں داخلیت، نفسیاتی شعور، جنسی اور لاشعوری محرکات، علامتی اظہار اور نئے شعری تجربات کو فروغ دیا۔ ان کے یہاں انسانی باطن کی پیچیدگیاں اور تہہ داریاں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ انہوں نے نظم کو محض خارجی حقیقت کے بیان کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے انسانی ذہن اور روح کے پیچیدہ تجربات کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔ میراجی نے اپنی محبوبہ سے والہانہ اور بے لوث عشق کیا تھا۔ ان کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ انہیں اپنے عشق کے بدلے میں عشق اور چارہ گری ملے۔ وہ تو صرف عشق کا نغمہ روح کی گہرائیوں سے گانا چاہتے تھے۔ میراجی کا جذبہ سچا تھا۔ انہوں نے میرا سین سے عشق کیا اور بغیر کسی مطالبہ کے ساری زندگی اسی عشق میں غرق رہے۔ مثال کے لئے ان کی نظم ' 'نغمہ محبت ' ' سے چند اشعار پیش ہیں:

مجھے چاہے نہ چاہے دل تیرا تو مجھ کو چاہ بڑھانے دے اک پاگل پریمی کو اپنی چاہت کا نغمہ گانے دے

تو رانی پریم کہانی کی چپ چاپ کہانی سنتی جا

یہ پریم کی بانی سنتی جا پریمی کو گیت سنانے دے

تو دور اکیلی بیٹھی ہے سکھ سندرتا کی مستی میں
میں دور ہوا جاتا ہوں پریم کی ندی میں بہہ جانے دے
گر بھولے سے اس جذبے کا تو گیت جوابی گا بیٹھی!
یہ جادو سب مٹ جائے گا اس کو جوبن پر آنے دے

ن۔م۔راشد جدید اردو نظم کے ایک عظیم معمار ہیں۔انہوں نے آزاد نظم کو فکری اور فنی اعتبار سے استحکام بخشا اور اردو نظم کو ایک نئی زبان، نئے آہنگ اور نئے فکری امکانات سے روشناس کرایا۔ان کی شاعری میں انسانی آزادی، وجودی کشمکش، انفرادی تجربہ اور جدید انسان کی فکری الجھنیں نمایاں ہیں۔ن۔م۔راشد کی نظموں نے ثابت کیا کہ نظم پابند بحروں اور روایتی سانچوں کے بغیر بھی گہری موسیقیت ،فکری وحدت اور جمالیاتی تاثیر پیدا کرسکتی ہے۔

رہنے دے اب کھونہیں باتوں میں وقت اب رہنے دے
وقت کے اس مختصر لمحہ کو دیکھ تو اگر چاہے تو یہ بھی
جاوداں ہو جائے گا پھیل کر خود بے کراں ہو جائیگا مطمئن
باتوں سے ہو سکتا ہے کون؟
روح کی سنگین تاریکی کو دھو سکتا ہے کون؟

اختر الایمان بھی جدید اردو نظم کے اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی شاعری میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں، انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں، نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی تجربات ایک منفرد اور مؤثر انداز میں سامنے آتے ہیں۔ان کی نظموں میں داخلیت اور خارجیت کے درمیان ایک خاص توازن پایا جاتا ہے۔وہ علامت اور تجرید سے بھی کام لیتے ہیں،لیکن ان کے یہاں انسانی زندگی کی حقیقی فضا اور تجربے کی صداقت نمایاں رہتی ہے۔یوسف ظفر، قیوم نظر، تابش صدیقی اور مختار صدیقی نے بھی حلقہ اربابِ ذوق کے ادبی مزاج کی تشکیل اور جدید نظم کے فروغ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ان شعراء اور ادیبوں نے نئی نظم کے مختلف تجربات کو قبول کیا اور اردو شاعری کو نئے موضوعات، نئی زبان اور نئی ہیئتوں سے مالا مال کیا۔

قیوم نظر، میرا جی سے بے حد متاثر تھے۔اس لئے ان کے ابتدائی کلام میں میرا میرا جی جی کا رنگ نظر آتا ہے۔مگر یہاں بھی ان کا اپنا

اسلوب اظہار ہے۔ اگر چہ قیوم نظر نے میراجی کا اتباع کیا۔ لیکن انہیں تہذیبی مسائل کے ساتھ ساتھ، سیاسی اور سماجی مسائل سے بھی دلچسپی تھی۔ یہ مسائل اور موضوعات ان کی شاعری میں خاص طور پر ابھرتے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم "الجھن" کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:۔

یہ تیرگی
اور ہر گھڑی بڑھتی ہوئی
اس کی انوکھی دلکشی
جیسے سکوں کے بحر بے پایاں کی حامل ہے۔ یہی
دنیا کی منزل ہے یہی
یہ دن یہی
ہنگامہ آرائے بہار
بے آب چہروں کا نکھار
اڑتا ہے لے کر اس طرح انساں کی معنی خام کو
سہ کشمکش
یہ روشنی کی زندگی
یہ تیرگی کی دل کشی
کیا اک پریشاں خواب بن جائیں گے یہ دن یہ رات
جانے کہاں ہے کائنات

حلقہ اربابِ ذوق کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت آزاد نظم اور نظمِ معریٰ کا فروغ ہے۔ حلقے کے شعراء نے روایتی پابند نظموں کی اہمیت سے مکمل انکار نہیں کیا لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ جدید انسان کے پیچیدہ تجربات کے اظہار کے لیے روایتی شعری سانچے ہمیشہ کافی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے آزاد نظم، نظمِ معریٰ اور دوسری جدید ہیئتوں کے ذریعے اظہار کے نئے امکانات پیدا کیے۔ آزاد نظم نے شاعر کو اظہار کی نسبتاً زیادہ آزادی دی اور نظم کو موضوع اور جذبے کی داخلی ضرورت کے مطابق تشکیل دینے کا موقع فراہم کیا۔

داخلیت اور نفسیاتی شعور حلقہ اربابِ ذوق کی شاعری کا ایک بنیادی وصف ہے۔ ترقی پسند شاعری کے برعکس، جس میں خارجی زندگی اور اجتماعی مسائل کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، حلقہ اربابِ ذوق کے شاعروں نے انسان کے باطن میں اترنے کی کوشش کی۔ انسانی تنہائی، خوف، محرومی، محبت، خواہش، خواب، ناکامی، بے چینی اور وجودی اضطراب کو نظم کا موضوع بنایا گیا۔ شاعر نے اپنے داخلی تجربے کو ایک انفرادی واقعے کے طور پر پیش کرنے کے بجائے اسے انسانی تجربے کی ایک وسیع تر معنویت عطا کرنے کی کوشش کی۔

علامت نگاری، تجرید اور اشاریت بھی حلقہ اربابِ ذوق کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ جدید شاعر نے محسوس کیا کہ بعض پیچیدہ اور گہرے تجربات کو براہِ راست اور سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ علامت، استعارے، اشارے اور ابہام کے ذریعے معنی کی مختلف سطحیں پیدا کی گئیں۔ حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا نے لفظ کے ظاہری معنی سے آگے بڑھ کر اس کے باطنی اور علامتی امکانات کو دریافت کیا۔ اس طریقہ اظہار سے نظم میں تہہ داری پیدا ہوئی اور قاری کو بھی معنی کی تشکیل کے عمل میں شریک ہونا پڑا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے شعراء کے یہاں ابہام محض پیچیدگی پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی تجربے کی پیچیدہ اور غیر یقینی فطرت کا اظہار ہے۔ جدید زندگی خود اتنی پیچیدہ، متضاد اور پراسرار ہو چکی تھی کہ اسے ایک سیدھے اور قطعی بیان میں محدود نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جدید نظم میں معنی کے مختلف امکانات پیدا ہوئے اور نظم کا ہر قاری اپنے فکری اور جذباتی تجربے کے مطابق اس سے مختلف معنویت اخذ کرنے لگا۔

حلقہ اربابِ ذوق کی شاعری میں ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ شاعر خارج اور باطن کی دونوں دنیاوں میں کس طرح آہنگ اور توازن پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ اس تحریک نے انسانی داخل کو خاص اہمیت دی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے خارجی زندگی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی دنیا کا تجربہ انسانی ذہن اور احساسات میں داخل ہو کر ایک داخلی حقیقت بن جاتا ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق کے شاعروں نے اسی داخلی حقیقت کو شعری اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس لیے ان کی شاعری میں مشاہدے کی جہت خارج سے داخل کی طرف سفر کرتی ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق نے انسانی داخل کے نغمے کو جگانے کی کوشش کی۔ اس شاعری میں خارجی اشیا اور واقعات اپنی ظاہری صورت میں نہیں رہتے بلکہ شاعر کے ذہن اور احساس کے ذریعے تبدیل ہو کر نئی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ یوں یہ شاعری درحقیقت دھندلے اجالے سے حسن، نغمہ اور سحر پیدا کرنے کی شاعری ہے۔ اس میں زندگی کی ظاہری حقیقتیں انسانی شعور کے آئینے میں منعکس ہو کر نئی صورت اختیار کرتی ہیں۔

جدید اردو نظم کی تشکیل میں حلقہ اربابِ ذوق کی اہمیت اس لیے بھی بنیادی ہے کہ اس نے ادب کو کسی مخصوص سیاسی نظریے یا سماجی مقصد کی پابندی سے آزاد رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک تخلیق کا اصل سرچشمہ انسانی تجربہ اور تخلیقی آزادی ہے۔ حلقے نے شاعر کو یہ حق دیا کہ وہ

اپنے ذاتی اور داخلی تجربات کو بھی ادب کا موضوع بنائے۔ اس آزادی نے اردو نظم کے موضوعاتی دائرے کو وسیع کر دیا اور جدید شاعر کو انسانی زندگی کے ان گوشوں تک پہنچنے کا موقع ملا جنہیں پہلے ادب میں کم اہمیت دی جاتی تھی۔

حلقہ اربابِ ذوق نے اردو ادب میں بے لاگ تنقید کی روایت کو بھی مضبوط کیا۔ اس کی ہفتہ وار مجالس میں تخلیقات کو تنقیدی بحث کے لیے پیش کیا جاتا اور کسی شخصیت یا شہرت کے دباؤ کے بغیر تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں پر گفتگو کی جاتی۔ اس روایت نے اردو ادب میں تنقیدی شعور کو فروغ دیا اور نئے لکھنے والوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ حلقہ ایک ایسی ادبی تجربہ گاہ تھا جہاں تخلیق اور تنقید ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے اردو نظم کو صرف نئی ہیئتیں ہی نہیں دیں بلکہ ایک نیا شعری شعور بھی عطا کیا۔ آزاد نظم اور نظمِ معریٰ کا فروغ، داخلیت اور نفسیاتی شعور کی اہمیت، علامت اور تجرید کا استعمال، لفظ کے نئے امکانات کی دریافت، بے لاگ تنقید کی روایت اور تخلیقی آزادی کا تصور، یہ سب حلقہ اربابِ ذوق کے ایسے کارنامے ہیں جنہوں نے جدید اردو نظم کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق اردو ادب کی تاریخ میں ایک نہایت اہم ادبی تحریک ہے۔ اس نے ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ایک مختلف اور منفرد فکری و تخلیقی روایت قائم کی۔ جہاں ترقی پسند تحریک نے اجتماعی زندگی، سماجی حقیقتوں اور طبقاتی مسائل کو ادب کا موضوع بنایا، وہاں حلقہ اربابِ ذوق نے انسان کو اس کی ذات، اس کے باطن، اس کی نفسیات اور اس کے انفرادی تجربات سے روشناس کرایا۔ اس نے اردو نظم کو روایتی ہیئتوں سے آزادی دلائی، آزاد نظم اور نظمِ معریٰ کو فروغ دیا، علامت اور تجرید کو شعری اظہار کا اہم ذریعہ بنایا اور نظم کے فکری و جمالیاتی امکانات کو وسیع کیا۔

میراجی، ن۔م۔راشد، اختر الایمان، یوسف ظفر، قیوم نظر، تابش صدیقی اور مختار صدیقی جیسے شعراء اور ادباء کی تخلیقی کوششوں نے جدید اردو نظم کو ایک نئی سمت عطا کی۔ حلقہ اربابِ ذوق نے ثابت کیا کہ ادب صرف معاشرے کی خارجی تصویر نہیں بلکہ انسانی باطن کی پیچیدہ اور پراسرار دنیا کا بھی آئینہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو نظم کی تاریخ حلقہ اربابِ ذوق کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس حلقے نے اردو نظم کو نئی ہیئت، نئی زبان، نئے موضوعات اور ایک نئے شعری شعور سے آشنا کیا اور اس طرح اردو ادب کے ارتقا میں ایک ایسا ناقابلِ فراموش باب رقم کیا جس کے اثرات آج بھی جدید اردو شاعری میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

10.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال1: حلقہ اربابِ ذوق کا قیام کس شہر میں عمل میں آیا؟

(الف) دہلی (ب) لکھنؤ

(ج) لاہور (د) حیدرآباد

سوال2: حلقہ اربابِ ذوق کے ابتدائی اجلاسوں سے وابستہ نام کیا تھا؟

(الف) انجمنِ پنجاب (ب) بزمِ داستان گویاں

(ج) انجمن ترقی پسند مصنفین (د) مجلسِ ادب

سوال3: حلقہ اربابِ ذوق کے اہم شعرا میں کون شامل ہیں؟

(الف) میر تقی میر (ب) ن۔م۔راشد

(ج) سودا (د) ذوق

سوال4: حلقہ اربابِ ذوق نے بالخصوص کس ادبی رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا؟

(الف) قصیدہ نگاری (ب) داستان نگاری

(ج) جدید نظم اور ادبی تجربہ پسندی (د) مثنوی نگاری

سوال5: میراجی کی شاعری کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

(الف) صرف قومی شاعری (ب) داخلی کیفیات، علامت نگاری اور نفسیاتی اظہار

(ج) صرف ہجویہ شاعری (د) صرف رزمیہ شاعری

10.4: عمومی جائزہ

حلقہ اربابِ ذوق اردو ادب کی ایک اہم ادبی تحریک اور ادبی انجمن ہے جس نے بالخصوص جدید اردو نظم کی تشکیل، ترقی اور فنی تنوع میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا آغاز لاہور میں ہوا۔ ابتدا میں ادیبوں اور ادب دوستوں کی ایک مختصر مجلس کی صورت میں اس کی سرگرمیاں شروع ہوئیں

لیکن جلد ہی یہ اردو ادب کے ایک مؤثر ادبی حلقے میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے اجلاسوں میں تخلیقات پیش کی جاتیں اور ان پر آزادانہ، سنجیدہ اور تنقیدی گفتگو کی جاتی تھی۔ یہی تنقیدی ماحول نئے ادبی تجربات کے لیے سازگار ثابت ہوا۔

حلقہ اربابِ ذوق کے قیام کے زمانے میں ترقی پسند تحریک بھی اردو ادب میں فعال تھی۔ ترقی پسند ادیب سماجی حقیقت، معاشی ناہمواری، استحصال، طبقاتی کشمکش اور اجتماعی مسائل کو خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ اس کے برعکس حلقہ اربابِ ذوق نے کسی متعین سیاسی یا سماجی نظریے کو ادب پر لازم قرار دینے کے بجائے تخلیق کار کی انفرادی آزادی، فنی تجربے اور جمالیاتی شعور پر زیادہ زور دیا۔ تاہم یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ حلقے کے ادیب سماجی مسائل سے بالکل لاتعلق تھے۔ بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ ادب کو کسی ایک نظریاتی سانچے تک محدود نہیں کرنا چاہتے تھے۔

حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ شعراء نے انسانی ذات کے باطن، تنہائی، خوف، اضطراب، خواہش، خواب، لاشعور اور جدید زندگی کے پیچیدہ تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس رویے نے اردو نظم کے موضوعاتی دائرے کو وسیع کیا۔ خارجی واقعات کے ساتھ انسان کی داخلی دنیا بھی نظم کا اہم موضوع بن گئی۔ جدید اردو نظم کے حوالے سے میراجی اور ن۔م۔ راشد کی خدمات خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ میراجی نے علامت، اساطیر، نفسیاتی کیفیات اور داخلی تجربات کے ذریعے اردو نظم کو ایک منفرد اسلوب عطا کیا۔ ان کی شاعری میں انسانی شخصیت کی پیچیدگی، خواہشات اور لاشعوری محرکات نمایاں نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف ن۔م۔ راشد نے نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم کے امکانات کو وسعت دی اور اردو نظم کو روایتی ہیئت اور موضوعات کی پابندیوں سے نکال کر جدید انسان کے فکری اور وجودی مسائل سے ہم آہنگ کیا۔

حلقہ اربابِ ذوق نے جدید نظم میں آزاد نظم، نظمِ معرّیٰ، علامت نگاری، تجرید، نفسیاتی اظہار، انفرادی تجربے اور ہیئتی تجربات کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے نتیجے میں شاعر کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے تجربے کے مطابق نظم کی ساخت اور اظہار کا طریقہ اختیار کرے۔ نظم محض خارجی واقعے یا براہِ راست پیغام کی ترجمان نہیں رہی بلکہ پیچیدہ انسانی تجربات اور باطنی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بن گئی۔ حلقے کی ایک بڑی خصوصیت اس کی تنقیدی روایت تھی۔ اجلاسوں میں تخلیقات پر بحث اور تنقید نے ادیبوں کو اپنے فن کا تنقیدی جائزہ لینے کا موقع فراہم کیا۔ اس روایت نے اردو ادب میں صحت مند مکالمے، فنی شعور اور تخلیقی تجربہ پسندی کو فروغ دیا۔

مختصراً، حلقہ اربابِ ذوق نے اردو نظم کو انفرادی آزادی، فنی خودمختاری، علامتی اظہار، نفسیاتی گہرائی اور نئے ہیئتی تجربات سے آشنا کیا۔ جدید اردو نظم کے ارتقا میں حلقے کا کردار اس لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے شاعر کو نئے موضوعات ہی نہیں دیے بلکہ ان موضوعات کے اظہار کے لیے نئی زبان، نئی علامتیں اور نئی ہیئتیں اختیار کرنے کی آزادی بھی فراہم کی۔

10.5: فرہنگ

ہیئت	:	ساخت، بناوٹ، ظاہری شکل
داخلیت	:	باطنی احساسات اور داخلی کیفیات سے تعلق
علامت نگاری	:	کسی خیال کو علامت کے ذریعے ظاہر کرنا
تجرید	:	خیال کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے مجرد انداز میں پیش کرنا
لاشعور	:	ذہن کا وہ حصہ جس میں دبے ہوئے احساسات اور خواہشات موجود ہوں
جمالیات	:	حسن اور فن سے متعلق تصورات
انفرادیت	:	شخصی خصوصیت اور جداگانہ انداز
تجربہ پسندی	:	نئے فنی طریقوں اور اسالیب کو آزمانے کا رجحان
اظہار	:	خیال یا احساس کو بیان کرنا
وجودی	:	انسانی وجود اور زندگی کے بنیادی مسائل سے متعلق
نفسیاتی	:	ذہنی اور جذباتی کیفیت سے متعلق
روایت	:	پہلے سے چلا آنے والا طریقہ یا دستور
جدت	:	نیا پن، تازگی
اساطیر	:	قدیم دیومالائی قصے اور روایات
فکری	:	فکر و خیال سے متعلق
اضطراب	:	بے چینی، ذہنی پریشانی
خودمختاری	:	آزادی، اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت
تنقیدی شعور	:	کسی تخلیق کو جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت
اجتماعیت	:	اجتماعی یا گروہی زندگی اور مسائل سے تعلق

10.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: حلقہ اربابِ ذوق کے قیام کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

سوال2: حلقہ اربابِ ذوق نے تخلیق کار کی انفرادی آزادی کو کیوں اہمیت دی؟

سوال3: جدید نظم میں علامت نگاری اور نفسیاتی اظہار کی اہمیت بیان کیجیے۔

سوال4: حلقہ اربابِ ذوق کی تنقیدی نشستوں نے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچایا؟

10.7: مشقی سوالات

سوال1: حلقہ اربابِ ذوق کے قیام، پس منظر اور ادبی مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

سوال2: جدید اردو نظم کے فروغ میں حلقہ اربابِ ذوق کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

سوال3: حلقہ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے ادبی رویوں میں بنیادی فرق واضح کیجیے۔

سوال4: میراجی اور ن۔م۔راشد نے جدید اردو نظم کے ارتقا میں کیا کردار ادا کیا؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال5: حلقہ اربابِ ذوق نے جدید اردو نظم کے موضوع، اسلوب اور ہیئت کو کس طرح متاثر کیا؟ وضاحت کیجیے۔

10.8: جوابات سرگرمی

(ج) لاہور

(ب) بزمِ داستان گویاں

(ب) ن۔م۔راشد

(ج) جدید نظم اور ادبی تجربہ پسندی

(ب) داخلی کیفیات، علامت نگاری اور نفسیاتی اظہار

10.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: حلقہ اربابِ ذوق کے قیام، پس منظر اور ادبی مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

جواب: حلقہ اربابِ ذوق کا آغاز لاہور میں ایسے دور میں ہوا جب اردو ادب میں نئے فکری اور فنی رجحانات تیزی سے ابھر رہے تھے۔ اس انجمن نے ادیبوں اور شعرا کو ایسا ادبی پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں وہ اپنی تخلیقات پیش کر سکیں اور ان پر آزادانہ تنقیدی گفتگو ہو سکے۔ حلقے کا مقصد ادب کو کسی ایک سیاسی یا نظریاتی فکر کا پابند بنانے کے بجائے تخلیقی آزادی اور فن کی خود مختاری کو فروغ دینا تھا۔ اس نے نئے موضوعات، نئی ہیئتوں اور نئے اسالیب کی حوصلہ افزائی کی۔ حلقے کی نشستوں میں تخلیقات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا تھا، جس سے ادیبوں میں تنقیدی شعور پیدا ہوا۔ اسی ماحول نے جدید اردو نظم کو فنی تجربات، علامتی اظہار اور نفسیاتی گہرائی کی طرف مائل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سوال2: جدید اردو نظم کے فروغ میں حلقہ اربابِ ذوق کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

جواب: جدید اردو نظم کے ارتقا میں حلقہ اربابِ ذوق کی خدمات نہایت اہم ہیں۔ حلقے نے نظم کو روایتی موضوعات اور مقررہ ہیئتوں تک محدود رکھنے کے بجائے نئے تجربات کی حوصلہ افزائی کی۔ آزاد نظم اور نظمِ معرّیٰ کو فروغ ملا اور شاعر کو اپنے تجربے کے مطابق ہیئت اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہوئی۔ حلقے سے وابستہ شعراء نے جدید انسان کے ذہنی، نفسیاتی اور وجودی مسائل کو موضوع بنایا۔ تنہائی، خوف، بے یقینی، داخلی کشمکش، محبت، جنس، خواب اور لاشعوری کیفیات جدید نظم کا حصہ بنیں۔ علامت اور استعارے کے استعمال نے نظم میں معنوی وسعت پیدا کی۔ اس طرح حلقہ اربابِ ذوق نے جدید نظم کے موضوع، زبان، اسلوب اور ہیئت سبھی کو متاثر کیا اور اسے نئے ادبی امکانات سے روشناس کرایا۔

سوال3: حلقہ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے ادبی رویوں میں بنیادی فرق واضح کیجیے۔

جواب: ترقی پسند تحریک نے ادب کو سماجی تبدیلی کے ایک مؤثر وسیلے کے طور پر دیکھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے ہاں طبقاتی کشمکش، غربت، استحصال، سامراجی نظام، سماجی ناانصافی اور سیاسی مسائل کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی۔

اس کے مقابلے میں حلقہ اربابِ ذوق نے فن کار کی انفرادی اور تخلیقی آزادی کو بنیادی اہمیت دی۔ حلقے کے ادیب ادب کو کسی ایک سیاسی نظریے کا تابع بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے فرد کے داخلی تجربے، نفسیاتی پیچیدگیوں، علامت نگاری، جمالیاتی شعور اور فنی تجربہ پسندی کو اہمیت دی۔ یوں ترقی پسند تحریک میں اجتماعی اور سماجی شعور نسبتاً زیادہ نمایاں تھا، جبکہ حلقہ اربابِ ذوق کے ہاں انفرادی

تجربے، باطن اور فن کی خودمختاری پر زیادہ زور دیا گیا۔ تاہم دونوں تحریکوں نے اپنے اپنے انداز میں جدید اردو ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

سوال4: میراجی اور ن۔م۔راشد نے جدید اردو نظم کے ارتقا میں کیا کردار ادا کیا؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

جواب: میراجی اور ن۔م۔راشد جدید اردو نظم کے اہم ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ میراجی نے انسانی باطن، لاشعوری خواہشات، نفسیاتی کیفیات، اساطیر اور علامتوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے ہاں زندگی کے پیچیدہ تجربات براہِ راست بیان کے بجائے علامتی اور تہہ دار انداز میں سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے اردو نظم کو نئے موضوعات اور نئے طرزِ احساس سے آشنا کیا۔

ن۔م۔راشد نے نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے روایتی شعری پابندیوں سے ہٹ کر جدید انسان کے فکری، تہذیبی اور وجودی مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کی نظموں میں آزادیِ فکر، فرد کی تنہائی، انسانی وجود اور جدید تہذیب کے مسائل نمایاں ہیں۔ ان دونوں شعراء نے اردو نظم کو فکری گہرائی، فنی وسعت اور جدید اسلوب عطا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

سوال5: حلقہ اربابِ ذوق نے جدید اردو نظم کے موضوع، اسلوب اور ہیئت کو کس طرح متاثر کیا؟ وضاحت کیجیے۔

جواب: حلقہ اربابِ ذوق نے جدید اردو نظم کے موضوع، اسلوب اور ہیئت تینوں سطحوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ موضوعاتی اعتبار سے جدید انسان کا باطن، تنہائی، خوف، خواہش، خواب، نفسیاتی کشمکش اور وجودی اضطراب شاعری میں زیادہ نمایاں ہوا۔

اسلوب کے اعتبار سے علامت، استعارہ، تجرید، تہہ داری اور بالواسطہ اظہار کو فروغ ملا۔ شاعر نے محض واقعہ بیان کرنے کے بجائے اپنے تجربے کو علامتی اور تخلیقی صورت میں پیش کرنا شروع کیا۔ ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم اور نظمِ معرّیٰ جیسے تجربات کو تقویت حاصل ہوئی۔ روایتی وزن، قافیے اور بندشوں کے ساتھ ساتھ نئی ساختوں کے امکانات سامنے آئے۔ حلقے نے شاعر کو یہ آزادی فراہم کی کہ وہ اپنے موضوع اور تجربے کی مناسبت سے اظہار کی موزوں ہیئت اختیار کرے۔ اسی آزادی اور تجربہ پسندی نے جدید اردو نظم کو ایک وسیع، متنوع اور فنی طور پر ثروت مند صنف بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

10.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 11 جدیدیت اور اردو نظم

ساخت

11.0 اغراض ومقاصد

11.1 تعارف

11.2 جدیدیت اور اردو نظم کا پس منظر

11.2.1 جدیدیت اور اردو نظم

11.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

11.4 عمومی جائزہ

11.5 فرہنگ

11.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

11.7 مشقی سوالات

11.8 جوابات سرگرمی

11.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

11.9 امدای کتب

11.0 :اغراض ومقاصد

عزیز متعلم !اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو اردو ادب میں جدیدیت کے تصور، اس کے فکری و ادبی پس منظر اور اردو نظم جدید پر اس کے

اثرات سے روشناس کرانا ہے۔ جدیدیت اردو ادب کا ایک اہم رجحان ہے جس نے بالخصوص شاعری کے موضوعات، اسلوب، زبان، ہیئت اور طرزِ احساس میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس سبق کے مطالعے کے ذریعے طلبہ کو یہ سمجھنے کا موقع ملے گا کہ بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور فکری حالات نے اردو ادب کو کس طرح متاثر کیا اور جدید شعرا نے ان حالات اور انسانی زندگی کے نئے تجربات کو اپنی شاعری میں کس انداز سے پیش کیا۔ اس سبق کا ایک اہم مقصد آپ کو جدیدیت کے تاریخی اور فکری پس منظر سے واقف کرانا بھی ہے۔ جدید دور میں صنعتی ترقی، سائنسی ایجادات، شہری زندگی کے پھیلاؤ، عالمی جنگوں، سیاسی انتشار اور قدیم اقدار میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں نے انسانی ذہن اور احساس کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ جدید انسان کو تنہائی، بے یقینی، خوف، اضطراب، شکستِ خواب اور تہذیبی انتشار جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جدید ادب نے انہی پیچیدہ انسانی تجربات کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا چنانچہ آپ کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جدیدیت محض ادبی اسلوب کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ جدید انسان کے نئے طرزِ احساس اور نئے فکری رویے کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔

اس سبق کے ذریعے آپ کو اردو نظم کے روایتی اور جدید تصورات کے درمیان فرق سے بھی آگاہ کرنا مقصود ہے۔ طلبہ یہ سمجھ سکیں گے کہ جدید نظم کے شعرا نے موضوعات کے ساتھ ساتھ نظم کی ہیئت، زبان، علامت، استعارے، پیکر تراشی اور طرزِ اظہار میں بھی نئے تجربات کیے۔ نظمِ معریٰ، آزاد نظم اور علامتی نظم کے فروغ نے اردو شاعری کو نئے فنی امکانات سے آشنا کیا اور شاعر کو اپنے پیچیدہ داخلی تجربات کے اظہار کے لیے زیادہ آزادی فراہم کی۔ اس سبق کا مقصد آپ کو جدید اردو نظم کے اہم موضوعات مثلاً تنہائی، اجنبیت، ذات کی تلاش، داخلی کشمکش، خوف، بے معنویت، تہذیبی بحران، انسانی رشتوں کی پیچیدگی اور جدید زندگی کے مسائل سے واقف کرانا بھی ہے۔ اس کے ساتھ جدید اردو نظم کے اہم شعراء اور ان کی فکری و فنی خصوصیات کا تعارف فراہم کرنا بھی پیشِ نظر ہے۔

اس سبق کے مطالعے سے آپ میں جدید شاعری کو سمجھنے، اس کے علامتی اور استعاراتی نظام کا تجزیہ کرنے اور اس کے فکری و فنی محاسن کا جائزہ لینے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ یوں یہ سبق آپ کے ادبی ذوق کو نکھارنے، ان کے تنقیدی شعور کو فروغ دینے اور جدید اردو نظم کے مختلف رجحانات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

11.1: تعارف

اردو ادب کی تاریخ میں بیسویں صدی غیر معمولی فکری، سماجی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کی صدی رہی ہے۔ اس دور میں دنیا نے دو عظیم عالمی جنگوں، صنعتی اور سائنسی ترقی، نوآبادیاتی نظام کے خاتمے، نئی سیاسی تحریکوں، شہری زندگی کے پھیلاؤ اور قدیم سماجی و تہذیبی اقدار میں بڑی

تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا۔ان حالات نے انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان کے ذہن،فکر،احساس اور طرزِ زندگی کو بھی متاثر کیا۔ادب چونکہ انسانی زندگی اور انسانی احساسات کا ترجمان ہوتا ہے،اس لیے ان تبدیلیوں کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوئے۔انہی نئے فکری اور تہذیبی حالات کے نتیجے میں ادب میں جس نئے طرزِ احساس نے فروغ پایا،اسے عمومی طور پر جدیدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جدیدیت بنیادی طور پر ایک ایسا فکری اور ادبی رویہ ہے جو بدلتے ہوئے زمانے کے انسانی تجربات،داخلی کیفیات اور نئے مسائل کو نئے فنی وسائل کے ذریعے پیش کرنے پر زور دیتا ہے۔جدیدیت نے ادب کو صرف خارجی واقعات یا اجتماعی مسائل کے بیان تک محدود رکھنے کے بجائے انسانی شخصیت کے باطن،نفسیاتی پیچیدگیوں،تنہائی،بے یقینی،اضطراب،اجنبیت اور ذات کی تلاش جیسے مسائل کی طرف متوجہ کیا۔جدید ادیب اور شاعر کے لیے انسان کا داخلی وجود اور اس کی ذہنی و جذباتی دنیا خاص اہمیت اختیار کر گئی۔اردو ادب میں جدیدیت کا باقاعدہ رجحان بالخصوص بیسویں صدی کے وسط اور اس کے بعد زیادہ نمایاں ہوا۔اگرچہ جدید طرزِ احساس کے ابتدائی نقوش اس سے پہلے کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں،تاہم بعد کے زمانے میں یہ رجحان زیادہ واضح اور منظّم صورت اختیار کرتا گیا۔عالمی ادب،جدید نفسیات،وجودیت،علامت نگاری اور مغربی ادبی وفکری تحریکوں نے بھی اردو کے جدید ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔نتیجتاً اردو شاعری میں موضوع اور ہیئت دونوں سطحوں پر نئے تجربات سامنے آئے۔

جدیدیت نے بالخصوص اردو نظم کو بہت زیادہ متاثر کیا۔جدید نظم کے شاعر نے روایتی موضوعات اور اظہار کے مروجہ سانچوں سے آگے بڑھ کر جدید انسان کے پیچیدہ تجربات کو موضوع بنایا۔جدید زندگی میں انسان کی تنہائی، بے سمتی، ذہنی انتشار،خوف،محرومی،شکستِ آرزو، اجنبیت،تہذیبی بحران،وجودی اضطراب اور انسانی رشتوں کی پیچیدگی جیسے موضوعات جدید نظم میں نمایاں ہوئے۔اس طرح جدید نظم خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ انسان کے داخلی اور نفسیاتی جہان کی بھی ترجمان بن گئی۔جدید نظم کی ایک اہم خصوصیت اس کی ہیئتی اور فنی آزادی ہے۔جدید شعرا نے پابند نظم کے روایتی سانچوں کے ساتھ ساتھ نظمِ معریٰ اور آزاد نظم کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ان تجربات نے شاعر کو اس بات کی آزادی دی کہ وہ اپنے موضوع،جذبے اور تجربے کے مطابق نظم کی ساخت متعین کر سکے۔اس طرح نظم میں مصرعوں کی طوالت،آہنگ،لفظیات اور شعری ساخت کے حوالے سے نئے امکانات پیدا ہوئے۔

جدید اردو نظم میں علامت اور استعارے کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوئی۔جدید شاعر نے پیچیدہ انسانی تجربات اور داخلی کیفیات کے اظہار کے لیے براہِ راست بیان کے بجائے علامتی اور استعاراتی اسلوب سے کام لیا۔خواب،اندھیرا،روشنی،دیوار،صحرا،سفر،شہر،دروازہ،سایہ

اور تنہائی جیسی متعدد علامتیں جدید نظم میں نئے معنوی تناظر کے ساتھ استعمال ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظم بعض اوقات عام قاری کے لیے قدرے پیچیدہ محسوس ہوتی ہے، لیکن غور و فکر سے اس کی معنوی تہیں اور فکری گہرائیاں سامنے آتی ہیں۔

جدید اردو نظم کے ارتقا میں ن۔م۔ راشد، میراجی، اختر الایمان، مجید امجد اور بعد کے متعدد شعرا نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ن۔م۔ راشد نے آزاد نظم، جدید طرزِ احساس اور فکری گہرائی کو فروغ دیا، جب کہ میراجی نے انسانی نفسیات، باطنی تجربات اور علامتی اظہار کو اردو نظم میں نئی جہت عطا کی۔ اختر الایمان اور مجید امجد نے بھی جدید انسان کی زندگی، تنہائی، وقت، معاشرتی تبدیلیوں اور انسانی وجود کے مختلف مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان شعرا کی تخلیقات نے اردو نظم کے موضوعات کو وسیع کیا اور اسے نئے فکری و فنی امکانات سے ہم کنار کیا۔

جدیدیت نے شاعر کی توجہ فرد کے داخلی وجود کی جانب مبذول کرائی۔ جدید نظم میں انسان محض معاشرے کا ایک فرد نہیں بلکہ اپنی ذات کے اندر سوالات، خواہشات، محرومیوں، خوف اور تضادات کا ایک پیچیدہ جہان رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظم میں خود کلامی، داخلی مکالمہ، علامتی اظہار اور نفسیاتی کیفیات کی پیش کش کثرت سے ملتی ہے۔ جدید شاعر اپنے عہد کے مسائل کو بھی محض خارجی واقعات کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ ان مسائل نے انسان کے ذہن اور باطن پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں۔

اس طرح جدیدیت نے اردو نظم کے موضوعات، زبان، ہیئت، اسلوب اور طرزِ احساس میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس نے اردو نظم کو جدید عہد کے انسان کے ذہنی، نفسیاتی، تہذیبی اور وجودی مسائل کے اظہار کا ایک مؤثر وسیلہ بنایا۔ جدیدیت اور نظمِ جدید کا مطالعہ ہمیں نہ صرف اردو شاعری میں رونما ہونے والی فکری اور فنی تبدیلیوں سے واقف کراتا ہے بلکہ یہ سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے کہ جدید شاعر نے اپنے عہد کے پیچیدہ انسانی تجربات کو کس طرح نئی زبان، نئی علامتوں اور نئے شعری اسالیب کے ذریعے پیش کیا۔ اسی لیے جدید اردو شاعری کی تفہیم کے لیے جدیدیت کے فکری پس منظر، اس کے بنیادی تصورات اور نظمِ جدید پر اس کے اثرات کا مطالعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

11.2: جدیدیت اور اردو نظم کا پس منظر

اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ ادب ہمیشہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور فکری حالات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ انسانی زندگی میں جب بھی کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہوئی، ادب نے اس تبدیلی کو اپنے مخصوص تخلیقی انداز میں محسوس کیا اور اس کا اظہار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ مختلف ادبی تحریکوں اور رجحانات کی تاریخ بھی ہے۔ کلاسیکی روایت سے لے کر سرسید تحریک، حالی اور آزاد کی اصلاحی کوششوں، رومانیت، ترقی پسند تحریک اور پھر جدیدیت تک اردو ادب مسلسل تغیر و ارتقا کے مراحل سے گزرا ہے۔ بیسویں صدی کے وسط

میں جب انسانی زندگی نے ایک نئے تہذیبی بحران، سیاسی انتشار، جنگوں کی تباہ کاریوں، صنعتی ترقی اور روحانی بے اطمینانی کا سامنا کیا تو ادب میں بھی ایک نئے شعور نے جنم لیا۔ اردو ادب میں اسی نئے فکری اور تخلیقی شعور کو جدیدیت کے نام سے پہچانا گیا۔

جدیدیت دراصل محض ایک مخصوص ادبی تحریک کا نام نہیں بلکہ زندگی اور کائنات کو ایک نئے شعور کے ساتھ دیکھنے کا نام ہے۔ جدید انسان اپنے ماضی کے انسان سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس کے سامنے زندگی کے مسائل زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر چکے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو سہولتیں ضرور فراہم کیں، مگر اس کے ساتھ انسان کو مشینی زندگی، تنہائی، اجنبیت اور روحانی خلا کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جدید انسان بظاہر ایک ترقی یافتہ دنیا میں رہتا ہے، مگر باطنی طور پر وہ خوف، بے یقینی اور اضطراب کا شکار ہے۔ جدید ادب اسی انسان کے داخلی انتشار اور پیچیدہ ذہنی کیفیتوں کا اظہار ہے۔ مغرب میں جدیدیت کے ظہور کے پس منظر میں صنعتی انقلاب، شہری تہذیب، سائنسی ترقی اور بالخصوص پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے اثرات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان جنگوں نے انسانی تہذیب اور ترقی کے بارے میں خوش فہمیوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ انسان نے دیکھا کہ سائنس اور عقل، جنہیں ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا، تباہی کے ایسے ذرائع بھی بن سکتی ہیں جو پوری انسانی دنیا کو برباد کر دیں۔ اس صورتِ حال نے انسان کے روایتی مذہبی، اخلاقی اور سماجی تصورات کو متزلزل کیا۔ انسان اپنے وجود اور کائنات میں اپنی حیثیت کے بارے میں نئے سوالات کرنے لگا۔

اسی فکری فضا میں نفسیات، فلسفہ اور جدید مغربی ادب نے بھی نئے تصورات پیش کیے۔ سگمنڈ فرائڈ نے انسانی شخصیت میں لاشعور کی اہمیت کو نمایاں کیا اور بتایا کہ انسان کے بہت سے اعمال و جذبات ایسے محرکات سے وابستہ ہوتے ہیں جن کا اسے شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ کارل یونگ نے اجتماعی لاشعور اور اساطیری علامتوں کے تصورات کو اہمیت دی۔ وجودی فلسفے نے انسان کی آزادی، ذمہ داری، تنہائی اور وجودی اضطراب کے مسائل کو نمایاں کیا۔ ان نظریات نے جدید ادب کو گہرا متاثر کیا۔ چنانچہ جدید شاعر نے انسان کو صرف ایک سماجی یا سیاسی وجود کے طور پر نہیں بلکہ ایک پیچیدہ نفسیاتی اور وجودی حقیقت کے طور پر دیکھنا شروع کیا۔

اردو ادب میں جدیدیت کے ظہور کو صرف مغربی اثرات کا نتیجہ قرار دینا مناسب نہیں ہوگا۔ اردو معاشرہ بھی اپنی مخصوص تاریخی اور تہذیبی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ تقسیمِ ہند نے برصغیر کے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا۔ ہجرت، قتل و غارت، بے گھری، تہذیبی انتشار اور شناخت کے بحران نے حساس ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔ آزادی کے بعد جس روشن مستقبل کی امید کی جا رہی تھی، وہ جلد ہی مختلف سیاسی اور سماجی مسائل کی وجہ سے مایوسی میں تبدیل ہونے لگی۔ انسان نے محسوس کیا کہ سیاسی آزادی کے باوجود زندگی کے بنیادی مسائل اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس

احساس نے اردو ادب میں ایک نئے طرزِ فکر کو جنم دیا۔

جدیدیت بنیادی طور پر تین بڑے عوامل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ ایک طرف جدید دنیا کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات تھے، دوسری طرف فلسفہ اور نفسیات کے نئے نظریات تھے، اور تیسری طرف ادب میں آزادیِ اظہار اور نئے فنی امکانات کی ضرورت تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو سماجی اور سیاسی شعور ضرور عطا کیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ بعض ادیبوں نے محسوس کیا کہ ادب کو کسی مخصوص نظریے یا مقصد کے تابع کرنے سے تخلیقی آزادی محدود ہو سکتی ہے۔ جدیدیت نے اسی مقام پر فرد کے انفرادی تجربے اور فن کی آزادی پر زور دیا۔ جدید ادیب نے کہا کہ شاعر اور ادیب کو زندگی کے ہر پہلو کو اپنی آزاد تخلیقی بصیرت کے مطابق پیش کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اسی لیے جدیدیت میں خارجی حقیقت کے مقابلے میں داخلی حقیقت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ جدید شاعر نے یہ کوشش کی کہ انسان کے باطن میں موجود پیچیدہ اور پوشیدہ کیفیات کو ادب میں پیش کیا جائے۔ براہِ راست اور سادہ بیان کے بجائے علامت، استعارہ، ابہام اور اشاریت سے کام لیا گیا۔ آزاد نظم، نظمِ معریٰ اور بعد میں نثری نظم کے تجربات کو بھی فروغ ملا۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک نہایت اہم تحریک تھی جس نے ادب کو سماجی اور سیاسی زندگی سے مربوط کیا۔ اس تحریک نے استحصال، طبقاتی تقسیم، غربت، سامراجیت اور سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی۔ ترقی پسند شاعری میں عوامی زندگی کے مسائل، مزدور، کسان اور محروم طبقات کی زندگی کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ بعض ادیبوں اور شاعروں نے محسوس کیا کہ انسانی زندگی کو صرف سیاسی اور معاشی نظریات کے ذریعے مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسان کی ذات میں ایسے بھی مسائل موجود ہیں جو براہِ راست سیاست یا معیشت سے متعلق نہیں ہوتے۔ اس کی تنہائی، خوف، موت کا احساس، بے معنویت، خواہش، شکست اور داخلی کشمکش بھی ادب کے اہم موضوعات ہیں۔ جدیدیت نے انسانی زندگی کے انہی پہلوؤں کو مرکزیت عطا کی۔ اردو نظم کے میدان میں جدیدیت کی بنیادیں ان شعرا نے مضبوط کیں جنہوں نے روایت کے ساتھ ساتھ نئے فکری اور فنی امکانات کو تلاش کیا۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی کو جدید اردو نظم کے اہم ترین بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان دونوں شعرا نے اردو نظم کو روایتی اسلوب سے نکال کر ایک نئے فکری اور فنی ماحول میں داخل کیا۔ ان کی شاعری میں فرد، باطن، لاشعور، جنس، آزادی، تہذیبی کشمکش اور انسانی وجود کے مسائل نئے انداز میں سامنے آئے۔

ن۔م۔ راشد جدید اردو نظم کے سب سے اہم اور مؤثر شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری نے اردو نظم کو فکری اعتبار سے ایک نئی سمت عطا کی۔ انہوں نے فرد کی آزادی اور اس کی داخلی خودمختاری کو اہمیت دی۔ ان کے نزدیک انسان محض سماجی نظام کا ایک حصہ نہیں بلکہ ایک

آزاد اور پیچیدہ وجود ہے۔ راشد کی شاعری میں انسان اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ وہ ماضی کی روایات، مذہبی اور سماجی پابندیوں اور تہذیبی تصورات کے درمیان اپنی ذات کی آزادی کا مسئلہ محسوس کرتا ہے۔

ن۔م۔ راشد کی نظموں میں فکر اور جذبے کا ایک خاص امتزاج ملتا ہے۔ ان کے یہاں محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ انسانی وجود کے بنیادی سوالات سے مکالمہ ملتا ہے۔ انہوں نے نظم کی زبان کو بھی ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ ان کی نظموں میں روایتی شعری موسیقیت کے بجائے ایک فکری اور معنوی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ آزاد نظم کے استعمال کے ذریعے انہوں نے اردو نظم کو ہیئتی آزادی عطا کی اور شاعر کو اظہار کے نئے امکانات فراہم کیے۔ میراجی جدید اردو نظم کی تشکیل میں دوسری بڑی شخصیت ہیں۔ اگر ن۔م۔ راشد نے جدید نظم کو فکری اور فلسفیانہ گہرائی عطا کی تو میراجی نے اسے نفسیاتی اور داخلی جہتوں سے مالا مال کیا۔ میراجی کی شاعری میں انسانی لاشعور، خواب، خواہش اور جنسی محرکات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے انسانی شخصیت کے ان گوشوں کو شاعری کا موضوع بنایا جنہیں روایتی ادب میں یا تو نظر انداز کیا جاتا تھا یا جن کے اظہار میں احتیاط برتی جاتی تھی۔

میراجی کی شاعری میں ہندوستانی اساطیر، مذہبی روایات اور نفسیاتی علامتوں کا منفرد استعمال ملتا ہے۔ ان کے یہاں علامت صرف زیبائش کا ذریعہ نہیں بلکہ معنی کی تخلیق کا بنیادی وسیلہ ہے۔ ان کی بہت سی نظموں میں الفاظ کے ظاہری معنی سے زیادہ ان کے باطنی اور علامتی مفاہیم اہم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میراجی کی شاعری کا مطالعہ قاری سے فکری شرکت کا تقاضا کرتا ہے۔ جدید اردو نظم کے ارتقاء میں اختر الایمان کا کردار بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے جدید نظم کو زندگی سے قریب تر رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی نظموں میں شہری زندگی، انسانی رشتے، معاشرتی تبدیلیاں اور فرد کی داخلی کیفیتیں ایک مخصوص داستانی انداز میں سامنے آتی ہیں۔ اختر الایمان کی زبان نسبتاً سادہ اور عام فہم ہے، لیکن اس سادگی کے اندر گہری معنویت موجود ہے۔ ان کے یہاں عام زندگی کے واقعات اور کردار ایک وسیع انسانی تجربے کی علامت بن جاتے ہیں۔

اختر الایمان نے ثابت کیا کہ جدید نظم کے لیے محض ابہام یا انتہائی پیچیدگی ضروری نہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کی عام صورتیں ایک ایسی فکری گہرائی پیدا کرتی ہیں جو قاری کو انسانی وجود اور معاشرت کے بنیادی مسائل پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے ہاں وقت، یاد، ماضی اور حال کا تعلق بھی اہم موضوع ہے۔ وہ ماضی کو صرف گزرے ہوئے زمانے کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے حال کی تشکیل میں فعال عنصر سمجھتے ہیں۔ مجید امجد بھی اردو نظم کے ان اہم شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے جدید نظم کو منفرد فکری اور فنی وسعت عطا کی۔ ان کی شاعری میں فرد اور کائنات کا تعلق، وقت کا احساس، فطرت اور انسانی زندگی کے مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مجید امجد کی نظموں میں ایک گہرا فلسفیانہ شعور موجود ہے۔ وہ

زندگی کے معمولی مناظر میں بھی ایسے معنوی امکانات تلاش کرتے ہیں جو عام نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔

مجید امجد کے یہاں فطرت محض حسن و جمال کی علامت نہیں بلکہ زندگی اور کائنات کے گہرے رشتوں کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ان کی شاعری میں وقت کی روانی، انسانی زندگی کی ناپائیداری اور کائنات کی وسعت کا احساس نمایاں ہے۔یہی عناصر انہیں جدید نظم کی روایت میں ایک منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔جدیدیت کے زیرِ اثر اردو نظم میں فرد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ترقی پسند شاعری میں فرد کو اکثر سماجی اور طبقاتی پس منظر میں دیکھا جاتا تھا، جب کہ جدید نظم نے فرد کی داخلی دنیا کو زیادہ اہمیت دی۔جدید شاعر کے نزدیک انسان ایک پیچیدہ شخصیت ہے جس کے اندر متعدد خواہشیں، خوف، تضادات اور محرکات موجود ہیں۔وہ بیک وقت آزادی بھی چاہتا ہے اور تنہائی سے خوف زدہ بھی ہوتا ہے۔وہ تعلق کی خواہش رکھتا ہے، مگر معاشرتی زندگی میں اجنبیت محسوس کرتا ہے۔جدید نظم نے انسانی شخصیت کے انہی تضادات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

تنہائی جدید اردو نظم کا ایک بنیادی موضوع ہے۔جدید انسان شہروں اور معاشروں میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔مشینی زندگی اور شہری تہذیب نے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب ضرور کیا، لیکن باطنی طور پر ان کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔جدید نظم میں ہجوم، شہر، سڑک، عمارت، کمرہ، دیوار اور بند دروازہ جیسی علامتیں اکثر انسان کی اسی داخلی تنہائی کو ظاہر کرتی ہیں۔اجنبیت بھی جدید نظم کا ایک اہم احساس ہے۔جدید انسان بعض اوقات اپنے معاشرے، اپنی تہذیب اور یہاں تک کہ اپنی ذات سے بھی اجنبی محسوس کرتا ہے۔وہ اپنے وجود کی حقیقت اور زندگی کے مقصد کے بارے میں سوالات کرتا ہے۔یہی احساس جدید نظم میں وجودی اضطراب کی صورت اختیار کرتا ہے۔موت، وقت، فنا اور زندگی کی بے معنویت کے مسائل جدید شاعر کے لیے اہم موضوعات بن جاتے ہیں۔

جدید اردو نظم میں علامت نگاری نے غیر معمولی اہمیت حاصل کی۔جدید شاعر نے براہِ راست بیان کے بجائے بالواسطہ اور علامتی اظہار کو ترجیح دی۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جدید زندگی کے تجربات انتہائی پیچیدہ تھے اور انہیں سادہ بیانیہ انداز میں مکمل طور پر پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔علامت شاعر کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ محدود الفاظ میں وسیع معنوی امکانات پیدا کرے۔جدید نظم میں صحرا، دریا، شہر، جنگل، اندھیرا، آئینہ، دیوار، پرندہ، دروازہ، راستہ اور سفر جیسی علامتیں بار بار سامنے آتی ہیں۔صحرا تنہائی، محرومی یا داخلی ویرانی کی علامت بن سکتا ہے۔دریا وقت، زندگی یا مسلسل تبدیلی کے معنی پیدا کر سکتا ہے۔دیوار انسان اور دنیا کے درمیان فاصلے یا رکاوٹ کی علامت بن سکتی ہے۔پرندہ آزادی اور پرواز کی خواہش کی نمائندگی کر سکتا ہے۔جدید شاعر کے یہاں یہ علامتیں کسی ایک مستقل معنی تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ نظم کے سیاق کے مطابق ان کے

مفاہیم تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اساطیر کا استعمال بھی جدید اردو نظم کی اہم خصوصیت ہے۔ جدید شاعر نے قدیم مذہبی، تاریخی اور اساطیری کرداروں کو نئے تناظر میں استعمال کیا۔ ماضی کے واقعات کو حال کے مسائل سے جوڑ کر ان میں نئی معنویت پیدا کی گئی۔ اساطیر کے ذریعے شاعر نے انسانی تجربے کی تاریخی اور تہذیبی گہرائی کو نمایاں کیا۔ جدید نظم میں ماضی اور حال کا تعلق محض تاریخی نہیں بلکہ تخلیقی اور معنوی بھی ہے۔ جدید اردو نظم میں زبان کے تصور میں بھی بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ روایتی شاعری میں زبان اکثر جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہوتی تھی، لیکن جدید شاعر نے زبان کو معنی کی تشکیل کا فعال ذریعہ بنایا۔ الفاظ کی ترتیب، صوتی آہنگ، خاموشی، وقفہ، تکرار اور جملوں کی ساخت بھی معنی پیدا کرنے لگے۔ جدید نظم میں ایک لفظ بیک وقت مختلف معنوی سطحوں پر کام کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظم کی تفہیم میں قاری کی تخلیقی شرکت ضروری ہو جاتی ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے بھی جدید اردو نظم نے نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ پابند نظم کی روایتی ہیئتیں اگرچہ ختم نہیں ہوئیں، لیکن آزاد نظم، نظمِ معریٰ اور نثری نظم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔ آزاد نظم نے شاعر کو اپنے تجربے کے مطابق مصرعوں کی ساخت اور آہنگ ترتیب دینے کا موقع دیا۔ نظمِ معریٰ نے قافیہ کی پابندی سے آزادی عطا کی، جب کہ نثری نظم نے شاعری اور نثر کے روایتی امتیازات کو نئے انداز میں سمجھنے کی کوشش کی۔ نثری نظم جدید اردو شاعری کی ایک اہم صورت ہے۔ اس کے ذریعے شاعر نے خارجی موسیقیت کے بجائے داخلی آہنگ، تصویریت اور معنوی ربط پر توجہ دی۔ نثری نظم کے ناقدین نے اسے شاعری کی روایتی اقدار سے انحراف قرار دیا، مگر اس کے حامیوں کے نزدیک جدید زندگی کے بعض تجربات کے اظہار کے لیے نثری نظم ایک مؤثر وسیلہ تھی۔ اس بحث نے اردو شاعری میں ہیئت اور شعریت کے بارے میں نئے سوالات پیدا کیے۔

جدید اردو نظم کے فروغ میں حلقۂ اربابِ ذوق نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس ادبی حلقے نے ادب کی فنی آزادی، انفرادی تجربے اور جمالیاتی اقدار پر زور دیا۔ ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ شعرا نے ادب کو کسی مخصوص سیاسی نظریے کا پابند بنانے کے بجائے تخلیقی آزادی کو اہمیت دی۔ اس حلقے نے اردو نظم میں نئے تجربات کے لیے سازگار فضا پیدا کی۔ حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ شاعروں نے نظم کی زبان، ساخت اور موضوعات کے حوالے سے مختلف تجربات کیے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ شاعر کا بنیادی تعلق اس کے تخلیقی تجربے سے ہونا چاہیے۔ اگرچہ جدیدیت اور حلقۂ اربابِ ذوق کو مکمل طور پر ایک ہی چیز قرار نہیں دیا جا سکتا، تاہم اردو نظم کے جدید رجحانات کی تشکیل میں اس حلقے کی فضا اور اس کے ادبی مباحث نے اہم کردار ادا کیا۔

جدید نظم میں شہری تہذیب کا اثر بھی نمایاں ہے۔ دیہاتی اور روایتی معاشرت کے مقابلے میں جدید شہر ایک پیچیدہ تہذیبی تجربہ بن کر سامنے آیا۔ شہر میں انسان آزادی بھی محسوس کرتا ہے اور تنہائی بھی۔ شہر میں بے شمار لوگ موجود ہوتے ہیں، مگر فرد اپنے وجود میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ مشین، سڑک، دفتر، بازار، بلند عمارتیں اور تیز رفتار زندگی جدید نظم کے نئے استعارے بن گئے۔

تقسیمِ ہند اور ہجرت کے تجربے نے بھی جدید اردو نظم کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ انسان نے اپنے گھر، زمین، زبان اور تہذیبی ماحول سے محرومی کا تجربہ کیا۔ اس کے نتیجے میں شناخت، بے وطنی اور اجنبیت کے احساسات شدت اختیار کر گئے۔ جدید نظم میں سفر، راستہ، سرحد، اجنبی شہر اور کھویا ہوا گھر جیسی علامتیں اسی تاریخی اور نفسیاتی تجربے سے وابستہ ہیں۔ جدیدیت نے اردو نظم میں عورت کے تجربے کو بھی نئے انداز میں پیش کرنے کی راہ ہموار کی۔ عورت اب محض محبوبہ یا حسن کی علامت نہیں رہی بلکہ ایک مکمل انسانی شخصیت کے طور پر سامنے آنے لگی۔ اس کے جذبات، خواہشات، محرومیاں اور سماجی مسائل جدید شعری اظہار کا حصہ بنے۔ بعد کے ادوار میں خواتین نظم نگاروں نے اپنی ذات اور تجربے کو خود اپنی زبان میں بیان کیا، جس سے اردو نظم کے موضوعاتی امکانات مزید وسیع ہوئے۔

جدید اردو نظم کے اہم شعرا میں شہریار، وزیر آغا، انیس ناگی، زاہد ڈار، افتخار جالب اور متعدد دیگر شعرا نے بھی اپنی انفرادی جہتوں کے ساتھ جدید حسیت کو آگے بڑھایا۔ ان کے یہاں جدید انسان کی داخلی کشمکش، تہذیبی احساس اور زبان کے نئے امکانات مختلف انداز میں سامنے آتے ہیں۔ جدیدیت کسی ایک شاعر یا ایک مخصوص اسلوب تک محدود نہیں بلکہ متعدد تخلیقی تجربات کا مجموعہ ہے۔ جدیدیت کے خلاف یہ اعتراض بھی سامنے آیا کہ اس نے ادب کو عام قاری سے دور کر دیا۔ علامتی پیچیدگی، ابہام اور فکری تہہ داری کی وجہ سے جدید نظم بعض اوقات فوری طور پر قابلِ فہم نہیں رہتی۔ تاہم یہ بات بھی حقیقت ہے کہ ہر اہم ادبی تجربہ اپنے عہد کے قارئین سے ایک نئی سطح کی فکری شرکت کا تقاضا کرتا ہے۔ جدید نظم کی دشواری کو محض اس کی کمزوری قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس دشواری کے پیچھے جدید زندگی کی پیچیدگی بھی موجود ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ جدیدیت نے فرد کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر اجتماعی مسائل سے دوری اختیار کر لی۔ لیکن جدید نظم کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ فرد کی داخلی زندگی دراصل اپنے عہد کے اجتماعی حالات سے الگ نہیں ہوتی۔ ایک فرد کی تنہائی، خوف اور بے یقینی بھی کسی نہ کسی حد تک اجتماعی زندگی کے بحران کی علامت ہوتی ہے۔ اس لیے جدید نظم کی داخلیت کو محض ذاتی اور انفرادی قرار دینا درست نہیں۔ جدید اردو نظم کے ارتقاء میں سب سے اہم تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ نظم نے تجربے کے نئے علاقوں کو دریافت کیا۔ اب شاعر کے لیے کوئی موضوع غیر اہم نہیں رہا۔ خواب، خوف، جسم، لاشعور، یاد، خاموشی، تنہائی، وقت، موت، اجنبیت اور شناخت سب شاعری کے موضوع بن گئے۔ جدید شاعر نے زندگی کی

سطحی حقیقتوں کے پیچھے چھپی ہوئی معنوی دنیا کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔

مجموعی طور پر جدیدیت نے اردو نظم کو ایک نئی فکری بصیرت، فنی آزادی اور لسانی توانائی عطا کی۔ ن۔م۔ راشد نے نظم کو فکری اور فلسفیانہ گہرائی عطا کی، میراجی نے اسے نفسیاتی اور علامتی جہتوں سے مالا مال کیا، اختر الایمان نے جدید تجربے کو زندگی کی عام صورتوں اور داستانی اسلوب سے جوڑا، جبکہ مجید امجد نے وقت، فطرت، فرد اور کائنات کے تعلق کو اپنی شاعری میں منفرد معنویت عطا کی۔ جدیدیت میں اردو نظم کا ارتقاء دراصل ایک ایسے تخلیقی سفر کی داستان ہے جس میں اردو شاعر نے اپنے عہد کے انسان کو نئے انداز میں دریافت کیا۔ اس انسان کے سامنے صرف سیاسی یا معاشی مسائل نہیں بلکہ وجود، شناخت، آزادی، تنہائی اور معنی کے مسائل بھی موجود تھے۔ جدید نظم نے ان مسائل کو اپنے مخصوص علامتی، استعاراتی اور فنی اسلوب میں بیان کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید اردو نظم کو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک اہم اور فیصلہ کن مرحلہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے نظم کو نئے موضوعات، نئی زبان، نئی ہیئت اور نئے فکری امکانات عطا کیے۔ جدیدیت نے اردو نظم کو یہ شعور دیا کہ زندگی ایک سیدھی اور سادہ حقیقت نہیں بلکہ متعدد تجربات، تضادات اور معنوی پرتوں کا مجموعہ ہے۔ شاعر کا کام ان پرتوں کو دریافت کرنا اور انہیں ایک ایسی تخلیقی صورت عطا کرنا ہے جو انسانی شعور کو نئے امکانات سے روشناس کر سکے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدیدیت نے اردو نظم کے دائرہ اظہار کو غیر معمولی طور پر وسیع کیا۔ اس نے شاعر کو روایت سے مکالمہ کرنے، اپنی داخلی دنیا کو دریافت کرنے، زبان کے نئے امکانات تلاش کرنے اور زندگی کے پیچیدہ تجربات کو نئی شعری صورت عطا کرنے کی آزادی دی۔ جدید اردو نظم آج بھی اپنی مختلف صورتوں میں اردو شاعری کے معاصر منظرنامے پر اثر انداز ہے۔ بعد کے رجحانات، خواہ وہ مابعد جدیدیت ہوں، نسائی شعور ہو، شناخت کا مسئلہ ہو یا نئی شہری زندگی کے تجربات، ان سب میں جدیدیت کی قائم کردہ فکری اور فنی روایت کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ اس طرح جدیدیت اردو نظم کے ارتقاء کا صرف ایک مرحلہ نہیں بلکہ ایک ایسا تخلیقی موڑ ہے جس نے اردو شاعری کے مزاج، موضوعات، زبان اور فنی ساخت کو بنیادی طور پر متاثر کیا۔ جدید اردو نظم نے انسان کو ایک نئے شعور کے ساتھ دیکھا اور اس کے باطن میں پوشیدہ خوف، خواہش، تنہائی، اضطراب اور جستجو کو شاعری کا حصہ بنایا۔ یہی جدیدیت کی سب سے بڑی ادبی اہمیت ہے اور یہی اردو نظم کے ارتقاء میں اس کا مستقل اور نمایاں کردار بھی ہے۔

11.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال1: اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک زیادہ نمایاں طور پر کس دور میں سامنے آئی؟

(الف) اٹھارہویں صدی (ب) انیسویں صدی کے آغاز میں

(ج) بیسویں صدی کے وسط میں (د) اکیسویں صدی میں

سوال2: جدید نظم میں شاعر نے سب سے زیادہ کس پہلو کو اہمیت دی؟

(الف) قصیدہ گوئی (ب) داخلی احساسات اور انفرادی تجربات

(ج) بادشاہوں کی مدح (د) تاریخی واقعات کی ترتیب

سوال3: جدید اردو نظم کے اہم شاعروں میں کون شامل ہیں؟

(الف) میر تقی میر (ب) سودا

(ج) ن۔م۔راشد (د) ذوق

سوال4: جدیدیت میں کس چیز کے خلاف ردِّعمل پایا جاتا ہے؟

(الف) نئے تجربات (ب) انفرادی آزادی

(ج) فرسودہ روایات اور جامد اقدار (د) علامتی اظہار

سوال5: جدید نظم میں علامت اور استعارے کے استعمال کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

(الف) صرف زبان کو مشکل بنانا (ب) معنی کی مختلف تہیں پیدا کرنا

(ج) شعر کو طویل بنانا (د) قافیہ پیدا کرنا

11.4: عمومی جائزہ

جدیدیت بیسویں صدی کی ایک اہم فکری، تہذیبی اور ادبی تحریک ہے جس نے دنیا بھر کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ صنعتی ترقی، دو عالمی جنگوں، سائنسی ایجادات، شہری زندگی کی توسیع اور انسانی اقدار میں تبدیلی نے جدید انسان کے ذہن کو نئی صورتِ حال سے دوچار

کیا۔ جدید انسان نے خود کو تنہائی، بے یقینی، اضطراب، بے معنویت اور داخلی کشمکش میں مبتلا محسوس کیا۔ ادب نے بھی اس نئی ذہنی اور سماجی کیفیت کو اپنے اظہار کا موضوع بنایا، جس کے نتیجے میں جدیدیت کو فروغ حاصل ہوا۔

اردو ادب میں جدیدیت خصوصاً بیسویں صدی کے وسط اور اس کے بعد ایک اہم ادبی رجحان کی حیثیت سے سامنے آئی۔ ترقی پسند تحریک کے اجتماعی، سماجی اور سیاسی موضوعات کے مقابلے میں جدیدیت نے فرد کی ذات، اس کے باطن، نفسیاتی پیچیدگیوں، تنہائی، خوف، بے اطمینانی اور وجودی مسائل پر زیادہ توجہ دی۔ جدید اردو نظم نے شاعری کی روایتی ہیئت، موضوعات اور اسلوب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ شاعر نے خارجی دنیا کے بجائے داخلی کائنات کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس نے اپنے ذاتی تجربات، ذہنی کشمکش، خواب، خوف، یادوں، خواہشات اور لاشعوری کیفیات کو شاعری میں جگہ دی۔ اسی وجہ سے جدید نظم میں علامت، استعارہ، پیکر، تجرید، ابہام اور تہہ دار معنویت کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

جدید نظم کے شعرا نے روایتی بحور، قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے بھی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم نے جدید شعراء کو زیادہ وسیع اظہار فراہم کیا۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی نے جدید اردو نظم کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کے بعد اختر الایمان، مجید امجد، منیر نیازی، وزیر آغا، زبیر رضوی، شہریار اور دوسرے شعراء نے جدید نظم کو نئے موضوعات اور اسالیب سے مالا مال کیا۔ ن۔م۔ راشد نے آزاد نظم، جدید فکر، انسانی وجود، آزادی، فرد کی تنہائی اور تہذیبی کشمکش کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ میراجی نے انسانی نفسیات، جنسی جبلت، لاشعوری کیفیات، ہندی تہذیب اور علامتی اظہار کے ذریعے جدید نظم میں نئی جہتیں پیدا کیں۔ اختر الایمان نے شہری زندگی، یادِ ماضی، انسانی رشتوں اور زندگی کی بے ثباتی کو اپنی نظموں میں منفرد انداز سے پیش کیا۔

جدید نظم میں براہِ راست بیان کے بجائے اشاریت اور علامت کو اہم مقام حاصل ہے۔ جدید شاعر کسی خیال کو سادہ اور واضح انداز میں بیان کرنے کے بجائے علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ اس طرزِ اظہار سے نظم میں معنی کی متعدد سطحیں پیدا ہوتی ہیں اور قاری کو نظم سمجھنے کے لیے غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔

مختصر یہ کہ جدیدیت نے اردو نظم کے موضوع، ہیئت، زبان، اسلوب اور طرزِ احساس سب کو متاثر کیا۔ اس نے اردو نظم کو نئے انسانی تجربات، نئی فکری جہات اور نئے اسلوبِ اظہار سے آشنا کیا۔ جدید نظم میں فرد کی داخلی دنیا، وجودی تنہائی، ذہنی اضطراب، تہذیبی شکست و ریخت اور زندگی کی پیچیدگیاں بنیادی موضوعات کی حیثیت اختیار کرتی ہیں۔

11.5: فرہنگ

1۔جدیدیت	:	نئی فکر اور نئے ادبی رویوں پر مبنی تحریک
2۔داخلیت	:	انسان کی باطنی اور ذہنی کیفیت پر توجہ
3۔خارجیت	:	بیرونی دنیا اور خارجی حالات سے تعلق
4۔وجودیت	:	انسانی وجود، آزادی اور زندگی کے معنی سے متعلق فلسفہ
5۔علامت	:	کسی وسیع مفہوم کی نمائندگی کرنے والی شے یا نشان
6۔استعارہ	:	کسی شے کو مشابہت کی بنیاد پر دوسری شے قرار دینا
7۔تجرید	:	خیال کو غیر مادی یا غیر محسوس صورت میں پیش کرنا
8۔ابہام	:	معنی کا غیر واضح یا متعدد مفاہیم کا حامل ہونا
9۔پیکر	:	لفظوں سے بنائی گئی ذہنی یا حسی تصویر
10۔لاشعور	:	ذہن کا وہ حصہ جو شعوری ادراک سے پوشیدہ ہو
11۔اضطراب	:	بے چینی، پریشانی
12۔بیگانگی	:	اجنبیت، اپنے ماحول سے لاتعلقی
13۔تنہائی	:	اکیلا پن
14۔تہذیب	:	کسی معاشرے کی اجتماعی ثقافتی اقدار
15۔ہیت	:	ادبی تخلیق کی ظاہری ساخت
16۔اسلوب	:	اظہار کا مخصوص انداز
17۔روایت	:	نسل در نسل منتقل ہونے والا ادبی یا معاشرتی طریقہ
18۔کشش	:	باہمی ٹکراؤ، ذہنی یا عملی جدوجہد
19۔معنویت	:	معنی اور مفہوم رکھنے کی کیفیت
20۔اشاریت	:	بات کو براہِ راست کہنے کے بجائے اشارے سے ظاہر کرنا

11.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: جدیدیت سے کیا مراد ہے؟ اردو ادب میں جدیدیت کے پس منظر اور بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال2: جدیدیت نے اردو نظم کے موضوع اور اسلوب کو کس طرح متاثر کیا؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال3: جدید اردو نظم کی اہم خصوصیات بیان کرتے ہوئے علامت، استعارہ اور ابہام کی اہمیت واضح کیجیے۔

سوال4: ن۔م۔راشد اور میراجی کی جدید اردو نظم کے فروغ میں خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال5: جدید اردو نظم میں فرد کی تنہائی، بیگانگی اور داخلی کشمکش کے اظہار پر بحث کیجیے۔

5۔ چار مشقی سوالات

جدیدیت اور ترقی پسند تحریک کے ادبی رویوں میں کیا بنیادی فرق ہے؟

جدید اردو نظم میں آزاد نظم کی اہمیت بیان کیجیے۔

جدید شاعر کے نزدیک فرد اور اس کے باطنی تجربات کیوں اہم ہیں؟

جدید نظم میں علامت اور پیکر تراشی کی اہمیت مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔

11.8: جوابات سرگرمی

(ج) بیسویں صدی کے وسط میں

(ب) داخلی احساسات اور انفرادی تجربات

(ج) ن۔م۔راشد

(ج) فرسودہ روایات اور جامد اقدار

(ب) معنی کی مختلف تہیں پیدا کرنا

11.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال نمبر1: جدیدیت کا مفہوم، پس منظر اور بنیادی خصوصیات۔۔۔

جواب: جدیدیت ایک ایسی فکری اور ادبی تحریک ہے جس نے روایتی تصورات اور فرسودہ اقدار کے مقابلے میں نئے انسانی تجربات، انفرادی شعور اور نئی طرزِ فکر کو اہمیت دی۔ بیسویں صدی میں عالمی جنگوں، صنعتی ترقی، سائنسی ایجادات، شہری زندگی کی پیچیدگیوں اور روایتی اقدار کی شکست نے انسان کے ذہن کو شدید متاثر کیا۔ اسے اپنی ذات، معاشرے اور کائنات کے متعلق نئے سوالات کا سامنا ہوا۔ اسی ذہنی اور تہذیبی صورتِ حال کے نتیجے میں ادب میں بھی نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ اردو ادب میں جدیدیت نے خصوصاً 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں کے بعد نمایاں ادبی رجحان کی صورت اختیار کی۔

جدیدیت کی نمایاں خصوصیات میں انفرادیت، داخلیت، تنہائی، بیگانگی، وجودی مسائل، نفسیاتی پیچیدگی، علامت، استعارہ، ابہام، تجرید اور اسلوبیاتی تجربات شامل ہیں۔ جدید ادیب خارجی مسائل کے بجائے فرد کی داخلی دنیا اور اس کے ذاتی تجربات کی طرف زیادہ متوجہ ہوا۔ اس طرح جدیدیت نے اردو ادب کو نئے موضوعات، نئی زبان، نئی ہیئت اور نئے طرزِ احساس سے آشنا کیا۔

سوال نمبر2: جدیدیت کے اردو نظم کے موضوع اور اسلوب پر اثرات۔۔۔۔۔

جواب: جدیدیت نے اردو نظم کے موضوعات اور اسلوب دونوں میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ روایتی شاعری میں عشق، حسن، فطرت، تصوف اور اجتماعی مسائل کو اہمیت حاصل تھی، جب کہ جدید نظم میں فرد کی ذات اور اس کی داخلی کیفیات بنیادی موضوع بن گئیں۔ جدید شاعر نے تنہائی، خوف، اضطراب، بیگانگی، شکستِ خواب، بے معنویت، جنسی نفسیات، تہذیبی بحران اور انسانی وجود کے مسائل کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔ اس طرح نظم خارجی دنیا سے زیادہ انسانی باطن کی ترجمان بن گئی۔ اسلوب کے اعتبار سے جدید شاعروں نے علامت، استعارہ، پیکر، اشاریت، تجرید اور ابہام سے کام لیا۔ نظم میں معنی براہِ راست بیان کرنے کے بجائے مختلف علامات اور اشاروں کے ذریعے پیش کیے جانے لگے۔ ہیئت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی اور پابند نظم کے ساتھ نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ یوں جدیدیت نے اردو نظم کو موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے نئی وسعت عطا کی۔

سوال نمبر3: جدید اردو نظم کی خصوصیات اور علامت، استعارہ و ابہام۔۔۔۔

جواب: جدید اردو نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت انسانی ذات کے داخلی تجربات کا اظہار ہے۔ جدید شاعر انسان کی تنہائی، خوف، ذہنی کشمکش،

بے یقینی اور تہذیبی مسائل کو شاعری کا موضوع بناتا ہے۔ جدید نظم میں علامت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ علامت کے ذریعے شاعر کسی ایک شے یا کردار کو وسیع مفہوم عطا کرتا ہے۔ مثلاً اندھیرا مایوسی یا خوف اور روشنی امید یا آگہی کی علامت بن سکتی ہے۔ استعارہ بھی جدید نظم کا اہم فنی وسیلہ ہے۔ اس کے ذریعے شاعر اپنے تجربے کو زیادہ مؤثر اور تخلیقی انداز میں پیش کرتا ہے۔

ابہام جدید نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس کا مقصد نظم کو بلاوجہ مشکل بنانا نہیں بلکہ اس میں مختلف معنوی امکانات پیدا کرنا ہے۔ ایک اچھی جدید نظم مختلف قارئین کے سامنے مختلف معنوی جہتیں کھول سکتی ہے۔ یوں علامت، استعارہ اور ابہام جدید نظم کو فکری گہرائی اور فنی حسن عطا کرتے ہیں۔

سوال نمبر 4: ن۔م۔ راشد اور میراجی کی خدمات۔۔۔۔۔۔

جواب: ن۔م۔ راشد اور میراجی جدید اردو نظم کے دو نہایت اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں نے اردو نظم کو روایتی طرزِ اظہار سے نکال کر نئی فکری اور فنی جہات سے آشنا کیا۔ ن۔م۔ راشد نے آزاد نظم کو اردو شاعری میں مستحکم مقام دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی شاعری میں انسانی آزادی، فرد کا وجود، تہذیبی بحران، تنہائی، عشق اور زندگی کے فلسفیانہ مسائل نمایاں ہیں۔ انہوں نے زبان، ہیئت اور علامتی اظہار میں نئے تجربات کیے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ماورا، ایران میں اجنبی، لا = انسان اور گماں کا ممکن خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میراجی نے اردو نظم کو نفسیاتی، علامتی اور تہذیبی اعتبار سے نئی وسعت عطا کی۔ انہوں نے انسانی لاشعور، جنسی نفسیات، تنہائی، محبت، موت اور انسانی خواہشات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور دیومالا کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ دونوں شاعروں نے اردو نظم کو روایتی پابندیوں سے آزاد کیا اور جدید انسانی تجربے کے اظہار کے لیے نئی زبان اور نئی تکنیک فراہم کی۔ اسی لیے انہیں جدید اردو نظم کے بنیادی معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر 5: جدید نظم میں تنہائی، بیگانگی اور داخلی کشمکش۔۔۔۔

جدید دور کا انسان سائنسی اور مادی ترقی کے باوجود ذہنی اور جذباتی طور پر کئی مسائل کا شکار ہوا۔ شہری زندگی، مشینی نظام، انسانی رشتوں کی کمزوری اور روایتی اقدار کی شکست نے اسے تنہائی اور بیگانگی کا احساس دلایا۔ جدید اردو نظم نے اس کیفیت کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔

جدید شاعر کے یہاں تنہائی صرف جسمانی اکیلا پن نہیں بلکہ ایک ذہنی اور روحانی کیفیت ہے۔ انسان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اسی احساس کو بیگانگی کہا جاتا ہے۔ جدید نظم میں داخلی کشمکش بھی ایک اہم موضوع ہے۔ انسان کی خواہشات اور

حقیقت، خواب اور زندگی، ماضی اور حال اور فرد اور معاشرے کے درمیان تصادم ذہنی کشمکش پیدا کرتا ہے۔ن۔م۔راشد، میراجی، اختر الایمان اور مجید امجد جیسے شاعروں نے فرد کی اس تنہائی اور باطنی اضطراب کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں جدید انسان اپنے وجود اور زندگی کے معنی تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اس اعتبار سے جدید اردو نظم جدید انسان کی داخلی دنیا، اس کے خوف، تنہائی، بیگانگی اور وجودی مسائل کی ایک مؤثر ترجمان ہے۔

11.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 12 مابعد جدیدیت اور اردو نظمِ جدید

ساخت

12.0 اغراض ومقاصد

12.1 تعارف

12.2 مابعد جدیدیت اور اردو نظم کا پس منظر

12.2.1 مابعد جدیدیت اور نظمِ جدید

12.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

12.4 عمومی جائزہ

12.5 فرہنگ

12.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

12.7 مشقی سوالات

12.8 جوابات سرگرمی

12.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

12.9 امدای کتب

12.0 :اغراض ومقاصد

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو اردو ادب میں مابعد جدیدیت کے تصور، اس کے فکری و ادبی پس منظر، بنیادی خصوصیات اور اردو نظم پر

اس کے اثرات سے روشناس کرانا ہے۔ مابعد جدیدیت عصرِ حاضر کے ان اہم فکری اور ادبی رویوں میں شمار ہوتی ہے جنھوں نے ادب، فن، تہذیب، زبان اور انسانی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے روایتی طریقوں پر نئے سوالات قائم کیے۔ اس سبق کے مطالعے کے ذریعے آپ کو یہ سمجھنے کا موقع فراہم کرنا مقصود ہے کہ مابعد جدید فکر نے ادب کے موضوع، متن، معنی، زبان، قاری اور تخلیق کار کے باہمی رشتے کے بارے میں کس طرح نئے تصورات پیش کیے اور ان تصورات نے جدید اردو نظم کے بعد کی شعری صورتِ حال کو کس انداز سے متاثر کیا۔

اس سبق کا ایک اہم مقصد آپ کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے باہمی تعلق اور بنیادی فرق سے آگاہ کرنا بھی ہے۔ جدیدیت نے فرد کی تنہائی، داخلی کشمکش، اجنبیت، وجودی اضطراب اور ذات کی تلاش جیسے مسائل کو اہمیت دی، جب کہ مابعد جدیدیت نے کسی ایک قطعی سچائی، ایک حتمی معنی یا کسی واحد فکری و تہذیبی مرکز کو قبول کرنے کے بجائے تکثیریت، اختلاف، تنوع اور معنی کی کثرت پر زور دیا۔ اس لیے طلبہ کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ مابعد جدیدیت کو محض جدیدیت کے بعد آنے والا زمانی مرحلہ تصور کرنا کافی نہیں بلکہ یہ ایک ایسا فکری رویہ بھی ہے جو بہت سے قائم شدہ تصورات اور مسلمہ نظریات پر سوال اٹھاتا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ کو مابعد جدیدیت سے وابستہ اہم تصورات مثلاً تکثیریت، مرکزیت کی نفی، ردِ تشکیل، بین المتونیت، معنی کی کثرت، قاری کی اہمیت، حاشیائی آوازوں کی بازیافت اور عظیم بیانیوں سے بے اعتمادی سے بنیادی طور پر واقف کرانا بھی مقصود ہے۔ اس سے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ مابعد جدید ادبی فکر میں کسی ادبی متن کے معنی کو صرف مصنف کے ارادے تک محدود نہیں رکھا جاتا بلکہ قاری، زبان، ثقافت اور دوسرے متون کے باہمی تعلق کو بھی معنی کی تشکیل میں اہم سمجھا جاتا ہے۔

اس سبق کا مقصد آپ کو یہ آگہی فراہم کرنا بھی ہے کہ مابعد جدیدیت نے اردو نظم کے موضوعاتی دائرے کو مزید وسعت دی۔ معاصر شاعر نے زندگی کے بڑے اور روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ روزمرہ زندگی، مقامی تجربات، شناخت، تہذیبی انتشار، صارفیت، ذرائع ابلاغ، سیاسی و سماجی تضادات اور معاشرے کے نظر انداز کیے گئے طبقات اور آوازوں کو بھی شعری اظہار کا حصہ بنایا۔ اس طرح مابعد جدید شعری رویے میں زندگی کے مختلف اور متضاد تجربات کو اظہار کا حق حاصل ہوا۔ مابعد جدید نظم میں زبان اور اسلوب کے نئے تجربات سے آپ کو واقف کرانا بھی اس سبق کا اہم مقصد ہے۔ مابعد جدید شعری رویے میں علامت، استعارے، تلمیح، بین المتونیت، طنز، پیروڈی اور مختلف اسالیب کے امتزاج سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں زبان کو محض خیالات پہنچانے کا ذریعہ نہیں بلکہ معنی کی تشکیل میں سرگرم عنصر تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی نظم مختلف قارئین کے لیے مختلف معنوی امکانات پیدا کر سکتی ہے۔

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ مابعد جدیدیت کے بنیادی تصورات کو سمجھنے، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین امتیاز قائم کرنے

اوراردو نظم پر مابعد جدید فکری رویوں کے اثرات کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔اس کے ساتھ ساتھ آپ میں ادبی متن کو مختلف زاویوں سے پڑھنے،سوال قائم کرنے اوراس کی مختلف معنوی جہات کو دریافت کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگی۔

12.1:تعارف

ادب ہمیشہ اپنے عہد کے فکری،سماجی،تہذیبی اور سیاسی حالات سے کسی نہ کسی سطح پر وابستہ رہتا ہے۔بیسویں صدی میں دنیا نے نہایت تیز رفتار تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا۔دو عالمی جنگوں،سائنسی و صنعتی ترقی،نوآبادیاتی نظام کے زوال،نئی سیاسی وسماجی تحریکوں،ذرائع ابلاغ کی وسعت اور بدلتے ہوئے تہذیبی تصورات نے انسانی فکر کو گہرے طور پر متاثر کیا۔انہی تبدیلیوں کے نتیجے میں ادب میں پہلے جدیدیت نے ایک اہم فکری و ادبی رجحان کی صورت اختیار کی اور بعدازاں ایسے فکری مباحث سامنے آئے جنہیں مجموعی طور پر مابعد جدیدیت کے عنوان سے شناخت کیا گیا۔

مابعد جدیدیت کے تصور نے مغرب میں بالخصوص بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں نمایاں فکری اہمیت حاصل کی۔اس نے جدید عہد کے ان تصورات پر سوالات قائم کیے جن میں عقل،ترقی،مرکزیت،آفاقیت اور کسی ایک حتمی سچائی کی تلاش کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔مابعد جدید فکر نے اس خیال کو اہمیت دی کہ انسانی معاشرہ،ثقافت اور زندگی اس قدر متنوع اور پیچیدہ ہیں کہ انہیں کسی ایک نظریے،اصول یا کلیے کے ذریعے مکمل طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔مابعد جدیدیت کا ایک بنیادی تصور تکثیریت ہے۔اس تصور کے مطابق دنیا میں مختلف تہذیبیں،زبانیں، شناختیں،تجربات اور نقطہ نظر موجود ہیں اور کسی ایک نقطہ نظر کو لازماً سب پر برتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔یہی تصور ادب میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔مابعد جدید ادبی فکر ادب کو کسی ایک نظریاتی مرکز یا واحد معنی کا پابند بنانے کے بجائے مختلف آوازوں،تجربات اور تعبیرات کے لیے جگہ پیدا کرتی ہے۔

مابعد جدیدیت کا ایک اہم پہلو عظیم بیانیوں پر عدم اعتماد بھی ہے۔ایسے نظریات یا تصورات جو پوری انسانی تاریخ اور معاشرے کو ایک ہی کلیے کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں،مابعد جدید فکر ان کے دعوائے کلیت پر سوال اٹھاتی ہے۔اس کے بجائے مقامی تجربات،چھوٹی کہانیوں،انفرادی شناختوں اور ان آوازوں کو اہمیت دی جاتی ہے جو مرکزی تاریخی اور ادبی بیانیوں میں اکثر نظر انداز ہوتی رہی ہیں۔اسی لیے مابعد جدید ادب میں عورت،اقلیت،مقامی ثقافت،علاقائی شناخت اور معاشرے کے حاشیے پر موجود افراد کے تجربات کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

مابعد جدیدیت نے متن اور معنی کے روایتی تصورات کو بھی متاثر کیا۔ روایتی طور پر کسی ادبی تخلیق کے معنی کو اکثر مصنف کے خیال اور ارادے کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی، لیکن مابعد جدید تنقیدی رویوں میں قاری کے کردار اور زبان کی پیچیدگی کو بھی خاص اہمیت دی گئی۔ اس تصور کے مطابق ادبی متن میں معنی کے متعدد امکانات موجود ہو سکتے ہیں اور مختلف قارئین اپنے علمی، تہذیبی اور سماجی پس منظر کے مطابق ایک ہی متن کی مختلف تعبیرات کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بین المتونیت مابعد جدید فکر کا ایک اہم تصور ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی ادبی متن مکمل طور پر الگ تھلگ وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ کسی نہ کسی انداز میں دوسرے متون، روایات، تاریخی حوالوں، اساطیر، مذہبی و تہذیبی تصورات اور ادبی تجربات سے وابستہ ہوتا ہے۔ شاعر یا ادیب بعض اوقات پرانی کہانی، شعر، کردار، اسطور یا تاریخی واقعے کو نئے تناظر میں پیش کر کے نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ مابعد جدید نظم میں اس نوع کے تجربات کی خاص اہمیت ہے۔

اردو ادب میں مابعد جدیدیت کا مباحثی اثر بالخصوص بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں زیادہ نمایاں ہوا۔ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور ناقدین نے مغربی مابعد جدید فکر کو اپنے تہذیبی اور ادبی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں اردو تنقید میں متن، قاری، معنی، شناخت، مرکز و حاشیہ، بین المتونیت اور تکثیریت جیسے مباحث کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو شاعری اور بالخصوص معاصر نظم کو بھی ان نئے فکری مباحث کی روشنی میں پڑھنے اور سمجھنے کے امکانات پیدا ہوئے۔ مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر نظم کے موضوعات میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ شاعر کے لیے اب صرف بڑے سیاسی، سماجی یا فلسفیانہ موضوعات ہی اہم نہیں رہے بلکہ روزمرہ زندگی کے بظاہر معمولی تجربات، مقامی تہذیب، شخصی شناخت، یادداشت، میڈیا، بازار، صارفیت، بدلتے ہوئے انسانی رشتے اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی شعری تجربے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ یوں مابعد جدید شعری رویہ زندگی کی چھوٹی اور بڑی حقیقتوں کے درمیان قائم روایتی امتیاز کو بھی چیلنج کرتا ہے۔

مابعد جدید نظم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اسلوبی تنوع کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔ شاعر ایک ہی تخلیق میں سنجیدگی اور طنز، حقیقت اور تخیل، ماضی اور حال، مقامی اور عالمی حوالوں کو یکجا کر سکتا ہے۔ بعض اوقات شعری متن میں مختلف آوازیں ایک ساتھ موجود ہوتی ہیں اور شاعر کسی ایک حتمی نتیجے تک پہنچنے کے بجائے قاری کے سامنے متعدد سوالات اور امکانات رکھ دیتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر مرکز اور حاشیے کے تصور کو بھی نئی اہمیت حاصل ہوئی۔ ادبی اور سماجی روایت میں جن طبقوں، علاقوں، زبانوں، ثقافتوں اور شناختوں کو کم اہمیت دی جاتی رہی، ان کے تجربات کو بھی ادب کے مرکزی دھارے میں جگہ دینے کی کوشش کی گئی۔ اس رجحان نے اردو نظم کے موضوعاتی دائرے کو وسیع کرنے اور مختلف سماجی و تہذیبی تجربات کو اظہار فراہم کرنے میں مدد دی۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مابعد جدیدیت کوئی ایسی باقاعدہ ادبی تحریک نہیں جس کے تمام ادیب اور شاعر ایک ہی اصول یا منشور کے پابند ہوں۔ اسے زیادہ مناسب طور پر ایک فکری اور تنقیدی صورتِ حال یا رویہ کہا جاسکتا ہے جس نے ادب کو دیکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کے نئے زاویے فراہم کیے۔ اسی وجہ سے مابعد جدید ادب میں تنوع، اختلاف اور متعدد اسالیب کی موجودگی کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مابعد جدیدیت نے اردو ادب اور نظم کے مطالعے میں نئے فکری امکانات پیدا کیے۔ اس نے متن کے واحد اور قطعی معنی کے بجائے معنی کی کثرت، مرکزیت کے بجائے تکثیریت، بڑی اور غالب آوازوں کے ساتھ حاشیائی آوازوں اور مصنف کے ساتھ قاری کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ مابعد جدیدیت اور معاصر اردو نظم کا مطالعہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ بدلتے ہوئے عہد میں اردو شاعر نے نئے تہذیبی، سماجی اور فکری تجربات کو کس طرح قبول کیا اور زبان، ہیئت، علامت اور اسلوب کے نئے امکانات کے ذریعے انہیں شعری اظہار عطا کیا۔ اسی لیے معاصر اردو نظم کی فکری اور فنی جہات کو سمجھنے کے لیے مابعد جدیدیت کے بنیادی تصورات اور اس کے ادبی اثرات کا مطالعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

12.2.1: مابعد جدیدیت اور نظمِ جدید

ادب انسانی زندگی، فکر، احساس اور تہذیبی شعور کا آئینہ ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ جیسے جیسے مختلف سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں سے گزرتا ہے، ادب بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کی تاریخ میں مختلف تحریکیں اور رجحانات وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔ ہر تحریک اپنے عہد کے مخصوص مسائل، تصورات اور فکری تقاضوں کے تحت وجود میں آتی ہے اور اپنے بعد آنے والے ادبی رجحانات کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں جدیدیت ایک نہایت اہم فکری اور ادبی رجحان کے طور پر سامنے آئی جس نے ادب کو نئے موضوعات، نئی حسیت اور نئے اسلوب سے آشنا کیا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جدیدیت کے بعض بنیادی تصورات بھی سوالات کی زد میں آنے لگے۔ اس فکری اور تہذیبی تبدیلی کے نتیجے میں مابعد جدیدیت کا رجحان سامنے آیا، جس نے ادب، ثقافت، تاریخ، زبان اور معنی کے بارے میں نئے سوالات اٹھائے اور ادب کو دیکھنے اور سمجھنے کے نئے زاویے فراہم کیے۔

مابعد جدیدیت، جسے انگریزی میں Postmodernism کہا جاتا ہے، بنیادی طور پر ایک ایسا فکری، فلسفیانہ، تہذیبی اور ادبی رجحان ہے جو جدیدیت کے بعض قطعی اور آفاقی تصورات پر نظرِ ثانی کرتا ہے۔ جدیدیت نے عقل، ترقی، سائنس، انفرادیت اور نئے پن کو خصوصی اہمیت دی تھی، لیکن مابعد جدیدیت نے اس سوال کو اٹھایا کہ کیا انسانی زندگی اور کائنات کی تمام حقیقتوں کو کسی ایک نظریے، ایک اصول یا ایک آفاقی سچائی

کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے؟ مابعد جدیدیت کا جواب نفی میں ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک پیچیدہ اور متنوع حقیقت ہے، جس میں مختلف تہذیبیں، زبانیں، طبقات، نظریات اور تجربات موجود ہیں۔ اس لیے کسی ایک مرکز یا ایک نظریے کو تمام انسانی تجربات کی حتمی تعبیر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مابعد جدیدیت کا بنیادی تصور کثرت، تنوع اور اختلاف کو تسلیم کرنا ہے۔ یہ کسی ایک سچائی، ایک معنی یا ایک مرکز کو آخری حقیقت نہیں سمجھتی بلکہ مختلف تعبیرات اور متعدد حقیقتوں کے امکان کو قبول کرتی ہے۔ اسی لیے مابعد جدید فکر میں مرکزیت کے بجائے مرکزیت سے انحراف، وحدت کے بجائے تکثیریت، قطعیت کے بجائے امکانات اور حتمی معنی کے بجائے معنی کی کثرت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت کی ادبی اور فکری بحثوں میں بین المتونیت، معنی کی مرکزیت سے انحراف، قاری کے کردار، ثقافتی تکثیریت اور مختلف متون کے باہمی تعلق جیسے تصورات کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ اردو کے تناظر میں بھی ان مباحث نے ادب کی نئی قرأت اور روایت کے نئے مطالعے کے امکانات پیدا کیے۔

مابعد جدیدیت کا آغاز مغربی دنیا میں ایک طویل تاریخی اور تہذیبی عمل کے نتیجے میں ہوا۔ اگرچہ اس کی ابتدائی فکری جڑیں بیسویں صدی کے پہلے نصف میں تلاش کی جا سکتی ہیں، تاہم دوسری جنگِ عظیم کے بعد انسانی تہذیب کے بارے میں موجود بہت سے تصورات متزلزل ہونے لگے۔ سائنس اور عقل کی ترقی کے باوجود دو عالمی جنگوں نے یہ ثابت کر دیا کہ محض سائنسی ترقی اور عقلی استدلال انسان کو امن، خوش حالی اور اخلاقی بلندی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ جنگوں کی تباہ کاریوں، سیاسی استبداد، سامراجیت، سرمایہ داری اور انسانی اقدار کے بحران نے ترقی کے اس تصور پر سوالیہ نشان لگا دیا جسے جدید دنیا اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مغربی معاشرے میں صنعتی ترقی، ذرائع ابلاغ، سرمایہ دارانہ نظام، صارفیت اور عالمی روابط میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ انسان کی زندگی پر ٹیکنالوجی اور میڈیا کے اثرات بڑھنے لگے اور مقامی و عالمی ثقافتوں کے درمیان نئے روابط قائم ہوئے۔ اس صورتِ حال میں انسان کے لیے اپنی شناخت، تہذیب اور حقیقت کے بارے میں پرانے تصورات پر قائم رہنا مشکل ہوتا گیا۔ چنانچہ ایک ایسا فکری رجحان پیدا ہوا جس نے تاریخ، حقیقت، شناخت، زبان اور معنی کو جامد اور مستقل حقیقتیں تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ عمومی طور پر مابعد جدیدیت کو بیسویں صدی کے وسط کے بعد ابھرنے والا رجحان سمجھا جاتا ہے، جبکہ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں اس کے فکری اور ثقافتی مباحث نے خاص وسعت حاصل کی۔

مابعد جدیدیت کے پس منظر میں جدیدیت کا کردار بھی نہایت اہم ہے۔ کسی بھی فکری رجحان کو اس کے پیش رو رجحانات سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ مابعد جدیدیت جدیدیت کے بعد وجود میں آنے والی فکر ضرور ہے، لیکن اسے محض جدیدیت کی مکمل نفی کہنا درست نہیں ہوگا۔ مابعد جدیدیت نے جدیدیت سے بہت سے تخلیقی عناصر حاصل کیے، مگر اس کے بعض بنیادی دعووں پر سوال بھی اٹھایا۔ جدیدیت نے ادب

کو روایت کی سخت پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی، فرد کی داخلی دنیا کو اہمیت دی اور نئے فنی تجربات کیے۔ مابعد جدیدیت نے اس آزادی کے دائرے کو مزید وسیع کرتے ہوئے یہ کہا کہ ادب کو کسی ایک نظریاتی، جمالیاتی یا فکری مرکز کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ مابعد جدیدیت نے ان بڑے نظریات اور تصورات پر بھی سوال اٹھایا جو انسانی تاریخ کی مکمل اور جامع تعبیر پیش کرنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی اتنی متنوع اور پیچیدہ ہے کہ اسے کسی ایک عظیم نظریے یا کلی نظام کے تحت مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے مابعد جدیدیت چھوٹی تاریخوں، مقامی تجربات، مختلف ثقافتی شناختوں اور ان آوازوں کو اہمیت دیتی ہے جو اکثر مرکزی بیانیے میں نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ یہیں سے ادب میں عام انسان، مقامی تہذیب، حاشیائی طبقات اور مختلف ثقافتی شناختوں کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔

اردو ادب میں مابعد جدیدیت کا ورود بھی عالمی فکری اور تہذیبی تبدیلیوں کے پس منظر میں ہوا۔ اردو ادب ایک زندہ اور متحرک ادبی روایت رکھتا ہے اور اس نے ہمیشہ بیرونی فکری اثرات کو محض نقل کرنے کے بجائے اپنے تہذیبی اور لسانی مزاج کے مطابق قبول کیا ہے۔ جدیدیت بھی اردو ادب میں مغربی جدیدیت کی سادہ نقل کی صورت میں نہیں آئی بلکہ اس نے اردو کی شعری روایت، برصغیر کے سماجی حالات اور مقامی تہذیبی تجربات کے ساتھ مل کر ایک مخصوص صورت اختیار کی۔ اسی طرح مابعد جدیدیت بھی اردو ادب میں اپنے مخصوص تہذیبی، تاریخی اور لسانی تناظر کے ساتھ سامنے آئی۔ اردو میں مابعد جدیدیت کے مباحث کو وسیع کرنے میں اردو تنقید کا خاص کردار رہا۔ ناقدین نے اس رجحان کے ذریعے ادب، روایت، متن، معنی اور قاری کے باہمی تعلق پر نئے انداز میں غور کیا۔ اردو مابعد جدیدیت کے مباحث میں گوپی چند نارنگ کا نام خاص طور پر اہم ہے، جنہوں نے مابعد جدیدیت کو عالمی اور اردو تناظر میں سمجھنے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی کتاب ''جدیدیت کے بعد'' میں مابعد جدیدیت، شعریات، اردو تناظر، ترقی پسندی اور جدیدیت کے باہمی تعلق کے ساتھ جدید نظم کی شعریات جیسے موضوعات پر بحث موجود ہے۔

اردو ادب میں مابعد جدیدیت کا شعور بتدریج نمایاں ہوا اور اس کے باقاعدہ مباحث خصوصاً بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں زیادہ واضح ہوئے۔ بعض تحقیقی مطالعات اردو ادب میں اس کے نمایاں ورود کو تقریباً 1990ء کے آس پاس محسوس کرتے ہیں، اگرچہ اس سے پہلے بھی اردو ادب میں ایسے عناصر موجود تھے جنہیں بعد میں مابعد جدید حسیت سے وابستہ کر کے دیکھا گیا۔ اس لیے اردو میں مابعد جدیدیت کے آغاز کو کسی ایک سال یا ایک واقعے سے وابستہ کرنا آسان نہیں، بلکہ اسے ایک تدریجی فکری عمل کے طور پر سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔ اردو شاعری مابعد جدیدیت کے اثرات سے خاص طور پر متاثر ہوئی کیونکہ شاعری میں تجربے، زبان اور معنی کے امکانات نسبتاً زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ اردو شاعری

کی طویل روایت میں پہلے ہی علامت، استعارہ، تہذیبی حوالوں اور کثیر المعنویت کی مضبوط روایت موجود تھی۔ مابعد جدیدیت نے ان عناصر کو نئے فکری تناظر میں سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ شاعر نے ماضی اور حال، روایت اور جدیدیت، مقامی اور عالمی، فرد اور معاشرے کے درمیان نئے روابط تلاش کیے۔

مابعد جدید اردو شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معنی کی وحدت کے بجائے معنی کی کثرت کو قبول کیا جاتا ہے۔ ایک نظم یا شعری متن کے مختلف معنی ہو سکتے ہیں اور ہر قاری اپنے علمی، تہذیبی اور ذہنی پس منظر کے مطابق اس سے مختلف مفہوم اخذ کر سکتا ہے۔ اس تصور نے شاعر کی نیت کو متن کا واحد اور حتمی معیار ماننے کے تصور کو کمزور کیا اور قاری کو بھی معنی کی تشکیل کے عمل میں اہم مقام عطا کیا۔ مابعد جدید ادبی فکر میں قاری اور متن کے تخلیقی تعامل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو شاعری میں مابعد جدیدیت کے اثرات کا ایک نمایاں پہلو روایت کی نئی بازیافت ہے۔ جدیدیت کے بعض مراحل میں روایت سے انحراف اور نئے پن پر زیادہ زور دیا گیا، لیکن مابعد جدیدیت نے ماضی اور روایت کو یکسر مسترد کرنے کے بجائے انہیں نئے معنی کے ساتھ قبول کرنے کی راہ ہموار کی۔ مابعد جدید شاعر تاریخ، اساطیر، مذہبی قصص، کلاسیکی ادب اور لوک روایت کو نئے تناظر میں استعمال کرتا ہے۔ اس کے لیے روایت ایک جامد ذخیرہ نہیں بلکہ معنی کی ایک زندہ دنیا ہے، جس سے موجودہ عہد کے مسائل کو سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔

اسی عمل کے نتیجے میں بین المتونیت کو اردو شاعری میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ بین المتونیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی متن مکمل طور پر تنہا نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر دوسرے متون، روایتوں اور تہذیبی حوالوں کی بازگشت موجود ہوتی ہے۔ ایک مابعد جدید نظم میں کلاسیکی شاعری، مذہبی روایت، تاریخی واقعات، لوک داستانوں اور عصری زندگی کے حوالے ایک ساتھ موجود ہو سکتے ہیں۔ شاعر ماضی کے کسی کردار یا واقعے کو موجودہ عہد کے مسائل سے وابستہ کر کے اس میں نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ایک قدیم قصہ محض تاریخ نہیں رہتا بلکہ موجودہ زندگی کی تعبیر کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت اور نظمِ جدید کا تعلق اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ جدید نظم نے اردو شاعری کو روایتی موضوعات اور ہیئتوں کی پابندی سے نکال کر زندگی کے نئے تجربات کے اظہار کا موقع دیا۔ جدید شاعر نے فرد کی تنہائی، وجودی بحران، خوف، بے گانگی، شکست، محرومی اور داخلی کشمکش کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جدید نظم میں علامت، تجرید، پیچیدہ پیکر تراشی اور نئے اسلوبیاتی تجربات نمایاں ہوئے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ انسانی زندگی کو صرف فرد کی داخلی دنیا یا وجودی اضطراب تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

مابعد جدیدیت نے نظمِ جدید کو اس محدودیت سے نکال کر زندگی کی زیادہ متنوع اور کثیر الجہتی حقیقتوں سے وابستہ کیا۔ مابعد جدید نظم میں

فرد کی داخلی دنیا موجود ضرور ہے، لیکن اس کے ساتھ تاریخ، ثقافت، سیاست، سماج، زبان اور اجتماعی شناخت کے مسائل بھی اہم ہو جاتے ہیں۔ شاعر اب صرف اپنی ذات کے اندر نہیں دیکھتا بلکہ اپنے گرد و پیش کی متعدد حقیقتوں کو بھی نظم کا حصہ بناتا ہے۔

مابعد جدید نظم کی ایک اہم خصوصیت مرکزیت سے انحراف ہے۔ روایتی نظم میں عموماً ایک مرکزی خیال یا ایک مربوط موضوع موجود ہوتا ہے، جبکہ مابعد جدید نظم میں معنی اور تجربے کا انتشار بھی فنی طور پر اہم ہو سکتا ہے۔ نظم میں مختلف تصویریں، آوازیں، حوالہ جات اور تجربات ایک ساتھ موجود ہو سکتے ہیں۔ یہ بظاہر انتشار دراصل عہد کی پیچیدہ اور منتشر حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ موجودہ انسان کی زندگی خود مختلف تہذیبی، سیاسی اور معاشی قوتوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے، اس لیے اس کی تخلیقی صورت بھی بعض اوقات ایک مربوط اور سیدھی ساخت کے بجائے ٹکڑوں اور مختلف سطحوں میں سامنے آتی ہے۔ مابعد جدید نظم میں شکست و ریخت کو اسی تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ اس عہد میں انسانی تجربہ مسلسل تبدیلی سے گزر رہا ہے۔ ٹیکنالوجی، ذرائع ابلاغ، عالمی روابط اور تیز رفتار تہذیبی تبدیلیوں نے انسان کے تجربے کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس لیے مابعد جدید شاعر بعض اوقات ایک مکمل اور مسلسل داستان پیش کرنے کے بجائے زندگی کے مختلف ٹکڑوں کو نظم میں جمع کرتا ہے۔ ان ٹکڑوں کے درمیان تعلق پیدا کرنا قاری کی ذمہ داری بھی بن جاتا ہے۔ اس طرح نظم ایک مکمل اور بند ساخت کے بجائے ایک کھلی تخلیقی دنیا کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مابعد جدید نظم کی ایک اور اہم خصوصیت کثیر آوازیت ہے۔ اس میں صرف شاعر کی ذاتی آواز نہیں بلکہ مختلف طبقات، تہذیبوں اور سماجی تجربات کی آوازیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ حاشیے پر موجود انسان، عام شہری، مزدور، عورت، علاقائی اور ثقافتی شناخت رکھنے والے افراد اور مختلف سماجی طبقات کے تجربات ادب میں نئی اہمیت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح شاعری کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور نظم زندگی کی زیادہ جامع اور متنوع تصویر پیش کرنے لگتی ہے۔ مابعد جدید نظم میں مقامی تہذیب اور ثقافتی شناخت کی بازیافت بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ عالمگیریت کے عہد میں جب مختلف تہذیبوں کے درمیان روابط بڑھ رہے تھے، مقامی شناخت کے تحفظ اور اظہار کا مسئلہ بھی نمایاں ہوا۔ مابعد جدید شاعر اپنے علاقے، زبان، تاریخ، تہذیب اور ثقافتی یادداشت کو نظم کا حصہ بناتا ہے۔ وہ اپنی مقامی زندگی کو کسی محدود یا ثانوی تجربے کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اسے انسانی تجربے کی ایک اہم صورت سمجھتا ہے۔

مابعد جدیدیت نے اردو نظم کی زبان کو بھی نئے امکانات عطا کیے۔ شاعر کے لیے ضروری نہیں رہا کہ وہ صرف ایک مخصوص ادبی زبان استعمال کرے۔ کلاسیکی الفاظ، روزمرہ کی زبان، علاقائی الفاظ، مختلف تہذیبی اصطلاحات اور نئے سائنسی و تکنیکی الفاظ بھی نظم کا حصہ بن سکتے ہیں۔ زبان کی یہ آزادی نظم کو عصری زندگی کے زیادہ قریب لے آتی ہے۔ مابعد جدید شاعر زبان کو محض اظہار کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے معنی کی تشکیل

کرنے والی تخلیقی قوت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

مابعد جدید نظم میں طنز اور پیروڈی بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شاعر بعض اوقات کسی معروف تاریخی، مذہبی یا ادبی روایت کو نئے اور غیر متوقع انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد محض روایت کی تضحیک کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر موجود نئے امکانات کو دریافت کرنا اور ان تصورات پر سوال اٹھانا ہوتا ہے جنہیں معاشرہ حتمی حقیقت سمجھتا آیا ہے۔ اس طرح مابعد جدید نظم سوال کرنے، معنی کو بدلنے اور موجودہ دنیا کی پیچیدگیوں کو نئے انداز میں سمجھنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ مابعد جدیدحسیت کے زیر اثر اردو نظم میں عالمگیریت، صارفیت، کارپوریٹ تہذیب اور نئے عالمی نظام سے پیدا ہونے والے تجربات بھی اہم ہوئے۔ موجودہ انسان صرف اپنے مقامی ماحول تک محدود نہیں رہا بلکہ عالمی ذرائع ابلاغ اور معاشی نظام کے اثرات بھی اس کی زندگی کا حصہ بن گئے۔ معاصر اردو نظم کے مطالعے میں ان تبدیلیوں کو مابعد جدید حسیت کے ایک اہم پس منظر کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

مابعد جدید اردو شاعری نے انسانی شناخت کے مسئلے کو بھی نئے انداز سے پیش کیا۔ جدید دور میں فرد کو ایک مستقل اور مربوط شخصیت کے طور پر دیکھنے کا رجحان موجود تھا، لیکن مابعد جدیدیت کے نزدیک انسانی شناخت متعدد عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔ انسان بیک وقت اپنی زبان، ثقافت، طبقے، تاریخ اور سماجی حالات سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شناخت بھی ایک سے زیادہ سطحوں پر موجود ہوتی ہے۔ مابعد جدید نظم اس پیچیدہ شناخت کو مختلف زاویوں سے پیش کرتی ہے۔ اردو نظم میں مابعد جدیدیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے شاعر اور قاری کے تعلق کو تبدیل کیا۔ روایتی تصور کے مطابق شاعر نظم تخلیق کرتا ہے اور قاری اس کے معنی کو دریافت کرتا ہے، لیکن مابعد جدید نظریات میں قاری کو بھی معنی کی تشکیل میں شریک سمجھا جاتا ہے۔ ایک ہی نظم مختلف قارئین کے لیے مختلف معنی رکھ سکتی ہے۔ اس طرح متن کے معنی کسی ایک شخص یا کسی ایک دور تک محدود نہیں رہتے بلکہ وقت، مقام اور قاری کے بدلنے کے ساتھ نئی تعبیرات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

مابعد جدیدیت نے اردو نظم کو ایک نئی فکری آزادی عطا کی۔ شاعر اب کسی ایک نظریے، ایک مخصوص اسلوب یا کسی لازمی فنی اصول کا پابند نہیں رہا۔ اس کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ مختلف روایتوں، زبانوں اور تجربات کو ایک ہی نظم میں جمع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدید نظم میں کبھی کلاسیکی شعری روایت اور جدید شہری زندگی ایک ساتھ ملتی ہیں، کبھی تاریخ اور حال کا مکالمہ ہوتا ہے اور کبھی مقامی زندگی اور عالمی تہذیب کے اثرات ایک ہی تخلیقی تجربے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعری کے جدید اور مابعد جدید رجحانات کا تقابلی مطالعہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ جدیدیت میں انفرادی اضطراب، بے گانگی اور اسلوبیاتی تجربے کو نمایاں اہمیت حاصل تھی، جبکہ مابعد جدیدیت میں انتشار، طنز، بین المتونیت اور معنی کی

کثرت جیسے عناصر زیادہ نمایاں ہوئے۔ تاہم ان دونوں رجحانات کے درمیان ایک مکمل دیوار قائم کرنا درست نہیں، کیونکہ اردو ادب میں بہت سے رجحانات ایک دوسرے کے ساتھ متوازی طور پر بھی موجود رہے ہیں۔

مابعد جدیدیت کی سب سے بڑی اہمیت شاید یہی ہے کہ اس نے ادب کو حتمی فیصلوں اور محدود خانوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ ادب میں کسی ایک طرزِ فکر، ایک اسلوب یا ایک نظریے کی اجارہ داری نہیں ہوسکتی۔ زندگی کی طرح ادب بھی متنوع اور متغیر ہے۔ ہر عہد اپنے سوالات پیدا کرتا ہے اور ہر نئی نسل ادب اور روایت کو اپنے مخصوص حالات میں نئے معنی عطا کرتی ہے۔ اردو نظمِ جدید کے لیے مابعد جدیدیت نے نئے امکانات پیدا کیے۔ اس نے نظم کو ماضی سے مکمل طور پر منقطع ہونے کے بجائے ماضی سے مکالمہ کرنے کی صلاحیت دی۔ اس نے مقامی ثقافت اور عالمی تجربے کے درمیان رابطہ پیدا کیا۔ اس نے شاعر کو معنی کی کثرت قبول کرنے اور قاری کو معنی کی تشکیل میں شریک ہونے کا موقع دیا۔ اس نے زبان کی سطح پر آزادی، ساخت کی سطح پر تنوع اور موضوعات کی سطح پر وسعت پیدا کی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مابعد جدیدیت کے بارے میں اردو ادب میں اختلافِ رائے موجود رہا ہے۔ بعض ناقدین نے اسے مغرب سے درآمد شدہ نظریہ قرار دیا، جبکہ دوسرے اہلِ علم نے اس کے ذریعے اردو ادب اور اس کی روایت کو نئے زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ تاہم اس اختلاف کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ مابعد جدیدیت کے مباحث نے اردو تنقید اور تخلیقی ادب کو نئے سوالات سے روشناس کرایا۔ اردو میں مابعد جدیدیت پر ہونے والی گفتگو نے متن، معنی، روایت، تاریخ، ثقافت اور قاری کے بارے میں نئے امکانات پیدا کیے اور مابعد جدید اردو نظم کو بھی ایک مستقل تنقیدی موضوع کے طور پر اہمیت حاصل ہوئی۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت محض جدیدیت کے بعد آنے والے زمانے کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص فکری اور تہذیبی رویے کی علامت ہے۔ یہ رویہ حتمی سچائیوں پر سوال اٹھاتا، مختلف آوازوں کو اہمیت دیتا، روایت کو نئے معنی میں دریافت کرتا اور زندگی کی پیچیدگیوں کو متعدد زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اردو ادب میں اس رجحان نے تنقید اور تخلیق دونوں پر اثر ڈالا، جبکہ اردو شاعری اور بالخصوص نظمِ جدید نے مابعد جدیدیت سے نئے موضوعات، نئی حسیت اور اظہار کے نئے امکانات حاصل کیے۔

مابعد جدید اردو نظم اپنے عہد کی منتشر، متنوع اور پیچیدہ زندگی کی ترجمان ہے۔ اس میں ماضی اور حال، روایت اور جدیدیت، مقامی اور عالمی، فرد اور معاشرہ، حقیقت اور علامت سب ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے ہیں۔ یہی مکالمہ مابعد جدید نظم کی اصل قوت ہے۔ اس نظم میں کوئی ایک مرکز، ایک آواز یا ایک معنی حتمی نہیں بلکہ معنی کا ایک وسیع اور متحرک جہان موجود ہے۔ اس اعتبار سے مابعد جدیدیت نے اردو نظمِ جدید کے

امکانات کو محدود نہیں کیا بلکہ اسے ایک وسیع تر تخلیقی، تہذیبی اور فکری میدان عطا کیا ہے۔ اردو نظم کا یہ سفر اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب کسی جامد روایت کا نام نہیں بلکہ مسلسل تبدیلی، مکالمے اور نئے معنی کی تلاش کا ایک زندہ عمل ہے۔

12.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال1: مابعد جدیدیت بنیادی طور پر کس کے بعد سامنے آنے والا فکری و ادبی رجحان ہے؟

(الف) کلاسیکیت (ب) رومانویت

(ج) جدیدیت (د) حقیقت نگاری

سوال2: مابعد جدیدیت کس تصور کو زیادہ اہمیت دیتی ہے؟

(الف) ایک حتمی سچائی (ب) مرکزیت

(ج) معنی کی کثرت (د) روایتی پابندی

سوال3: مابعد جدید فکر سے وابستہ اہم مفکر کون ہے؟

(الف) ژاک دریدا (ب) ولی دکنی

(ج) میر تقی میر (د) حالی

سوال4: مابعد جدیدیت میں متن کے معنی متعین کرنے میں کس کا کردار اہم سمجھا جاتا ہے؟

(الف) صرف مصنف (ب) صرف نقاد

(ج) قاری (د) ناشر

سوال5: مابعد جدید نظم کی ایک نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

(الف) صرف روایتی موضوعات (ب) معنی کی یکسانیت

(ج) بین المتونیت اور تکثیریت (د) قصیدہ نگاری

12.4: عمومی جائزہ

مابعد جدیدیت بیسویں صدی کے آخری نصف میں نمایاں ہونے والا ایک اہم فکری، فلسفیانہ، تہذیبی اور ادبی رجحان ہے۔ یہ جدیدیت کے بعد سامنے آیا اور اس نے جدیدیت کے کئی بنیادی تصورات پر سوالات قائم کیے۔ جدیدیت نے انسان، عقل، انفرادیت اور نئے طرزِ احساس کو اہمیت دی تھی، جب کہ مابعد جدیدیت نے اس تصور کو چیلنج کیا کہ کسی حقیقت، نظریے یا متن کی صرف ایک ہی قطعی اور آخری تعبیر ممکن ہے۔ مابعد جدیدیت کا بنیادی رویہ مرکزیت، قطعیت اور واحد صداقت کے تصور سے گریز ہے۔ یہ زندگی، حقیقت اور ادب کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ مابعد جدید فکر کے مطابق حقیقت یک رخی نہیں بلکہ کثیر الجہتی ہے اور کسی متن کے معنی بھی ہمیشہ ایک جیسے اور جامد نہیں رہتے۔ مختلف قارئین اپنے علمی، سماجی، تہذیبی اور شخصی پس منظر کے مطابق ایک ہی متن سے مختلف معنی اخذ کر سکتے ہیں۔

مابعد جدید فکر کی تشکیل میں ژاک دریدا، ژاں فرانسوا لیوتار، مشیل فوکو اور رولان بارت جیسے مفکرین کے مباحث کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ژاک دریدا نے ردِّ تشکیل یا Deconstruction کے تصور کے ذریعے متن کے اندر موجود تضادات اور معنوی امکانات کی طرف توجہ دلائی۔ لیوتار نے بڑے اور ہمہ گیر بیانیوں پر عدم اعتماد کو مابعد جدید صورتِ حال کی ایک اہم خصوصیت قرار دیا۔ رولان بارت کے مباحث نے بھی مصنف کی مرکزیت کم کر کے قاری اور متن کے باہمی رشتے کو نمایاں کیا۔ اردو ادب میں مابعد جدیدیت کے مباحث خصوصاً بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں زیادہ نمایاں ہوئے۔ اس نے افسانے، ناول، تنقید اور شاعری، خصوصاً نظم، کے مطالعے کے لیے نئے امکانات پیدا کیے۔ اردو نظم میں مابعد جدید رویوں کے نتیجے میں معنی کی کثرت، بین المتونیت، تہذیبی حوالوں، علامتوں، اساطیر، ماضی کی بازیافت اور مختلف اسالیب کے امتزاج کو اہمیت حاصل ہوئی۔

مابعد جدید نظم کسی ایک نظریے، اسلوب یا فکری مرکز کی پابند نہیں ہوتی۔ اس میں شاعر مختلف تہذیبی، تاریخی اور ادبی حوالوں کو نئے تناظر میں پیش کر سکتا ہے۔ قدیم اساطیر، کلاسیکی شاعری، لوک روایت، روزمرہ زندگی، ذرائع ابلاغ اور عصری ثقافت کے عناصر ایک ہی نظم میں یکجا ہو سکتے ہیں۔ مابعد جدید نظم میں بین المتونیت ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک متن دوسرے متون کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر رشتہ قائم کرتا ہے۔ شاعر کسی قدیم شعر، داستان، اساطیری کردار، تاریخی واقعے یا معروف ادبی متن کو نئے مفہوم میں اپنی نظم کا حصہ بنا سکتا ہے۔ اس طرح پرانے متن کو نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئی معنویت حاصل ہوتی ہے۔

مابعد جدیدیت میں مرکز اور حاشیے کے روایتی تصور پر بھی سوال اٹھایا گیا۔ ایسے طبقات، کرداروں اور تجربات کو بھی ادبی اظہار میں

اہمیت ملنے لگی جو پہلے ادبی اور سماجی بیانیوں میں حاشیے پر تھے۔ یوں مابعد جدید نظم میں چھوٹی شناختوں، مقامی تجربات، علاقائی تہذیبوں اور مختلف انسانی آوازوں کی نمائندگی کے امکانات بڑھے۔ جدید نظم میں فرد کی تنہائی، اضطراب، وجودی بحران اور داخلی کشمکش اہم موضوعات تھے، جب کہ مابعد جدید نظم ان موضوعات کے ساتھ ساتھ شناخت کی شکست وریخت، ثقافتی تنوع، زبان کے غیر یقینی کردار، مختلف بیانیوں اور معنی کی تکثیریت کو بھی سامنے لاتی ہے۔ مابعد جدید نظم کی زبان بھی عموماً تجرباتی اور تہہ دار ہوتی ہے۔ اس میں طنز، پیروڈی، اقتباس، علامت، تلمیح، بین المتونیت، تجرید، کولاژ اور مختلف اسالیب کے امتزاج سے کام لیا جاسکتا ہے۔ شاعر ایک حتمی نتیجہ دینے کے بجائے قاری کے سامنے مختلف معنوی امکانات کھول دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ مابعد جدیدیت نے اردو نظم کو کسی ایک نظریے یا طرزِ فکر کی پابندی سے نکال کر تنوع، تکثیریت اور آزاد تعبیر کی طرف مائل کیا۔ اس نے متن، شاعر اور قاری کے تعلق کو نئی نظر سے دیکھا اور نظم کو مختلف تہذیبی، تاریخی اور لسانی حوالوں کے ساتھ مربوط کرنے کے نئے امکانات پیدا کیے۔

12.5: فرہنگ

1۔ مابعد جدیدیت	:	جدیدیت کے بعد سامنے آنے والا فکری و ادبی رجحان
2۔ تکثیریت	:	متعدد خیالات اور امکانات کی موجودگی
3۔ مرکزیت	:	کسی ایک تصور یا نقطہ نظر کو بنیادی حیثیت دینا
4۔ لامرکزیت	:	کسی ایک مرکز یا حتمی اختیار کی نفی
5۔ ردِّ تشکیل	:	متن کے قائم شدہ معنی اور ساخت کا تنقیدی تجزیہ
6۔ بین المتونیت	:	ایک متن کا دوسرے متون سے تعلق
7۔ بیانیہ	:	کسی واقعے، تصور یا تجربے کو بیان کرنے کا طریقہ
8۔ عظیم بیانیہ	:	ایسا ہمہ گیر نظریہ جو پوری حقیقت کی وضاحت کا دعویٰ کرے۔
9۔ معنویت	:	معنی اور مفہوم کی کیفیت

10۔تعبیر : کسی متن یا خیال کی تشریح

11۔کثیر الجہتی : بہت سے پہلو رکھنے کی کیفیت

12۔حاشیہ : مرکزی دائرے سے باہر یا کم نمائندگی رکھنے والا حصہ

13۔اساطیر : قدیم دیومالائی قصے اور روایات

14۔پیروڈی : کسی معروف اسلوب یا متن کی طنزیہ نقل

15۔تلمیح : کسی معروف تاریخی، مذہبی یا ادبی واقعے کی طرف اشارہ

16۔کولاژ : مختلف اجزا کو ملا کر نئی تخلیقی صورت پیدا کرنا

17۔شکست وریخت : بکھراؤ، ٹوٹ پھوٹ

18۔عدم قطعیت : کسی بات کا قطعی اور حتمی نہ ہونا

19۔تہذیبی تنوع : مختلف ثقافتوں اور تہذیبی رویوں کی موجودگی

20۔لسانی تجربہ : زبان کے استعمال میں نیا اور غیر روایتی طریقہ

12.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: مابعد جدیدیت سے کیا مراد ہے؟ اس کے فکری اور ادبی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

سوال2: مابعد جدیدیت کی بنیادی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اردو نظم پر اس کے اثرات واضح کیجیے۔

سوال3: مابعد جدید نظم میں بین المتونیت، تکثیریت اور لامرکزیت کی اہمیت پر بحث کیجیے۔

سوال4: جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بنیادی امتیازات بیان کرتے ہوئے جدید اور مابعد جدید نظم کا تقابلی جائزہ لیجیے۔

سوال5: مابعد جدید نظم میں قاری، متن اور معنی کے باہمی تعلق کی وضاحت کیجیے۔

12.7: مشقی سوالات

مابعد جدیدیت میں عظیم بیانیوں سے عدم اعتماد سے کیا مراد ہے؟

مابعد جدید نظم میں حاشیائی آوازوں کو کس طرح اہمیت حاصل ہوتی ہے؟

بین المتونیت کی تعریف کرتے ہوئے نظم میں اس کی اہمیت بیان کیجیے۔

مابعد جدید نظم میں معنی کی تکثیریت سے کیا مراد ہے؟

6۔معروضی سوالات کے جوابات

(ج) جدیدیت

(ج) معنی کی کثرت

(الف) ژاک دریدا

(ج) قاری

(ج) بین المتونیت اور تکثیریت

12.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال نمبر 1: مابعد جدیدیت کا مفہوم، فکری اور ادبی پس منظر

جواب: مابعد جدیدیت ایک ایسا فکری، تہذیبی اور ادبی رجحان ہے جو بیسویں صدی کے آخری نصف میں جدیدیت کے بعد زیادہ نمایاں ہوا۔ اس نے جدیدیت کے بعض بنیادی تصورات، خصوصاً عقل، ترقی، مرکزیت، واحد حقیقت اور آفاقی صداقت کے دعووں پر سوالات اٹھائے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا میں سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی، صارفیت، عالمگیریت اور مختلف ثقافتوں کے باہمی اختلاط نے انسانی زندگی کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ ایسے ماحول میں یہ تصور کمزور ہونے لگا کہ دنیا کی تمام حقیقتوں کو کسی ایک نظریے کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت کسی ایک حتمی حقیقت کے بجائے متعدد حقیقتوں اور نقطہ ہائے نظر کو اہمیت دیتی ہے۔ اس کے مطابق معنی جامد نہیں ہوتے بلکہ قاری، متن اور سیاق و سباق کے باہمی تعلق سے تشکیل پاتے ہیں۔

ژاک دریدا، لیوتار، مشیل فوکو اور رولان بارت کے مباحث نے مابعد جدید فکری فضا کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ دریدا کے ردِ تشکیل، لیوتار کے عظیم بیانیوں پر عدم اعتماد اور بارت کے مصنف کی مرکزیت سے متعلق مباحث نے ادب کی تعبیر کے نئے راستے کھولے۔ اردو

ادب میں بھی ان تصورات نے تنقید، افسانہ، ناول اور نظم کے مطالعے کو متاثر کیا۔ مابعد جدیدیت نے اردو ادب میں تنوع، تکثیریت، بین المتونیت اور حاشیائی آوازوں کی اہمیت کو نمایاں کیا۔

سوال نمبر 2: مابعد جدیدیت کی خصوصیات اور اردو نظم پر اثرات

جواب: مابعد جدیدیت کی بنیادی خصوصیات میں تکثیریت، لامرکزیت، عدم قطعیت، بین المتونیت، ردِ تشکیل، حاشیائی آوازوں کی بازیافت اور عظیم بیانیوں سے عدم اعتماد شامل ہیں۔ مابعد جدیدیت کسی ایک نظریے یا حقیقت کو حتمی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک حقیقت مختلف افراد اور معاشروں کے لیے مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ اسی لیے ادب میں بھی متعدد نقطہ ہائے نظر اور مختلف تعبیروں کو قبول کیا جاتا ہے۔ اردو نظم پر مابعد جدیدیت نے موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے اثرات مرتب کیے۔ شاعر نے مختلف تہذیبی، تاریخی اور ادبی حوالوں کو ایک ہی نظم میں یکجا کرنا شروع کیا۔ ماضی کے متون، اساطیر اور روایات کو نئے تناظر میں استعمال کیا گیا۔ مابعد جدید نظم میں معنی کی کثرت پیدا ہوتی ہے۔ شاعر کسی ایک نتیجے یا پیغام کو مسلط کرنے کے بجائے نظم کو اس طرح تشکیل دیتا ہے کہ قاری خود اس کے مختلف معنوی امکانات دریافت کر سکے۔ اسی طرح طنز، پیروڈی، کولاژ، اقتباس، علامت اور بین المتونیت جیسے فنی وسائل کے استعمال نے نظم کے اظہار کو مزید وسیع کیا۔ اس اعتبار سے مابعد جدیدیت نے اردو نظم کو تنوع اور نئے تجربات سے ہم کنار کیا۔

سوال نمبر 3: بین المتونیت، تکثیریت اور لامرکزیت

جواب: بین المتونیت مابعد جدید فکر کا ایک اہم تصور ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی بھی ادبی متن مکمل طور پر الگ تھلگ نہیں ہوتا بلکہ دوسرے متون، روایات، زبانوں اور ثقافتی حوالوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مابعد جدید نظم میں شاعر کسی قدیم نظم، شعر، داستان، تاریخی واقعے، مذہبی روایت یا اساطیری کردار کو نئے معنی میں استعمال کر سکتا ہے۔ اس طرح پرانے اور نئے متن کے درمیان ایک تخلیقی مکالمہ قائم ہوتا ہے۔ تکثیریت سے مراد مختلف نظریات، شناختوں اور معانی کی موجودگی کو قبول کرنا ہے۔ مابعد جدید نظم کسی ایک معنی یا نقطۂ نظر کو حتمی قرار دینے کے بجائے مختلف امکانات کو جگہ دیتی ہے۔ لامرکزیت کا مطلب کسی ایک فرد، نظریے، زبان، طبقے یا ثقافت کو مرکزی اور برتر مقام نہ دینا ہے۔ مابعد جدید ادب ان آوازوں کو بھی اہمیت دیتا ہے جو روایتی طور پر حاشیے پر رہی ہیں۔ اس طرح بین المتونیت، تکثیریت اور لامرکزیت مابعد جدید نظم کو کشادگی، تنوع اور وسیع معنوی امکانات فراہم کرتی ہیں۔

سوال نمبر 4: جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا تقابلی جائزہ

جواب: جدیدیت اور مابعد جدیدیت دونوں نے اردو ادب اور خصوصاً نظم پر گہرے اثرات مرتب کیے، لیکن دونوں کے فکری رویوں میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ جدیدیت فرد کی ذات، تنہائی، بیگانگی، داخلی اضطراب اور وجودی مسائل پر زور دیتی ہے۔ جدید شاعر اپنے داخلی تجربے کو مرکز بناتا ہے اور علامت، استعارہ، تجرید اور ابہام کے ذریعے اسے پیش کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مابعد جدیدیت کسی ایک مرکز کے تصور کو قبول نہیں کرتی۔ وہ فرد کے ساتھ معاشرے کی مختلف شناختوں، ثقافتوں، حاشیائی طبقات اور مختلف نقطہ ہائے نظر کو بھی اہمیت دیتی ہے۔ جدیدیت میں کسی داخلی یا وجودی حقیقت کی تلاش نمایاں ہوسکتی ہے، جب کہ مابعد جدیدیت حقیقت کو متعدد اور متغیر صورتوں میں دیکھتی ہے۔ جدیدیت میں سنجیدہ وجودی تجربہ نمایاں ہوتا ہے، جبکہ مابعد جدیدیت میں طنز، پیروڈی، کھیل، کولاژ اور مختلف متون کی آمیزش بھی اہم ہوسکتی ہے۔

جدید نظم میں تنہائی، وجودی بحران اور فرد کی داخلی کشمکش نمایاں ہے۔ مابعد جدید نظم میں ان موضوعات کے ساتھ شناخت، ثقافتی تنوع، بین المتونیت، تاریخ کی نئی تعبیر اور معنی کی تکثیریت بھی اہم ہوجاتی ہے۔ یوں مابعد جدیدیت نے جدیدیت کو مکمل طور پر رد کرنے کے بجائے اس کے قائم کردہ تصورات پر سوالات اٹھائے اور ادب کے نئے امکانات پیدا کیے۔

سوال نمبر 5: مابعد جدید نظم میں قاری، متن اور معنی

جواب: مابعد جدید نظریات نے ادب میں قاری کے کردار کو بہت اہمیت دی ہے۔ روایتی تصور میں مصنف کو متن کے معنی کا بنیادی سرچشمہ سمجھا جاتا تھا، لیکن مابعد جدید فکر میں متن کا مفہوم صرف مصنف کی نیت تک محدود نہیں رہتا۔ ہر قاری اپنے علمی، تہذیبی، سماجی اور شخصی تجربات کے ساتھ کسی متن کا مطالعہ کرتا ہے۔ اسی لیے ایک ہی نظم مختلف قارئین کے سامنے مختلف معنوی امکانات پیدا کرسکتی ہے۔ مابعد جدید نظم میں شاعر اکثر معنی کو مکمل اور حتمی صورت میں پیش نہیں کرتا۔ علامت، تلمیح، بین المتونیت، ابہام اور مختلف بیانیوں کے ذریعے نظم کو اس طرح تشکیل دیا جاتا ہے کہ قاری اس کی تعبیر کے عمل میں سرگرم طور پر شریک ہو۔ اس طرح متن، مصنف اور قاری کے درمیان تعلق یک طرفہ نہیں رہتا۔ معنی متن میں مکمل طور پر بند نہیں ہوتے بلکہ متن اور قاری کے باہمی تعامل سے نئے معانی سامنے آتے رہتے ہیں۔ مابعد جدید نظم کی یہی خصوصیت اسے کثیر المعنی اور تہہ دار بناتی ہے اور قاری کو محض معنی وصول کرنے والا نہیں بلکہ معنی کی تشکیل میں شریک بناتی ہے۔

12.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

13 اردو نظم میں ہیئتی تجربات: آزاد نظم، نظمِ معرّیٰ، ہائیکو، ترائیلے اور ترو ینی

ساخت

13.0 اغراض ومقاصد
13.1 تعارف
13.2 اردو نظم میں ہیئتی تجربات
13.2.1 آزاد نظم
13.2.3 نظمِ معرّیٰ
13.2.4 ہائیکو
13.2.5 ترائیلے
13.2.6 ترو ینی
13.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں
13.4 عمومی جائزہ
13.5 فرہنگ
13.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
13.7 مشقی سوالات
13.8 جوابات سرگرمی
13.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔
13.9 امدای کتب

13.0 :اغراض ومقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ اردو نظم میں ہیئت کے تصور، اس کی اہمیت اور وقت کے ساتھ اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقف ہوسکیں گے۔ آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ اردو شاعری میں روایتی اصناف اور مروجہ شعری سانچوں کے ساتھ ساتھ جدید شعرا نے نئی فنی اور ہیئتی صورتوں کو کیوں اختیار کیا اور ان تجربات نے اردو نظم کے دائر؟ اظہار کو کس طرح وسعت عطا کی۔ اس سبق کے ذریعے آپ پابند نظم سے آزاد نظم، نظمِ معرّیٰ اور نثری نظم تک کے ہیئتی سفر اور ان کی بنیادی خصوصیات کو سمجھ سکیں گے۔

اس سبق کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ آپ جدید اردو نظم میں وزن، بحر، قافیہ، ردیف، مصرعوں کی ترتیب اور بندوں کی ساخت میں ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ کرسکیں۔ آپ کو یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ جدید شعراء نے روایتی شعری اصولوں سے انحراف محض جدت پسندی کے لیے نہیں کیا بلکہ نئے عہد کے پیچیدہ احساسات، تجربات اور مسائل کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرنے کے لیے نئے اسالیب اور نئی ہیئتوں کی تلاش کی۔ اس مطالعے کے بعد آپ اردو نظم کی مختلف ہیئتوں میں امتیاز کرنے، ان کی فنی خصوصیات کو سمجھنے اور جدید نظم کے ارتقائی سفر کا تنقیدی جائزہ لینے کے قابل ہوسکیں گے۔

13.1:تعارف

اردو شاعری کی تاریخ میں نظم نے موضوع، زبان، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے مسلسل ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ ابتدا میں اردو شاعری پر غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور دیگر روایتی اصناف کا غلبہ تھا۔ ان اصناف کے اپنے مخصوص فنی اصول، اوزان اور ہیئتی تقاضے تھے۔ نظم کے ابتدائی اور ترقی یافتہ ادوار میں بھی شاعر عموماً بحر، وزن، قافیہ اور ردیف کی مقررہ پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ تاہم بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور فکری حالات نے شاعری کے موضوعات کے ساتھ اس کی ہیئت کو بھی متاثر کیا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بالخصوص بیسویں صدی میں اردو نظم کے مزاج میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ جدید زندگی کے نئے مسائل، فرد کی داخلی کشمکش، صنعتی اور سائنسی ترقی، سیاسی تغیرات، عالمی جنگوں کے اثرات اور نئے فلسفیانہ و ادبی رجحانات نے شاعر کے تجربے کو پہلے سے زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ چنانچہ جدید شعراء نے محسوس کیا کہ بعض نئے تجربات اور احساسات کو روایتی شعری سانچوں میں پوری طرح سمویا نہیں جا سکتا۔ اسی احساس نے اردو نظم میں ہیئت کے نئے تجربات کی راہ ہموار کی۔

ہیئت سے مراد کسی ادبی تخلیق کی ظاہری اور فنی ساخت ہے۔ نظم کے حوالے سے مصرعوں کی طوالت، بحر و وزن، قافیہ و ردیف، بندوں کی ترتیب، صوتی آہنگ اور مجموعی ساخت اس کی ہیئت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جدید اردو شعرا نے انہی عناصر میں مختلف نوعیت کے تجربات کیے۔ کہیں قافیہ و ردیف کی روایتی پابندی کو نرم کیا گیا، کہیں مصرعوں کی مقررہ طوالت ختم ہوئی اور کہیں بحر و وزن کے روایتی نظام سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح اردو نظم میں پابند نظم کے ساتھ نظمِ معرّیٰ، آزاد نظم اور بعد ازاں نثری نظم جیسی صورتیں نمایاں ہوئیں۔

ہیئت کے یہ نئے تجربات اردو نظم کی روایت سے مکمل لاتعلقی نہیں تھے بلکہ بدلتے ہوئے عہد کے تقاضوں کے مطابق شعری اظہار کو نئی وسعت دینے کی کوشش تھے۔ جدید شعرا نے نظم کی خارجی ساخت کے ساتھ اس کے داخلی آہنگ، علامت، استعارے، پیکر تراشی اور خیال کی تنظیم پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اس عمل کے نتیجے میں اردو نظم ایک ایسی وسیع اور لچک دار صنف کے طور پر سامنے آئی جس میں جدید انسان کے انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی اور تہذیبی تجربات کو زیادہ آزادی اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا۔ زیرِ نظر سبق میں آپ اردو نظم میں ہونے والے انہی ہیئتی تجربات، ان کے پس منظر، ضرورت، مختلف صورتوں اور فنی اہمیت کا مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعے سے آپ کو نہ صرف جدید اردو نظم کی ساخت اور فنی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ یہ بھی واضح ہوگا کہ اردو نظم نے روایت سے استفادہ کرتے ہوئے نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی ہیئت اور طرزِ اظہار میں کس طرح تبدیلیاں پیدا کیں۔

13.2 :اردو نظم میں ہیئتی تجربات

اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ شاعری کا فن ہمیشہ اپنے عہد کے فکری، سماجی، تہذیبی اور جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ غزل اور نظم اردو شاعری کی دو اہم اصناف ہیں، لیکن ان دونوں کے فنی مزاج، ہیئت اور موضوعاتی امکانات میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ غزل نے اپنی مخصوص ہیئت، قافیہ، ردیف، بحر اور غزلیہ مزاج کے ذریعے صدیوں تک اردو شاعری پر حکمرانی کی، تاہم جب زندگی کے مسائل پیچیدہ ہونے لگے، انسانی شعور میں وسعت پیدا ہوئی اور جدید عہد کے تجربات کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو شاعروں نے روایتی شعری ہیئتوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اردو نظم میں نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ نئی ہیئتوں کے تجربات بھی ہونے لگے۔ یہی تجربات آگے چل کر اردو نظم کی جدید تشکیل کا سبب بنے۔

ہیئت سے مراد کسی ادبی فن پارے کی ظاہری ساخت، ترتیب اور فنی صورت ہے۔ شاعری میں بحر، وزن، قافیہ، ردیف، مصرعوں کی ساخت، بندوں کی ترتیب اور اظہار کے مخصوص طریقے مل کر شعری ہیئت تشکیل دیتے ہیں۔ کلاسیکی اردو شاعری میں ہیئت کے اصول نسبتاً متعین

تھے،لیکن جدید دور میں شاعر نے اس بات کو محسوس کیا کہ بعض نئے تجربات، خیالات اور جذبات کو قدیم شعری سانچوں میں پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔اس احساس نے شاعروں کو ہیئتی تجربات کی طرف متوجہ کیا۔نتیجتاً اردو نظم میں پابند نظم کے ساتھ آزاد نظم، نظمِ معرّیٰ، ہائیکو، ترائیلے اور دیگر مغربی و مشرقی شعری ہیئتوں کے تجربات سامنے آئے۔ان تجربات نے اردو نظم کو اظہار کے نئے امکانات عطا کیے اور اسے جدید زندگی کے زیادہ قریب کر دیا۔اردو نظم میں ہیئتی تجربات کا باقاعدہ پس منظر انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پیدا ہونے والی ادبی بیداری سے وابستہ ہے۔انجمنِ پنجاب کے زیرِ اثر اردو شاعری میں نظم کو ایک نئے ادبی وسیلے کی حیثیت حاصل ہوئی۔محمد حسین آزاد اور حالی نے شاعری کو زندگی، فطرت، معاشرت اور اخلاقی شعور سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔حالی کی ''مسدسِ حالی''، ''حبِ وطن''، ''برکھارت'' اور دیگر نظموں میں موضوعاتی وسعت کے ساتھ نظم کے فنی امکانات بھی نمایاں ہوئے۔بعد میں اقبال نے نظم کو فلسفیانہ، قومی، تہذیبی اور روحانی موضوعات سے مالا مال کیا۔ اگرچہ ان شعرا کی بیشتر نظمیں روایتی اوزان اور ہیئتوں سے وابستہ تھیں، لیکن ان کے ہاں نظم کے موضوع اور داخلی ساخت میں جو وسعت پیدا ہوئی، اس نے آگے آنے والے شعرا کے لیے نئے تجربات کی راہ ہموار کی۔

بیسویں صدی میں مغربی ادب سے بڑھتے ہوئے روابط، انگریزی ادب کے تراجم اور عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات نے اردو شاعری کے مزاج کو بڑی حد تک تبدیل کیا۔علامہ اقبال کے بعد اردو نظم میں ن۔م۔راشد، میراجی، مجاز، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، اختر الایمان، مجید امجد، اختر شیرانی اور دیگر شعرا نے نظم کے دائر ؟ اظہار کو وسیع کیا۔خصوصاً ترقی پسند تحریک اور حلق ؟ اربابِ ذوق نے اردو نظم کو نئے موضوعات اور ہیئتی تجربات سے ہم کنار کیا۔ترقی پسند شعرا نے زندگی کے اجتماعی مسائل، طبقاتی کشمکش، آزادی، مزدور، کسان اور انسانی استحصال کو نظم کا موضوع بنایا، جبکہ حلق ؟ اربابِ ذوق سے وابستہ شعرا نے فرد کے داخلی مسائل، تنہائی، وجودی کرب، نفسیاتی پیچیدگیوں اور جدید شہری زندگی کے تجربات کو اہمیت دی۔اس طرح موضوعاتی تبدیلی کے ساتھ ہیئتی تبدیلی بھی اردو نظم کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی۔

13.2.1: آزاد نظم

آزاد نظم اردو شاعری میں ہیئتی تجربات کی سب سے اہم اور مؤثر صورت ہے۔آزاد نظم سے مراد ایسی نظم ہے جس میں شاعر روایتی پابندیوں، خصوصاً یکساں مصرعی ساخت، قافیہ اور ردیف کی لازمی پابندی سے بڑی حد تک آزاد ہوتا ہے تاہم اس میں داخلی آہنگ، صوتی ربط، تلازم ؟ خیال اور شعری موسیقیت موجود رہتی ہے۔آزاد نظم کو صرف وزن سے مکمل آزادی قرار دینا درست نہیں کیونکہ اردو آزاد نظم کے مختلف

تجربات میں وزن اور آہنگ کی مختلف صورتیں سامنے آئی ہیں۔آزاد نظم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیال، جذبے اور تجربے کے مطابق مصرعوں کی طوالت اور ترتیب میں آزادی حاصل ہوتی ہے۔

اردو میں آزاد نظم کے فروغ میں ن۔م۔راشد، میراجی اور مخدوم محی الدین کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ن۔م۔راشد نے اردو نظم کو ایک نئی فکری اور فنی سمت عطا کی۔ان کی نظموں میں جدید انسان کی بے چینی، فرد کی تنہائی، تہذیبی بحران، عشق، زندگی اور موت جیسے موضوعات نئے اسلوب میں سامنے آتے ہیں۔''حسن کوزہ گر''، ''زندگی سے ڈرتے ہو'' اور ''گماں کا ممکن'' جیسی نظموں میں راشد نے شعری اظہار کی روایتی ساخت سے ہٹ کر ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں خیال اور تجربے کی داخلی کیفیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ان کی شاعری نے اردو نظم کو محض خارجی واقعات کے بیان سے نکال کر جدید انسان کے باطن سے جوڑ دیا۔

میراجی نے بھی آزاد نظم کی تشکیل اور ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔انہوں نے مشرقی اور مغربی شعری روایات سے استفادہ کرتے ہوئے نظم میں نئے اسلوب، نئی علامتوں اور نئی لفظیات کو جگہ دی۔ان کی شاعری میں جنس، لاشعور، تنہائی، انسانی خواہشات اور داخلی کشمکش کے موضوعات نمایاں ہیں۔میراجی کے ہاں نظم محض خیالات کی ترسیل نہیں بلکہ ایک پیچیدہ داخلی تجربے کی شعری تشکیل بن جاتی ہے۔اس طرح آزاد نظم نے شاعر کو اپنے تجربے کی نوعیت کے مطابق اظہار کا وسیع میدان فراہم کیا۔آزاد نظم کے سلسلے میں ایک اہم نام مخدوم محی الدین کا ہے انھوں نے ترقی پسند تحریک کے دور میں ہیئت اور تکنیک کے نئے تجربات کیے۔مخدوم نے روایتی پابند نظموں کے علاوہ معریٰ اور آزاد نظم کے قریب تر آہنگ کو اپنایا۔ان کے یہاں خیالات کی روانی اور وسعت نظم کے بندوں کو نیا آہنگ دیتی ہے۔مخدوم محی الدین کی آزاد نظم ''چاند تاروں کا بن،، ملاحظہ کیجیے۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن

رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے

پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے

منتظر مرد و زن

مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے

خارزارِ الم بن گئے

رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو

جوئے خوں بن گیا

کچھ امامانِ صد مکر و فن

ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی

ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں

اک کمیں گاہ سے

پھینک کر اپنی نوکِ زباں

خون نورِ سحر پی گئے

رات کی چھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے

صبح کا کچھ اجالا بھی ہے

ہمدمو!

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دل دار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

13.2.3: نظمِ معرّیٰ

نظمِ معرّیٰ بھی اردو نظم میں ایک اہم ہیئتی تجربہ ہے۔ نظمِ معرّیٰ سے مراد ایسی نظم ہے جس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی، لیکن بحر اور وزن کا التزام موجود رہتا ہے۔ اس اعتبار سے نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نظمِ معرّیٰ میں وزن کی پابندی برقرار رہتی ہے جبکہ آزاد نظم میں وزن کے معاملے میں زیادہ آزادی اختیار کی جاسکتی ہے۔ نظمِ معرّیٰ کا مقصد یہ تھا کہ شاعر قافیہ اور ردیف کی پابندی سے نجات حاصل کر کے خیال کی روانی کو برقرار رکھے، مگر شعری آہنگ اور موسیقیت بھی قائم رہے۔ جدید نظم کے نامور شاعر مجید امجد کی یہ نظمِ معرٰی جو بحرِ رمل (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں لکھی گئی ہے، کی مثال ملاحظہ کریں:

یہ معصوم بچوں کے رنگیں رسالے
جنہیں کھول کر مجھ سے کہتے ہیں بچے
لکھو اس پہ کچھ اپنی یادِ گرامی!

میں ہنس کر قلم ہاتھ میں لے تو لوں پر

لرزتا ہے دل، کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں؟

اردو نظم میں نظمِ معرّیٰ کے تجربات نے شاعر کو ایک ایسی فنی آزادی عطا کی جس میں نہ تو کلاسیکی قافیہ وردیف کی سخت پابندی تھی اور نہ ہی مکمل نثریت کا خطرہ۔ نظمِ معرّیٰ میں داخلی موسیقیت، وزن، صوتی مناسبت اور مصرعوں کی باقاعدہ ترتیب نظم کو شعری کیفیت عطا کرتی ہے۔ جدید نظم کے بہت سے شعراء نے اس ہیئت کو اختیار کر کے ایسے موضوعات کو بیان کیا جن کے لیے روایتی پابند نظم کی ہیئت موزوں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح نظمِ معرّیٰ نے اردو شاعری میں روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک اہم رابطے کا کردار ادا کیا۔

13.2.4: ہائیکو

اردو نظم میں مشرقی اور مغربی شعری ہیئتوں کے تجربات بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ جاپانی صنف ''ہائیکو'' اسی سلسلے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ہائیکو بنیادی طور پر جاپانی شاعری کی مختصر ترین شعری اصناف میں سے ایک ہے۔ اس کی کلاسیکی ساخت تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس میں مختصر الفاظ کے ذریعے کسی منظر، لمحے، کیفیت یا فطری تجربے کو بڑی معنوی گہرائی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ جاپانی ہائیکو میں فطرت اور انسانی احساس کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اردو شعراء نے جب ہائیکو کو اپنایا تو اس میں اردو زبان کی صوتی خصوصیات، تہذیبی ماحول اور مقامی تجربات کو شامل کیا۔ اردو ہائیکو کی سب سے نمایاں خصوصیت اختصار ہے۔ چند الفاظ میں ایک مکمل منظر یا ایک گہرا احساس پیش کرنا شاعر کے لیے آسان کام نہیں۔ ہائیکو میں لفظوں کی کثرت کے بجائے لفظوں کے انتخاب اور معنوی امکانات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا سا منظر کبھی تنہائی، کبھی محبت، کبھی موسم، کبھی فطرت اور کبھی انسانی زندگی کی کسی بنیادی حقیقت کی علامت بن جاتا ہے۔ اردو میں ہائیکو کے تجربے نے شعراء کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ مختصر ترین شعری ساخت میں اپنے عہد کے احساس اور تجربے کو بیان کریں۔ اس طرح ہائیکو نے اردو نظم میں اختصار، علامت اور تاثر کی نئی راہیں پیدا کیں۔

معتبر منزلوں کا راہی وہ

ہیں سمندر پناہ میں اس کی

ہے صدف آشنا سپاہی وہ

یہ ایک پتھر ہے جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

13.2.5: ترائیلے

ترائیلے بھی اردو نظم میں ہونے والے ہیئتی تجربات میں شامل ہیں۔ ترائیلے ایک ایسی شعری ہیئت ہے جس کا تعلق یورپی بالخصوص فرانسیسی شعری روایت سے ہے۔ اس میں مخصوص مصرعوں کی تکرار اور ترتیب کے ذریعے شعری وحدت پیدا کی جاتی ہے۔ ترائیلے کی اصل فنی خصوصیت اس کے مخصوص تکراری نظام میں پوشیدہ ہے۔ شاعر ایک ہی مصرع یا مصرعوں کو مختلف مقامات پر نئے معنوی سیاق کے ساتھ دہراتا ہے جس سے نظم میں موسیقیت، ربط اور معنوی تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔ اردو شعراء نے جب ترائیلے کے تجربات کیے تو اس کی فنی خصوصیات کو اردو زبان کے مزاج کے مطابق برتنے کی کوشش کی۔ ترائیلے کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس نے اردو شاعر کو یہ سکھایا کہ تکرار محض لفظوں کی تکرار نہیں بلکہ معنی کی تشکیل کا وسیلہ بھی بن سکتی ہے۔ ایک ہی مصرع مختلف سیاق میں مختلف معنی پیدا کر سکتا ہے اور اس طرح مختصر نظم میں معنوی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جدید شاعر کے لیے یہ تجربہ اس لیے اہم تھا کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ترائیلے نے اس مقصد کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔

یہ شعری صنف آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ایک ہی بند میں مکمل ہو جاتی ہے۔ ترائیلے میں کل آٹھ مصرعے ہوتے ہیں اور صرف دو قافیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کی ہیئت کے مطابق پہلا، چوتھا اور ساتواں مصرع بالکل ایک جیسا ہوتا ہے یعنی پہلا مصرع تین مرتبہ دہرایا جاتا ہے جب کہ دوسرا اور آٹھواں مصرع بھی ایک جیسا ہوتا ہے یعنی دوسرا مصرع دو مرتبہ آتا ہے۔ قافیے کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ پہلا، تیسرا، چوتھا، پانچواں اور ساتواں مصرع آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں جب کہ دوسرا، چھٹا اور آٹھواں مصرع دوسرے قافیے کے ساتھ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس مخصوص تکراری اور قافیہ بندی کے نظام کی وجہ سے ترائیلے میں موسیقیت، ربط اور معنوی تاثیر پیدا ہوتی ہے اور یہی خصوصیات اسے دوسری مختصر شعری اصناف سے ممتاز کرتی ہیں۔ عطا محمد شعلہ، احمد ندیم قاسمی، مظہر امام، رؤف خیر، حنیف کیفی وغیرہ اردو کے ممتاز ترائیلے نگار ہیں۔ مثال کے لیے رؤف خیر کے ایک ترائیلے "ٹائم کیپسول" کو ملاحظہ کیجیے؟۔

بنوامیہ ہی باقی، نہ ہیں بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ
ہوا و حرص بلاکس کو آ سکے ہیں راس
بنوامیہ ہی باقی، نہ ہیں بنو عباس
سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بوباس
ہر ایک حرف ہوس پر کھینچا خط تنسیخ
بنوامیہ ہی باقی، نہ ہیں بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

13.2.6: ترینی۔

ترینی اردو شاعری میں جدید دور کا ایک اہم ہیئتی تجربہ ہے جسے معروف شاعر گلزار نے متعارف کرایا۔ ''ترینی'' کا لفظ تین ندیوں کے سنگم کے مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس شعری ہیئت میں تین مصرعے ہوتے ہیں اور پہلے دو مصرعے بظاہر ایک مکمل خیال پیش کرتے ہیں، لیکن تیسرا مصرع اچانک ایک ایسا نیا مفہوم، انکشاف یا معنوی جہت سامنے لاتا ہے جس سے پہلے دونوں مصرعوں کے معنی بھی ایک نئے تناظر میں روشن ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ترینی محض تین مصرعوں کی مختصر نظم نہیں بلکہ اختصار، معنوی تہہ داری، تجسس اور فکری انکشاف کی ایک مخصوص شعری تکنیک ہے۔ گلزار نے اس ہیئت کے ذریعے مختصر الفاظ میں ایک وسیع اور گہرا مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ترینیوں میں روزمرہ زندگی، محبت، تنہائی، رشتوں، انسانی نفسیات اور معاشرتی تجربات کے مختلف پہلو نہایت مختصر مگر مؤثر انداز میں سامنے آتے ہیں۔

ترینی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا تیسرا مصرع ہے۔ پہلے دو مصرعے ایک خاص کیفیت یا مفہوم قائم کرتے ہیں، جبکہ تیسرا مصرع اس مفہوم میں ایک نئی معنوی پرت کا اضافہ کرتا ہے۔ یوں تیسرا مصرع پہلے دونوں مصرعوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا مجموعی تاثر پیدا کرتا ہے جو صرف تینوں مصرعوں کو ایک ساتھ پڑھنے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ترینی میں اختصار کے باوجود معنوی وسعت اور فکری گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہیئت جدید انسان کی تیز رفتار زندگی اور مختصر اظہار کے رجحان سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر گلزار کی ایک ترینی ملاحظہ کیجیے۔

وہ میرے ساتھ ہی تھا دور تک مگر اک دن

جو مڑ کے دیکھا تو وہ دوست

میرے ساتھ نہ تھا

پھٹی ہو جیب تو کچھ سکّے کھو بھی جاتے ہیں۔

اردو نظم میں ہائیکو اور ترویٰنی دونوں مختصر شعری ہیئتوں کی مثالیں ہیں تاہم دونوں کی فنی ساخت اور مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہائیکو کا تعلق جاپانی شعری روایت سے ہے جب کہ ترویٰنی جدید ہندوستانی شعری تجربے سے وجود میں آنے والی ہیئت ہے جسے گلزار نے اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعے ایک منفرد شناخت عطا کی۔ اس طرح ترویٰنی نے مختصر نظم کے دائرے میں ایک نیا تجربہ پیش کیا اور جدید شعری اظہار کے امکانات کو وسعت دی۔ اردو نظم میں ہیئتی تجربات کی اہمیت محض اس لیے نہیں کہ شاعروں نے نئی نئی اصناف یا ساختیں اختیار کیں، بلکہ ان تجربات کے ذریعے نظم کے مزاج اور تصور میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ روایتی نظم میں شاعر کے لیے ہیئت ایک نسبتاً متعین سانچہ تھی، جبکہ جدید شاعر کے لیے ہیئت خود اظہار کا ایک تخلیقی وسیلہ بن گئی۔ شاعر نے محسوس کیا کہ ہر تجربے کے لیے ایک ہی ہیئت موزوں نہیں ہو سکتی۔ محبت کے تجربے کے لیے ایک ساخت مناسب ہو سکتی ہے، تنہائی کے تجربے کے لیے دوسری، جنگ اور سیاسی انتشار کے لیے تیسری اور فطرت کے کسی مختصر لمحے کے لیے چوتھی ہیئت زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔ یہی احساس ہیئتی تجربات کی بنیادی روح ہے۔ جدید اردو نظم کی ترقی میں حلقہ اربابِ ذوق کا کردار بھی اسی حوالے سے اہم ہے۔ 1939ء میں لاہور میں قائم ہونے والے اس ادبی حلقے سے وابستہ شعرا نے اردو نظم کو داخلی تجربات، نفسیاتی کیفیات، علامتوں، استعاروں اور نئے فنی اسالیب سے روشناس کرایا۔ اس حلقے سے وابستہ شعرا نے نظم کی روایتی ساختوں کے ساتھ ساتھ آزاد نظم اور نظمِ معرّیٰ کے امکانات کو بھی وسعت دی۔ ان کے ہاں فرد کی داخلی دنیا، تنہائی، خوف، بے یقینی، محبت، موت اور جدید تہذیب کے مسائل نظم کا حصہ بنے۔ یوں اردو نظم خارجی زندگی کے بیان کے ساتھ ساتھ انسانی باطن کی ترجمان بھی بن گئی۔

ن۔م۔ راشد، میراجی، اختر الایمان اور مجید امجد جیسے شعراء نے اردو نظم میں ہیئتی تجربات کو محض فنی کھیل نہیں بننے دیا بلکہ انہیں انسانی تجربے کی گہرائی سے مربوط کیا۔ اختر الایمان کے ہاں نظم کی زبان اور ساخت میں سادگی کے باوجود ایک پیچیدہ فکری اور نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مجید امجد نے فطرت، وقت، سماجی زندگی اور انسانی وجود کے مسائل کو نئے شعری آہنگ کے ساتھ پیش کیا۔ ان شعرا کے تجربات سے واضح ہوتا ہے کہ کامیاب ہیئتی تجربہ وہی ہے جو موضوع، احساس اور اظہار کی ضرورت سے پیدا ہو، محض جدت دکھانے کے لیے اختیار نہ کیا جائے۔

اردو نظم میں ہیئتی تجربات نے زبان کے استعمال کو بھی متاثر کیا۔ پابند نظم میں شاعر کو اکثر بحر، قافیہ اور ردیف کی ضرورت کے مطابق الفاظ منتخب کرنے پڑتے ہیں، لیکن آزاد نظم میں اسے نسبتاً زیادہ لسانی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس آزادی نے جدید شاعر کو روزمرہ زبان، علامتی زبان، داخلی مکالمے، مکالماتی اسلوب اور مختلف صوتی تجربات اختیار کرنے کا موقع دیا۔ نتیجتاً اردو نظم کی زبان میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ نظم صرف ادبی اور شعری الفاظ کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق الفاظ بھی اس کا حصہ بننے لگے۔

ہیئتی تجربات کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی ہے کہ اردو نظم نے عالمی ادب کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کیا۔ ہائیکو نے جاپانی شعری روایت سے اردو کو جوڑا، ترائیلے نے یورپی شعری روایت کے تجربات سے آشنا کیا، جبکہ آزاد نظم اور نظمِ معرّیٰ کے ذریعے اردو شاعر نے مغربی جدید شاعری کے متعدد فنی رجحانات سے استفادہ کیا۔ تاہم اردو شعرا نے ان ہیئتوں کو محض نقل نہیں کیا بلکہ انہیں اردو زبان، ہندوستانی تہذیب اور اپنے عہد کے تجربات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ان ہیئتوں کی صورت اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہیئتی تجربات کے باوجود اردو نظم نے اپنی کلاسیکی روایت سے مکمل قطع تعلق نہیں کیا۔ جدید نظم میں بھی بحر، موسیقیت، تکرار، تشبیہ، استعارہ، علامت، تلمیح اور دیگر شعری عناصر کسی نہ کسی صورت میں موجود رہے۔ جدیدیت کا مطلب روایت سے مکمل انکار نہیں بلکہ روایت کے ساتھ نئے رشتے قائم کرنا بھی ہے۔ اسی لیے اردو نظم میں قدیم اور جدید، مشرقی اور مغربی، پابند اور آزاد، خارجی اور داخلی عناصر ایک دوسرے کے ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو نظم کے ہیئتی تجربات نے قاری کے ذوق کو بھی تبدیل کیا۔ روایتی نظم کا قاری عموماً بحر، قافیہ، ردیف اور واضح مضمون کی مدد سے نظم کو سمجھتا تھا، لیکن جدید نظم کے قاری کو علامت، ابہام، داخلی ربط اور معنوی تہہ داری پر بھی توجہ دینا پڑتی ہے۔ آزاد نظم، نظمِ معرّیٰ، ہائیکو، ترائیلے اور تدوینی نظم جیسی صورتوں نے قاری کو ایک نئے شعری ذوق سے آشنا کیا۔ اب نظم کا حسن صرف اس کی موسیقیت یا لفظی آرائش میں نہیں بلکہ اس کے فکری، نفسیاتی اور معنوی امکانات میں بھی تلاش کیا جانے لگا۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نظم میں ہیئتی تجربات اردو شاعری کی ترقی اور ارتقا کا ایک اہم باب ہیں۔ آزاد نظم نے شاعر کو روایتی قافیہ و ردیف کی پابندی سے بڑی حد تک آزاد کر کے خیال اور تجربے کی فطری روانی عطا کی، نظمِ معرّیٰ نے قافیہ و ردیف سے آزادی کے باوجود وزن اور آہنگ کو برقرار رکھا، ہائیکو نے اختصار اور فطری تاثر کو اردو نظم کا حصہ بنایا، ترائیلے نے تکرار اور مخصوص ساخت کے ذریعے نئے معنوی امکانات پیدا کیے اور تدوینی نظم نے مختلف متنی و لسانی عناصر کو نئی ترتیب میں پیش کر کے نظم کے تصور کو مزید وسعت دی۔ ان تمام تجربات نے اردو نظم کو جامد اور محدود صنف بننے سے محفوظ رکھا اور اسے بدلتی ہوئی زندگی، جدید انسان کے پیچیدہ تجربات اور نئے فکری تقاضوں کے اظہار کا مؤثر

ذریعہ بنایا۔ یوں اردو نظم کا ہیئتی ارتقا دراصل اس کے فکری اور موضوعاتی ارتقا سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جدید اردو نظم کی قوت اسی میں ہے کہ اس نے روایت کی بنیاد پر قائم رہتے ہوئے نئے تجربات کو قبول کیا اور اظہار کے ایسے نئے راستے تلاش کیے جن کے ذریعے بدلتے ہوئے انسان اور اس کی بدلتی ہوئی دنیا کو زیادہ مؤثر انداز میں شعری پیکر عطا کیا جا سکے۔

13.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال1: نظمِ معرّیٰ کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

(الف) اس میں ردیف لازمی ہوتی ہے
(ب) اس میں قافیہ وردیف کی پابندی نہیں ہوتی لیکن وزن قائم رہتا ہے
(ج) اس میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں
(د) اس میں ہر مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے

سوال2: آزاد نظم میں شاعر کو سب سے زیادہ آزادی کس معاملے میں حاصل ہوتی ہے؟

(الف) موضوع کے انتخاب میں
(ب) مصرعوں کی طوالت اور روایتی قافیہ وردیف کی پابندی میں
(ج) صرف زبان کے استعمال میں
(د) عنوان کے انتخاب میں

سوال3: ہائیکو بنیادی طور پر کس زبان وادب کی صنف ہے؟

(الف) فارسی
(ب) عربی
(ج) جاپانی
(د) فرانسیسی

سوال4: ترائیلے (Triolet) میں عام طور پر کتنی سطریں ہوتی ہیں؟

(الف) تین
(ب) پانچ
(ج) آٹھ
(د) دس

سوال5: ترویلی کو جدید ہندوستانی شاعری میں مقبول بنانے کا سہرا کس شاعر کے سر ہے؟

(الف) فیض احمد فیض
(ب) گلزار
(ج) ن۔م۔راشد
(د) میراجی

13.4: عمومی جائزہ

اردو نظم نے اپنے ارتقائی سفر میں صرف موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے ہی تبدیلیاں قبول نہیں کیں بلکہ اس کی ہیئت میں بھی متعدد نئے تجربات کیے گئے۔ ابتدا میں اردو شاعری پر غزل، قصیدہ، مثنوی اور مسدس جیسی پابند اصناف کا غلبہ تھا جن میں بحر، وزن، قافیہ اور ردیف کے مقررہ اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی۔ جدید دور میں بدلتے ہوئے سماجی، تہذیبی اور فکری حالات نے شاعروں کو نئی ہیئتوں کی طرف متوجہ کیا۔ نتیجتاً نظمِ معرّیٰ، آزاد نظم، ہائیکو، ترائیلے اور ترویٰنی جیسی صورتیں اردو شاعری کا حصہ بنیں۔

نظمِ معرّیٰ ایسی نظم ہے جس میں شاعر عموماً ایک مخصوص وزن یا بحر کو برقرار رکھتا ہے لیکن قافیہ اور ردیف کی روایتی پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔ انگریزی ادب کی Blank Verse سے اس کا تقابلی تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ نے شاعر کو طویل خیالات، مکالماتی انداز اور مسلسل فکری اظہار کے بہتر امکانات فراہم کیے۔ آزاد نظم نے نظمِ معرّیٰ کے مقابلے میں ہیئت کو مزید لچک دی۔ اس میں مصرعوں کی لمبائی یکساں ہونا ضروری نہیں اور قافیہ و ردیف کی پابندی بھی لازم نہیں ہوتی۔ شاعر اپنے خیال، جذبے اور داخلی کیفیت کے مطابق مصرعوں کی ترتیب قائم کرتا ہے۔ تاہم آزاد نظم بے ترتیبی کا نام نہیں بلکہ اس کا اپنا داخلی آہنگ، صوتی ربط اور فکری تنظیم ہوتی ہے۔ اردو میں ن۔م۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان نے آزاد نظم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ہائیکو جاپانی شاعری کی مختصر صنف ہے جو روایتی طور پر تین سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جاپانی روایت میں اس کی صوتی ساخت 5-7-5 کے نمونے سے وابستہ ہے۔ ہائیکو میں کسی منظر، موسم، فطرت یا مختصر تجربے کو نہایت اختصار اور معنویت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اردو شاعروں نے ہائیکو کو اپنے لسانی اور تہذیبی مزاج کے مطابق قبول کیا۔ ترائیلے (Triolet) یورپی بالخصوص فرانسیسی روایت سے وابستہ آٹھ مصرعوں کی مختصر صنف ہے۔ اس کی خاص خصوصیت بعض مصرعوں کی تکرار ہے۔ یہی تکرار نظم میں موسیقیت اور معنوی زور پیدا کرتی ہے۔ اردو میں بھی بعض شاعروں نے اس ہیئت میں تجربات کیے ہیں۔ ترویٰنی تین مصرعوں پر مشتمل جدید شعری ہیئت ہے جسے گلزار نے مقبول بنایا۔ اس میں پہلے دو مصرعے بظاہر ایک مکمل مفہوم پیش کرتے ہیں، لیکن تیسرا مصرع ایک نیا زاویہ پیدا کر کے پہلے دونوں مصرعوں کے معنی کو وسعت، گہرائی یا غیر متوقع معنوی تبدیلی عطا کرتا ہے۔ اس طرح اردو نظم کی یہ نئی ہیئتیں اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ اردو شاعری نے وقت کے ساتھ اپنے اظہار کے طریقوں کو وسیع کیا۔ ان تجربات نے شاعر کو زیادہ آزادی عطا کی اور جدید انسان کے پیچیدہ احساسات، تجربات اور فکری مسائل کو نئی صورتوں میں پیش کرنے کے امکانات پیدا کیے۔

13.5: فرہنگ

1۔ ہئیت : بناوٹ، ساخت، ظاہری شکل

2۔ معرّیٰ : آزاد، کسی پابندی سے خالی

3۔ ارتقا : بتدریج ترقی اور نشوونما

4۔ پابند : اصول یا قاعدے کا مقید

5۔ قافیہ : مصرعوں کے آخر میں ہم آواز الفاظ

6۔ ردیف : قافیہ کے بعد بار بار آنے والا یکساں لفظ یا فقرہ

7۔ بحر : شاعری کے وزن کا مقررہ سانچہ

8۔ وزن : شعری آہنگ کی باقاعدہ پیمائش

9۔ آہنگ : لے، صوتی حسن

10۔ صوتی : آواز سے متعلق

11۔ اختصار : کم الفاظ میں بات کہنا

12۔ معنویت : معنی کی گہرائی اور اہمیت

13۔ تکرار : کسی لفظ یا مصرعے کو دوبارہ لانا

14۔ داخلی : اندرونی

15۔ تہذیبی : تمدن اور ثقافت سے متعلق

16۔ اظہار : خیال یا جذبے کو بیان کرنا

17۔ لچک : حالات کے مطابق تبدیلی کی گنجائش

18۔ روایت : نسل در نسل منتقل ہونے والا طریقہ

19۔ تجربہ : نئی صورت یا طریقہ آزمانا

20۔ صوتی ربط : آوازوں اور آہنگ کا باہمی تعلق

13.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

1 ۔ اردو نظم میں ہیئت سے کیا مراد ہے؟

2 ۔ آزاد نظم کے تین اہم اردو شاعروں کے نام لکھیے۔

3 ۔ ہائیکو اور ترویٰنی میں کیا فرق ہے؟

4 ۔ ترائیلے میں تکرار کی کیا اہمیت ہے؟

13.7: مشقی سوالات

سوال1: اردو نظم میں ہیئت کے نئے تجربات کی ضرورت اور اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

سوال2: نظمِ معرّیٰ کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال3: آزاد نظم کیا ہے؟ نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم کے درمیان فرق واضح کیجیے۔

سوال4: ہائیکو اور ترائیلے کی ہیئت، ساخت اور نمایاں خصوصیات پر نوٹ لکھیے۔

سوال5: ترویٰنی کی تعریف کرتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات اور تیسری سطر کی اہمیت بیان کیجیے۔

13.8: جوابات سرگرمی

(ب) اس میں قافیہ وردیف کی پابندی نہیں ہوتی لیکن وزن قائم رہتا ہے۔

(ب) مصرعوں کی طوالت اور روایتی قافیہ وردیف کی پابندی میں۔

(ج) جاپانی۔

(ج) آٹھ۔

(ب) گلزار۔

13.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: اردو نظم میں ہیئت کے نئے تجربات کی ضرورت اور اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

جواب: اردو شاعری کی قدیم روایت میں شعرا عموماً مقررہ بحور، اوزان، قوافی اور اصناف کے اصولوں کے مطابق شاعری کرتے تھے۔ لیکن جدید عہد میں انسانی زندگی، سماج، سیاست، نفسیات اور تہذیبی حالات میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جدید انسان کے پیچیدہ تجربات کو ہمیشہ روایتی شعری سانچوں میں پیش کرنا آسان نہیں تھا۔ اسی ضرورت نے اردو شاعروں کو نئی ہیئتوں کے تجربات کی طرف راغب کیا۔

نظمِ معرّیٰ نے شاعر کو قافیہ اور ردیف کی پابندی سے آزادی دی۔ آزاد نظم نے مصرعوں کی یکساں طوالت اور روایتی ساخت کو مزید لچکدار بنا دیا۔ اسی طرح ہائیکو، ترائیلے اور ترویني نے کم الفاظ میں گہرا مفہوم پیش کرنے کے نئے امکانات پیدا کیے۔ ان تجربات کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو عالمی ادبی رجحانات سے قریب کیا، شاعر کے دائرۂ اظہار کو وسیع کیا اور جدید زندگی کے متنوع تجربات کو پیش کرنے کے لیے نئی فنی صورتیں فراہم کیں۔

سوال2: نظمِ معرّیٰ کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

جواب: نظمِ معرّیٰ ایسی نظم ہے جس میں شاعر قافیہ اور ردیف کی پابندی سے آزاد ہوتا ہے، البتہ شعری وزن اور بحر کا بنیادی نظام قائم رہتا ہے۔ اسے انگریزی کی Blank Verse سے مماثل قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں قافیہ و ردیف لازم نہیں ہوتے، شعری وزن برقرار رہتا ہے، خیال نسبتاً مسلسل انداز میں آگے بڑھتا ہے اور شاعر کو پابند نظم کے مقابلے میں اظہار کی زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ نظمِ معرّیٰ طویل فکری، بیانیہ اور ڈرامائی اظہار کے لیے بھی موزوں ثابت ہوئی۔

سوال3: آزاد نظم کیا ہے؟ نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم کے درمیان فرق واضح کیجیے۔

جواب: آزاد نظم جدید اردو شاعری کی ایک اہم ہیئت ہے جس میں شاعر روایتی قافیہ و ردیف اور مصرعوں کی یکساں ساخت سے بڑی حد تک آزاد ہوتا ہے۔ اس میں مصرعے خیال اور جذبے کی ضرورت کے مطابق چھوٹے یا بڑے ہو سکتے ہیں۔ آزاد نظم کا حسن اس کے داخلی آہنگ، لفظی مناسبت، صوتی ترتیب اور فکری وحدت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نظمِ معرّیٰ میں وزن کا تسلسل زیادہ واضح اور منظّم ہوتا ہے، جب کہ آزاد نظم میں مصرعوں کی طوالت اور عروضی اکائیوں کی ترتیب میں زیادہ آزادی پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قافیہ و ردیف کی روایتی پابندی ضروری نہیں۔

اردو میں ن۔م۔راشد، میراجی اور اختر الایمان آزاد نظم کے اہم شعرا شمار ہوتے ہیں۔

سوال4: ہائیکو اور ترائیلے کی ہیئت، ساخت اور نمایاں خصوصیات پر نوٹ لکھیے۔

جواب: ہائیکو جاپانی شاعری کی ایک مختصر صنف ہے۔ یہ تین سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جاپانی روایت میں اس کی صوتی ترتیب 5-7-5 کے نمونے سے وابستہ ہے۔ ہائیکو کی بنیادی خصوصیت اختصار، منظر نگاری، فطرت سے تعلق اور ایک لمحاتی تجربے کو گہری معنویت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ ترائیلے فرانسیسی شعری روایت سے تعلق رکھنے والی آٹھ مصرعوں کی صنف ہے۔ اس میں بعض مصرعے مقررہ ترتیب سے دہرائے جاتے ہیں۔ مصرعوں کی یہ تکرار نظم میں موسیقیت، وحدت اور معنی کی شدت پیدا کرتی ہے۔ اردو شاعری میں بھی ترائیلے کو ایک تجرباتی شعری ہیئت کے طور پر اپنایا گیا۔

سوال5: ترویني کی تعریف کرتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات اور تیسری سطر کی اہمیت بیان کیجیے۔

جواب: ترویني تین مصرعوں پر مشتمل ایک مختصر جدید شعری ہیئت ہے جسے ہندوستانی شاعر گلزار نے مقبول بنایا۔ بظاہر اس کے پہلے دو مصرعے ایک مکمل مفہوم پیش کرتے ہیں، لیکن اصل فنی حسن تیسرے مصرعے سے پیدا ہوتا ہے۔ تیسرا مصرع پہلے دونوں مصرعوں کے معنی کو ایک نیا رخ دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ پہلے مفہوم کی توسیع کرتا ہے، بعض اوقات اس میں حیرت پیدا کرتا ہے اور کبھی پورے شعر کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ ترویني کی نمایاں خصوصیات میں اختصار، معنوی تہہ داری، غیر متوقع تیسرا مصرع، علامتی اظہار اور کم الفاظ میں وسیع مفہوم شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترویني جدید عہد کے مختصر مگر معنی خیز شعری اظہار کی ایک دل چسپ صورت قرار پاتی ہے۔

13.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 14 نظم ''صبح آزادی''، فیض احمد فیض

ساخت

14.0 اغراض ومقاصد

14.1 تعارف

14.2 نظم ''صبح آزادی'' کا متن

14.2.1 نظم ''صبح آزادی'' کی تشریح

14.2.2 نظم ''صبح آزادی'' کی خصوصیات

14.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

14.4 عمومی جائزہ

14.5 فرہنگ

14.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

14.7 مشقی سوالات

14.8 جوابات سرگرمی

14.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

14.9 امدای کتب

14.0 :اغراض ومقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ فیض احمد فیضؔ کی شخصیت، ادبی مقام، شعری خصوصیات اور ترقی پسند ادبی تحریک سے ان کے تعلق کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرسکیں گے۔ آپ نظم ''صبحِ آزادی'' کے تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر کو سمجھ سکیں گے اور یہ جان سکیں گے کہ یہ نظم برصغیر کی آزادی اور تقسیمِ ہند کے کن حالات میں تخلیق ہوئی۔ 1947ء کی آزادی سے وابستہ امیدوں، آرزوؤں اور خوابوں کے ساتھ ساتھ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فسادات، ہجرت، قتل وغارت اور انسانی المیے کا ادراک کرسکیں گے۔ نظم کے مرکزی خیال کو سمجھ سکیں گے اور یہ جان سکیں گے کہ شاعر نے آزادی کی صبح کو مکمل خوشی اور کامیابی کی علامت کے بجائے ایک نامکمل اور غم آلود تجربے کے طور پر کیوں پیش کیا ہے۔ ''داغ داغ اُجالا''، ''شب گزیدہ سحر'' اور اس نوع کے دوسرے شعری استعاروں، علامتوں اور پیکروں کی معنویت کو سمجھ سکیں گے۔

نظم میں آزادی کے خواب اور آزادی کے بعد سامنے آنے والی تلخ حقیقت کے درمیان موجود تضاد کی وضاحت کرسکیں گے۔ فیض احمد فیض کے تصورِ آزادی کو سمجھ سکیں گے اور یہ جان سکیں گے کہ ان کے نزدیک محض سیاسی آزادی حقیقی آزادی کے لیے کافی نہیں، بلکہ سماجی انصاف، معاشی مساوات، امن اور انسانی وقار بھی ضروری ہیں۔ نظم میں موجود امید، مایوسی، کرب، محرومی، جدوجہد اور حوصلے کے مختلف جذبات کی شناخت کرسکیں گے۔ نظم کی فنی خوبیوں، مثلاً علامت نگاری، استعاراتی انداز، پیکر تراشی، شعری موسیقیت اور مؤثر طرزِ اظہار کا جائزہ لے سکیں گے۔ نظم کے متن کی تشریح کرتے ہوئے اس کے تاریخی اور سماجی حوالوں کو اپنی زبان میں بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کرسکیں گے۔ آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ فیض نے آزادی کے موقع پر محض جشن اور مسرت کے جذبات پیش کرنے کے بجائے انسانی دکھ، سماجی ناانصافی اور نامکمل آزادی کے مسئلے کو کیوں نمایاں کیا۔ نظم کے آخری حصے میں موجود مسلسل جدوجہد کے پیغام کو سمجھ سکیں گے اور یہ جان سکیں گے کہ شاعر کے نزدیک حقیقی منزل کے حصول تک سفر جاری رکھنا کیوں ضروری ہے۔

14.1: تعارف

فیض احمد فیضؔ بیسویں صدی کے اردو ادب کے ممتاز، مقبول اور عالمی شہرت یافتہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت، انقلاب، انسان دوستی، آزادی، مساوات، سماجی انصاف اور انسانی وقار کے موضوعات بڑی خوب صورتی اور فنی مہارت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ فیض نے روایتی عشقیہ شاعری کے الفاظ اور علامتوں کو عصری زندگی کے سیاسی اور سماجی مسائل کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ یہی وجہ

ہے کہ ان کے ہاں محبوب، ہجر، وصال، صبح، رات، منزل اور سفر جیسے الفاظ اپنے روایتی معنی کے ساتھ ساتھ وسیع سماجی اور سیاسی مفاہیم بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ نظم ''صبحِ آزادی''، فیض احمد فیض کی اہم اور نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم برصغیر کی آزادی کے موقع پر 1947ء میں لکھی گئی۔ برطانوی اقتدار کے خلاف آزادی کی جدوجہد ایک طویل عرصے تک جاری رہی تھی۔ عوام نے سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں یہ امید موجود تھی کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد ظلم، غلامی، ناانصافی اور محرومی کا خاتمہ ہو جائے گا اور ایک ایسے نئے دور کا آغاز ہوگا جس میں امن، خوش حالی، مساوات اور انسانی احترام کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔

لیکن آزادی کے ساتھ ہی برصغیر کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے قیام کے دوران بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ہزاروں افراد جان سے گئے، لاکھوں لوگ اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور بے شمار خاندان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ لوگوں نے جس آزادی کو خوشی، امن اور خوش حالی کی صبح سمجھ کر انتظار کیا تھا، وہ صبح خونریزی، ہجرت، بے گھری اور انسانی دکھوں کے سائے میں نمودار ہوئی۔ اسی تلخ حقیقت نے فیض احمد فیض کو گہرے طور پر متاثر کیا اور انہوں نے اپنے احساسات کو نظم ''صبحِ آزادی'' میں نہایت مؤثر انداز سے پیش کیا۔ نظم کا آغاز ہی ایک غیر معمولی اور چونکا دینے والے تصور سے ہوتا ہے۔ شاعر آزادی کی صبح کو ایک مکمل روشن صبح نہیں سمجھتا بلکہ اسے ''داغ داغ اُجالا'' اور ''شب گزیدہ سحر'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یہاں ''صبح'' آزادی کی علامت ہے جبکہ ''داغ''، ''شب'' اور ''زخم'' جیسے تصورات آزادی کے ساتھ وابستہ دکھ، محرومی، فسادات اور نامکمل خواب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ وہ آزادی جس کے لیے ایک طویل عرصے تک جدوجہد کی گئی، اپنی حقیقی صورت میں سامنے نہیں آسکی۔ آزادی حاصل تو ہوگئی، مگر وہ تمام خواب پورے نہ ہو سکے جو اس سے وابستہ کیے گئے تھے۔

فیض کے نزدیک آزادی محض ایک ملک کے سیاسی اقتدار کی تبدیلی یا غیر ملکی حکومت کے خاتمے کا نام نہیں ہے۔ حقیقی آزادی اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب معاشرے میں ظلم، غربت، استحصال، عدم مساوات اور ناانصافی کا خاتمہ ہو۔ اسی لیے شاعر آزادی کی منزل پر پہنچ کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ جس منزل کی تلاش تھی، وہ ابھی پوری طرح حاصل نہیں ہوئی۔ سفر کا ایک مرحلہ ضرور مکمل ہوا ہے، لیکن حقیقی منزل ابھی آگے ہے۔

نظم میں شاعر نے آزادی سے قبل کے طویل سفر اور جدوجہد کو بھی یاد کیا ہے۔ اس سفر کے دوران آزادی کے متوالوں کے دلوں میں امید اور یقین موجود تھا کہ ایک دن ظلم کی رات ختم ہوگی، آزادی کی صبح طلوع ہوگی اور انسان ایک نئی اور بہتر زندگی کا آغاز کرے گا۔ لیکن جب آزادی

کی صبح سامنے آئی تو اس پر تقسیم کے زخم نمایاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم میں ایک طرف آزادی کا احساس ہے تو دوسری طرف غم، اضطراب اور نامکمل خواب کا شدید کرب بھی موجود ہے۔ اس نظم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ فیض مکمل مایوسی کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ حالات کی تلخی کو تسلیم کرتے ہیں، مگر جدوجہد ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر آگے بڑھنے اور سفر جاری رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی آزادی، سماجی انصاف اور انسانی مساوات کی منزل ابھی باقی ہے۔ لہٰذا ظلم، ناانصافی اور محرومی کے خاتمے تک جدوجہد جاری رہنی چاہیے۔

فنی اعتبار سے بھی ''صبحِ آزادی'' ایک نہایت مؤثر نظم ہے۔ فیض نے علامت، استعارہ، پیکر تراشی اور شعری موسیقیت کے ذریعے اپنے احساسات کو گہرا اور ہمہ گیر بنا دیا ہے۔ صبح اور رات کی علامتوں کے ذریعے آزادی اور غلامی، امید اور مایوسی، روشنی اور تاریکی کے درمیان ایک مؤثر تضاد پیدا کیا گیا ہے۔ یہی فنی حسن اس نظم کو محض ایک تاریخی واقعے کی ترجمانی سے بلند کر کے انسانی آزادی اور سماجی انصاف کی ایک دائمی آواز بنا دیتا ہے۔ یوں ''صبحِ آزادی'' صرف 1947ء کے سیاسی حالات کی عکاسی کرنے والی نظم نہیں بلکہ آزادی کے مفہوم، انسانی توقعات، نامکمل خواب اور مسلسل جدوجہد کے تصور کو پیش کرنے والی ایک اہم ادبی تخلیق ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ حقیقی آزادی کا حصول صرف سیاسی تبدیلی سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ضروری ہے جہاں ہر انسان کو انصاف، مساوات، امن اور باوقار زندگی کے مواقع میسر ہوں۔

14.2: نظم ''صبح آزادی'' کا متن

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل

کہیں تو جا کے رکے گا سفینہ ؟ غم دل
جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے

چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیار حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے

پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن

بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصال منزل و گام

بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاط وصل حلال و عذاب ہجر حرام

جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چار ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

ابھی گرانی ؟ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

14.2.1: نظم ''صبح آزادی'' کی تشریح

یہ فیض احمد فیض کی مشہور نظم "صبحِ آزادی" کا ایک اہم حصہ ہے۔ نظم میں شاعر نے آزادی کے حصول کے باوجود عوام کی محرومیوں، ادھورے خوابوں اور نامکمل انقلاب کی کیفیت کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ذیل میں اشعار کی تشریح دو اشعار (چار مصرعوں) کے بندوں میں کی گئی ہے۔

1۔ یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

تشریح: شاعر آزادی کی صبح کو دیکھ کر خوشی کے بجائے مایوسی اور اضطراب کا اظہار کرتا ہے۔ جس صبح کا قوم نے طویل عرصے تک انتظار کیا تھا، وہ مکمل طور پر روشن اور تابناک نہیں بلکہ زخموں سے بھری ہوئی اور رات کی تاریکی سے متاثر ہے۔ شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ آزادی تو حاصل ہوئی، لیکن اس کے ساتھ وہ خوش حالی، امن، مساوات اور آسودگی نہیں آئی جس کی امید کی گئی تھی۔ اس لیے شاعر سوال کرتا ہے کہ کیا یہی وہ آزادی کی صبح ہے جس کا برسوں انتظار کیا گیا تھا؟

2۔ یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

تشریح: شاعر اپنے ان ساتھیوں کو یاد کرتا ہے جنہوں نے آزادی اور ایک بہتر مستقبل کی امید میں جدوجہد کا راستہ اختیار کیا تھا۔ ان لوگوں کا یقین تھا کہ ایک دن ظلم و جبر کا خاتمہ ہوگا اور ایک ایسی صبح ضرور طلوع ہوگی جس میں انسان کو آزادی، عزت اور خوش حالی حاصل ہوگی۔ لیکن موجودہ حالات کو دیکھ کر شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خواب ابھی پورا نہیں ہوا۔ جدوجہد کا مقصد ابھی حاصل نہیں ہوا اور منزل ابھی دور ہے۔

3۔ فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل

تشریح: شاعر تاروں اور رات کی وسعت کو علامتی انداز میں استعمال کرتا ہے۔ تارے رات کے اختتام اور صبح کی آمد کی امید پیدا کرتے ہیں۔ شاعر کا خیال ہے کہ جس طرح ہر سفر کی ایک منزل اور ہر موج کا ایک ساحل ہوتا ہے، اسی طرح ظلم، تاریکی اور محرومی کی رات کا بھی ایک نہ ایک دن خاتمہ ضرور ہوگا۔ یہ اشعار امید اور بہتر مستقبل کی آرزو کی علامت ہیں۔

4۔ کہیں تو جا کے رکے گا سفینہ ؟ غم دل

جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے

تشریح: شاعر دل کے غم کو ایک کشتی سے تشبیہ دیتا ہے جو مسلسل سفر میں ہے۔ نوجوانوں کا خون اور ان کی قربانیاں اس جدوجہد کی شاہراہیں ہیں جن پر آزادی کی تحریک آگے بڑھی۔ شاعر کو امید تھی کہ یہ قربانیاں ایک دن قوم کو امن، سکون اور خوش حالی کی منزل تک پہنچا دیں گی۔ لیکن آزادی کے بعد بھی مسائل باقی رہنے کی وجہ سے شاعر کی بے چینی ختم نہیں ہوئی۔

5۔ چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے

دیار حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے

تشریح: شاعر اپنے ان ساتھیوں کی قربانیوں کا ذکر کرتا ہے جو ایک بلند مقصد کے لیے اپنے آرام، محبت اور ذاتی خوشیوں کو چھوڑ کر نکلے تھے۔ جب وہ جدوجہد کے سفر پر روانہ ہوئے تو زندگی کی بہت سی دل کشیاں اور محبتیں انہیں اپنی طرف بلاتی رہیں۔ بہت سے ہاتھ ان کے دامن کو پکڑ کر انہیں روکنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن انہوں نے اپنے عظیم مقصد کو ذاتی آسائشوں پر ترجیح دی۔

6۔ پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے

بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن

تشریح: انسانی زندگی کی محبتیں اور جسمانی و جذباتی آسائشیں ان جدوجہد کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں۔ محبت، سکون اور خوشیوں کی دنیا انہیں اپنے پاس بلاتی رہی، لیکن آزادی کی صبح دیکھنے کی خواہش ان تمام کششوں سے زیادہ طاقت ور تھی۔ شاعر نے یہاں جدوجہد کرنے والوں کے جذب؟ قربانی کو نمایاں کیا ہے۔

7۔ بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن

سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ آزادی اور روشن مستقبل کی منزل بہت قریب محسوس ہوتی تھی۔ امیدیں بلند تھیں اور طویل جدوجہد کے باوجود تھکن کا احساس بہت کم تھا، کیونکہ ایک روشن مستقبل کی خواہش انسان کو مسلسل آگے بڑھنے پر آمادہ رکھتی تھی۔ جدوجہد کرنے والوں کو یقین تھا کہ اب ان کی قربانیوں کا ثمر ملنے والا ہے۔

8۔ سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ظلمت و نور

سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصال منزل و گام

تشریح: شاعر طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ سنا ہے تاریکی اور روشنی کا فاصلہ ختم ہو چکا ہے اور منزل اور مسافر کا ملاپ ہو گیا ہے۔ یعنی آزادی حاصل ہو گئی ہے اور بظاہر جدوجہد کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ لیکن شاعر کے دل میں اس دعوے کے بارے میں شک ہے، کیونکہ معاشرے میں ابھی تک ظلم، غربت اور محرومی موجود ہیں۔

9۔ بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور

نشاط وصل حلال و عذاب ہجر حرام

تشریح: یہاں شاعر ان لوگوں پر طنز کرتا ہے جو آزادی کے بعد جدوجہد اور قربانی کے جذبے کو بھول گئے ہیں۔ پہلے اہلِ درد ظلم اور محرومی کے خلاف جدوجہد کو اپنا فرض سمجھتے تھے، لیکن اب بہت سے لوگ صرف کامیابی اور آرام سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ وصال اور خوشی کو جائز سمجھا جانے لگا ہے، جبکہ جدائی، تکلیف اور جدوجہد کو ناپسند کیا جانے لگا ہے۔

10۔ جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن

کسی پہ چار ؟ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے دوران لوگوں کے دلوں میں جو جوش، جذبہ اور انقلاب کی خواہش تھی، اب وہ کمزور پڑ گئی ہے۔ قربانیوں اور جدوجہد کی آگ لوگوں کے اندر پہلے جیسی موجود نہیں رہی۔ معاشرے کے لوگ اپنی ذاتی زندگیوں اور آسائشوں میں مصروف ہو گئے ہیں اور اجتماعی دکھوں کا احساس کم ہو گیا ہے۔

11۔ کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی

ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

تشریح: شاعر آزادی کی صبح کو ایک خوب صورت اور دل کش محبوبہ سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ حیران ہے کہ یہ صبح کہاں سے آئی اور کہاں چلی گئی، کیونکہ اس کے آثار عام زندگی میں واضح نہیں ہیں۔ راستے کا چراغ، جو رہنمائی اور شعور کی علامت ہے، ابھی تک اس نئی صبح کے بارے میں کوئی واضح خبر نہیں دے سکا۔ اس سے شاعر کی مایوسی اور آزادی کے نتائج پر سوال ظاہر ہوتا ہے۔

12۔ ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ آزادی کے باوجود رات کی بھاری پن اور تاریکی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ عوام کی آنکھیں ابھی بھی ظلم کے مناظر دیکھ رہی ہیں اور دل ابھی بھی دکھ اور محرومی سے آزاد نہیں ہوئے۔ حقیقی آزادی وہ ہے جس میں انسان کو ظلم، غربت، ناانصافی اور خوف سے نجات ملے، اور شاعر کے نزدیک وہ وقت ابھی نہیں آیا۔

13۔ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تشریح: یہ نظم کا سب سے اہم اور امید افزا پیغام ہے۔ شاعر مایوسی کے باوجود جدوجہد ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتا بلکہ اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نزدیک آزادی کا حصول جدوجہد کا اختتام نہیں بلکہ ایک مرحلہ ہے۔ اصل منزل ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جہاں انصاف، مساوات، امن اور انسان کی حقیقی آزادی موجود ہو۔ لہٰذا شاعر کا پیغام ہے کہ سفر جاری رکھنا چاہیے کیونکہ اصل منزل ابھی حاصل نہیں ہوئی۔

14.2.2: نظم ''صبح آزادی'' کی فنی خصوصیات

نظم "صبحِ آزادی" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ سیاسی آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود اگر معاشرے میں غربت، ظلم، ناانصافی، طبقاتی فرق اور انسانی محرومی موجود ہوں تو آزادی مکمل نہیں کہلا سکتی۔ فیض احمد فیض نے آزادی کی خوشی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ قوم کی اصل منزل ابھی باقی ہے۔ نظم مایوسی نہیں بلکہ مسلسل جدوجہد، امید اور ایک بہتر معاشرے کے قیام کا پیغام دیتی ہے۔

نظم میں استعاروں اور علامتوں کا نہایت خوب صورت استعمال ہوا ہے۔ صبح، شب، اجالا، تاریکی اور منزل اہم علامتیں ہیں۔ زبان

نہایت شاعرانہ، پراثر اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔نظم میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔شاعر نے تشبیہ، استعارہ اور پیکر تراشی کے ذریعے جذبات کو مؤثر بنایا ہے۔نظم میں مایوسی کے باوجود امید اور مسلسل جدوجہد کا پیغام موجود ہے۔آخری مصرعہ "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" پوری نظم کے انقلابی اور حوصلہ افزا پیغام کا نچوڑ ہے۔

14.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال1: نظم ''صبحِ آزادی'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) علامہ اقبال (ب) فیض احمد فیض

(ج) جوش ملیح آبادی (د) ن۔م۔راشد

سوال2: نظم ''صبحِ آزادی'' کس تاریخی واقعے کے پس منظر میں لکھی گئی؟

(الف) جنگِ عظیم اول (ب) تحریکِ خلافت

(ج) تقسیمِ ہند اور آزادی (د) جنگِ آزادی 1857ء

سوال3: ''یہ داغ داغ اُجالا'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

(الف) طلوعِ آفتاب (ب) نامکمل اور دکھوں سے بھری آزادی

(ج) خوب صورت صبح (د) موسمِ بہار

سوال4: ''شب گزیدہ سحر'' کس کیفیت کی علامت ہے؟

(الف) مکمل خوشی (ب) طویل رات کے اثرات سے آلودہ صبح

(ج) روشن مستقبل (د) قدرتی منظر

سوال5: نظم ''صبحِ آزادی'' کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

(الف) عشق و محبت (ب) فطرت نگاری

(ج) آزادی کے خواب اور اس کی نامکمل تعبیر (د) مزاح اور طنز

14.4: عمومی جائزہ

فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صبحِ آزادی'' برصغیر کی آزادی اور تقسیمِ ہند کے پس منظر میں لکھی گئی ایک اہم نظم ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے طویل عرصے تک جدوجہد کی گئی تھی۔ لوگوں نے بے شمار قربانیاں دیں اور یہ امید قائم کی کہ آزادی کے بعد امن، مساوات، خوش حالی اور انصاف کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ لیکن 1947ء میں آزادی کے ساتھ ہی برصغیر تقسیم ہوگیا اور اس تقسیم کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت، فسادات، ہجرت، بے گھری اور انسانی المیے سامنے آئے۔ اس صورتِ حال نے آزادی کی خوشی کو غم اور اضطراب سے ملا دیا۔

نظم کے آغاز میں شاعر آزادی کی صبح کو ''داغ داغ اُجالا'' اور ''شب گزیدہ سحر'' قرار دیتے ہیں۔ یہ انتہائی بامعنی استعارات ہیں۔ شاعر کے نزدیک جس صبح کا طویل انتظار کیا گیا تھا، وہ ویسی روشن اور پُرامن صبح نہیں تھی جیسی تصور کی گئی تھی۔ آزادی تو حاصل ہوگئی، مگر اس کے ساتھ خونریزی، جدائی اور بے شمار انسانی مصائب بھی آئے۔ شاعر ماضی کی اس جدوجہد کو یاد کرتے ہیں جب آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لیے لوگوں نے امید اور حوصلے کے ساتھ سفر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک وقت آئے گا جب ظلم کی رات ختم ہوجائے گی، تاریکی چھٹ جائے گی اور انسان ایک آزاد اور باوقار زندگی گزار سکے گا۔ لیکن جب آزادی کی منزل سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ یہ ابھی مکمل منزل نہیں ہے۔

نظم میں شاعر مایوسی کا اظہار ضرور کرتے ہیں، لیکن وہ مکمل ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے۔ نظم کے آخری حصے میں وہ جدوجہد جاری رکھنے کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادی صرف سیاسی اقتدار کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ حقیقی آزادی وہ ہے جس میں معاشرتی انصاف، مساوات، امن، انسانی وقار اور استحصال سے نجات حاصل ہو۔ اس طرح ''صبحِ آزادی'' ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک طرف آزادی کی خوشی موجود ہے اور دوسری طرف تقسیمِ ہند کے المیے کا شدید احساس بھی پایا جاتا ہے۔ فیضؔ نے آزادی کے نامکمل خواب کو نہایت مؤثر علامتوں، استعاروں اور جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کا مرکزی پیغام یہ ہے کہ حقیقی منزل ابھی باقی ہے اور ایک بہتر معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد جاری رکھنا ضروری ہے۔

14.5: فرہنگ

داغ داغ : دھبوں سے بھرا ہوا، آلودہ

اُجالا : روشنی

شب گزیدہ : رات کا مارا ہوا، رات کے اثرات سے آلودہ

سحر	:	صبح، طلوعِ صبح
انتظار	:	راہ دیکھنا
وصال	:	ملاقات، ملاپ
جوان	:	شباب والا، طاقت ور
جلوہ	:	نمود، روشنی، حسن کا ظہور
دامن	:	کنارہ، لباس کا نچلا حصہ
نجات	:	چھٹکارا، آزادی
گردِراہ	:	راستے کی دھول
منزل	:	مقصود، آخری مقام
نشاط	:	خوشی، مسرت
سرور	:	خوشی، کیف
تاریکی	:	اندھیرا
کنار	:	کنارہ، اختتام
کشت	:	کھیتی، فصل
دل گرفتہ	:	غم زدہ، افسردہ
گرانی	:	بوجھ، دشواری، سختی
چارہ	:	علاج، تدبیر، حل

14.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: فیض احمد فیض کی نظم ''صبحِ آزادی'' کا تاریخی اور سیاسی پس منظر بیان کیجیے۔

سوال2: ''یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر'' کی وضاحت کرتے ہوئے نظم کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے۔

سوال3: نظم ''صبحِ آزادی'' میں آزادی کے خواب اور حقیقت کے درمیان تضاد کو واضح کیجیے۔

سوال4: ''صبحِ آزادی'' میں تقسیمِ ہند کے انسانی المیے کی عکاسی کس طرح ہوئی ہے؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال5: نظم ''صبحِ آزادی'' کے فنی و فکری محاسن بیان کیجیے۔

14.7: مشقی سوالات

سوال1: فیض احمد فیض نے آزادی کی صبح کو ''داغ داغ اُجالا'' کیوں کہا ہے؟

سوال2: ''شب گزیدہ سحر'' سے کیا مراد ہے؟

سوال3: نظم ''صبحِ آزادی'' میں شاعر نے آزادی کے بارے میں کن جذبات کا اظہار کیا ہے؟

سوال4: نظم کے اختتام پر شاعر کیا پیغام دیتا ہے؟

14.8: جوابات سرگرمی

1(ب) فیض احمد فیض

2(ج) تقسیمِ ہند اور آزادی

3(ب) نامکمل اور دکھوں سے بھری آزادی

4(ب) طویل رات کے اثرات سے آلودہ صبح

5(ج) آزادی کے خواب اور اس کی نامکمل تعبیر

14.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: فیض احمد فیض نے آزادی کی صبح کو ''داغ داغ اُجالا'' کیوں کہا ہے؟

جواب: فیض احمد فیض نے آزادی کی صبح کو ''داغ داغ اُجالا'' اس لیے کہا ہے کہ 1947ء میں حاصل ہونے والی آزادی مکمل خوشی اور اطمینان کا باعث نہیں بن سکی۔ آزادی کے ساتھ ہی برصغیر تقسیم ہو گیا، فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، بے شمار لوگ قتل ہوئے اور لاکھوں افراد کو اپنا

گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ شاعر نے جس آزادی کا خواب دیکھا تھا، وہ امن، مساوات اور خوش حالی سے بھرپور تھی، مگر حقیقت اس سے مختلف نکلی۔ اسی لیے شاعر نے آزادی کے اُجالے کو دکھ، خونریزی اور محرومی کے داغوں سے بھرا ہوا قرار دیا ہے۔

سوال 2: ''شب گزیدہ سحر'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: ''شب گزیدہ سحر'' ایک نہایت خوب صورت اور بامعنی استعارہ ہے۔ ''شب'' سے مراد غلامی، ظلم اور تاریکی کا طویل زمانہ ہے جبکہ ''سحر'' آزادی کی علامت ہے۔ شاعر کہنا چاہتے ہیں کہ آزادی کی صبح طلوع تو ہوئی، لیکن اس پر غلامی، تقسیم، خونریزی اور انسانی مصائب کے اثرات ابھی باقی تھے۔ گویا رات ختم ہونے کے باوجود اس کے زخم صبح کے چہرے پر موجود تھے۔ اس لیے یہ ایسی صبح تھی جو مکمل طور پر روشن، خوش گوار اور پُرامن نہیں تھی۔

سوال 3: نظم ''صبحِ آزادی'' میں شاعر نے آزادی کے بارے میں کن جذبات کا اظہار کیا ہے؟

جواب : اس نظم میں شاعر کے جذبات پیچیدہ اور گہرے ہیں۔ ایک جانب آزادی حاصل ہونے کی خوشی اور طویل جدوجہد کی تکمیل کا احساس موجود ہے تو دوسری جانب تقسیمِ ہند کے دوران ہونے والی خونریزی، ہجرت، قتل و غارت اور انسانی مصائب کا شدید دکھ بھی ہے۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ جس آزادی کا خواب دیکھا گیا تھا وہ ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ اسی لیے نظم میں خوشی، غم، مایوسی، اضطراب، امید اور جدوجہد کے جذبات ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر سیاسی آزادی کو آخری منزل نہیں سمجھتا بلکہ حقیقی آزادی کے لیے سماجی انصاف اور انسانی مساوات کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔

سوال 4: نظم کے اختتام پر شاعر کیا پیغام دیتا ہے؟

جواب: نظم کے اختتام پر فیض احمد فیض مایوسی کے بجائے جدوجہد جاری رکھنے کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک 1947ء کی آزادی سفر کا اختتام نہیں بلکہ ایک اہم مرحلہ ہے۔ حقیقی منزل ابھی باقی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو ظلم، ناانصافی، غربت، استحصال اور معاشرتی نابرابری کے خاتمے تک اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ شاعر کا پیغام امید، حوصلے اور مسلسل کوشش کا پیغام ہے۔ وہ یہ احساس دلاتے ہیں کہ حقیقی آزادی اسی وقت حاصل ہوگی جب ہر انسان کو انصاف، مساوات، امن اور باوقار زندگی میسر آئے گی۔

14.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 15 نظم ''چارہ گر'' مخدومؔ محی الدین

ساخت

15.0 اغراض ومقاصد

15.1 تعارف

15.2 نظم ''چارہ گر'' کا متن

15.2.1 نظم ''چارہ گر'' کی تشریح

15.2.2 نظم ''چارہ گر'' کی خصوصیات

15.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

15.4 عمومی جائزہ

15.5 فرہنگ

15.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

15.7 مشقی سوالات

15.8 جوابات سرگرمی

15.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

15.9 امدای کتب

15.0 :اغراض ومقاصد

عزیز متعلم !اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ مخدوم محی الدین کی شخصیت، ادبی مقام اوران کی شاعری کی اہم خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔نظم ''چارہ گر'' کے بنیادی موضوع، مرکزی خیال اور فکری پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔نظم میں پیش کیے گئے محبت، وفا، درد، محرومی، جدائی اور انسانی جذبات کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر سکیں گے۔نظم میں موجود رومانوی فضا اور حسنِ فطرت کی عکاسی کا مطالعہ کر کے یہ جان سکیں گے کہ شاعر نے فطری مناظر کو انسانی جذبات سے کس طرح ہم آہنگ کیا ہے۔

''چارہ گر''، ''زنبیل''، ''نسخہ کیمیائے محبت'' اور ''مداوائے الفت'' جیسی علامتی اور استعاراتی تراکیب کے مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔نظم میں مسجد، مندر اور میکدے کے ذکر کی معنویت کو سمجھتے ہوئے شاعر کے وسیع انسانی اور آفاقی تصورِ محبت سے واقف ہو سکیں گے۔آپ یہ جان سکیں گے کہ مخدوم محی الدین کے نزدیک محبت کسی ایک مذہب، طبقے، علاقے یا معاشرتی گروہ تک محدود نہیں بلکہ ایک مشترکہ انسانی جذبہ ہے۔نظم کی زبان، اسلوب، پیکر تراشی، علامت نگاری، تشبیہات اور استعارات کا ادبی جائزہ لے سکیں گے۔

نظم میں رومان اور درد کے امتزاج کو سمجھتے ہوئے مخدوم محی الدین کی شعری انفرادیت کا اندازہ کر سکیں گے۔نظم کے عنوان ''چارہ گر'' کی معنویت کو واضح کر سکیں گے اور یہ سمجھ سکیں گے کہ شاعر نے عشق کے دکھ اور اس کے علاج کے تصور کو کس طرح علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔نظم کے اہم اشعار اور مصرعوں کی تشریح اپنے الفاظ میں کر سکیں گے۔نظم کے فکری اور فنی محاسن کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے امتحانی نقط ؟ نظر سے جامع جواب تحریر کر سکیں گے۔

15.1: تعارف

مخدوم محی الدین اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی شاعری میں انقلاب، سماجی شعور، انسان دوستی اور آزادی کے جذبات کے ساتھ ساتھ محبت اور رومان کا ایک نہایت خوب صورت اور لطیف رنگ بھی پایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری محض سیاسی اور انقلابی موضوعات تک محدود نہیں رہتی بلکہ انسانی زندگی کے نرم و نازک جذبات، عشق کی کیفیات، حسنِ فطرت اور باطنی احساسات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ان کی رومانوی شاعری میں جذبے کی شدت، زبان کی موسیقیت اور پیکر تراشی کی دل کشی نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔نظم ''چارہ گر'' مخدوم محی الدین کی ایسی ہی دل آویز رومانوی نظم ہے جس میں محبت کو ایک گہرے انسانی تجربے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس

نظم میں شاعر نے محبت کی مسرت، اس کی وارفتگی، اس کے حسن اور اس کے ساتھ وابستہ درد و محرومی کو نہایت مؤثر اور دل نشیں پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نظم کا ماحول ابتدا ہی سے رومانوی ہے۔ چنبیلی کا منڈوا، چاندنی، اوس، ٹھنڈی ہوا، پھول، زلفیں اور رخسار جیسے عناصر ایک ایسی تصویری فضا پیدا کرتے ہیں جس میں محبت کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

نظم میں دو محبت کرنے والوں کا ذکر ہے جو ایک دوسرے کی محبت میں پوری طرح ڈوبے ہوئے ہیں۔ شاعر ان کے عشق کو ایک ایسے جذبے کے طور پر پیش کرتا ہے جو ان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ ان کے لیے محبت ہی وفا ہے، محبت ہی زندگی کا مقصد ہے اور محبت ہی وہ آگ ہے جس میں وہ اپنی پوری ہستی کو جلا دینے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس طرح نظم میں عشق محض وقتی کشش یا جذباتی وابستگی نہیں بلکہ مکمل سپردگی اور خود فراموشی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس نظم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مخدوم محی الدین محبت کو مذہبی اور سماجی حدود سے بلند کر دیتے ہیں۔ مسجدوں کے منار، مندروں کے کواڑ اور میکدوں کی دراڑیں محبت کرنے والوں کی موجودگی کی گواہ بن جاتی ہیں۔ اس علامتی اظہار سے شاعر یہ باور کراتا ہے کہ محبت ایک عالم گیر اور آفاقی جذبہ ہے جسے مذہب، فرقے، ذات یا معاشرتی پابندیوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ عشق انسان کو انسان سے جوڑنے والی ایسی قوت ہے جو تقسیم کے تمام ظاہری تصورات سے بلند ہو جاتی ہے۔

نظم میں حسنِ فطرت اور انسانی جذبات کا گہرا امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ شاعر فطرت کے مختلف مناظر کو صرف آرائش کے طور پر استعمال نہیں کرتا بلکہ انہیں عاشقوں کی جذباتی کیفیت کا حصہ بنا دیتا ہے۔ چاندنی، اوس اور ٹھنڈی ہوا محبت کی لطافت کو نمایاں کرتی ہیں، جبکہ غم، ماتم اور درد کے تاثر نظم میں عشق کی دوسری جہت یعنی محرومی اور کرب کو سامنے لاتے ہیں۔ یوں حسن اور غم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نظم کو ایک خاص جذباتی گہرائی عطا کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ''چارہ گر'' بھی بڑی معنویت کا حامل ہے۔ ''چارہ گر'' کے لغوی معنی علاج کرنے والے یا معالج کے ہیں، لیکن یہاں یہ لفظ صرف جسمانی بیماریوں کے معالج کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ شاعر ایک ایسے چارہ گر کو مخاطب کرتا ہے جو شاید دل کے زخم، عشق کی بے قراری اور محبت کے دکھ کا علاج کر سکے۔ شاعر کا سوال دراصل یہی ہے کہ کیا عشق اور محبت کے درد کا بھی کوئی علاج ممکن ہے؟ کیا کسی زنبیل میں ایسا نسخہ موجود ہے جو دل کی بے قراری اور محبت کی اذیت کا مداوا کر سکے؟

یہ سوال نظم کو محض رومانوی منظر نگاری سے بلند کر کے ایک گہرے فکری مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ شاعر گویا یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ محبت کا درد ایسی کیفیت ہے جس کے لیے عام دوا یا ظاہری علاج کافی نہیں ہوتا۔ عشق اپنی مسرت اور اذیت دونوں کے ساتھ انسانی وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس طرح ''چارہ گر'' ایک ایسی نظم ہے جس میں محبت، حسن، فطرت، وفا، درد، انسان دوستی اور آفاقی اخوت کے عناصر ایک دوسرے میں گھل

مل جاتے ہیں۔مخدوم محی الدین نے نرم، سادہ اور مترنم زبان، دل کش پیکروں، مؤثر علامتوں اور گہرے جذبات کے ذریعے محبت کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جو قاری کے ذہن اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس نظم کا مطالعہ آپ کو مخدوم کی رومانوی شاعری کے حسن سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ محبت کے وسیع تر انسانی اور آفاقی تصور کو سمجھنے میں بھی مدد فراہم کرتا ہے۔

15.2:نظم ''چارہ گر'' کا متن

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن

پیار کی آگ میں جل گئے

پیار حرف وفا پیار ان کا خدا

پیار ان کی چتا

دو بدن

اوس میں بھیگتے چاندنی میں نہاتے ہوئے

جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر

ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا

صرف ماتم ہوئی

کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر

ایک پل کے لیے رک گئی

ہم نے دیکھا انہیں

دن میں اور رات میں

نور وظلمات میں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انہیں

مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انہیں

مے کدوں کی دراڑوں نے دیکھا انہیں

ازازل تاابد

یہ بتا چارہ گر

تیری زنبیل میں

نسخہ کیمیائے محبت بھی ہے

کچھ علاج ومداوائے الفت بھی ہے

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن

15.2.1: نظم ''چارہ گر'' کی تشریح

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن

پیار کی آگ میں جل گئے

شاعر ایک نہایت دلکش اور رومانوی منظر سے نظم کا آغاز کرتا ہے۔ چنبیلی کا منڈوا حسن، خوشبو، لطافت اور محبت کی علامت ہے جبکہ مے کدہ زندگی کی سرمستی اور بے خودی کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس حسین مقام پر دو عاشق محبت کی شدید آگ میں جل گئے۔ یہاں

آگ سے مراد حقیقی آگ نہیں بلکہ عشق کی وہ تپش اور شدت ہے جس نے دونوں عاشقوں کے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ شاعر نے نہایت مختصر الفاظ میں محبت کی شدت اور عاشقوں کی بے بسی کو بیان کیا ہے۔

پیار حرف وفا پیاران کا خدا

پیاران کی چتا

اس شعر میں شاعر ان عاشقوں کی محبت کی انتہا کو بیان کرتا ہے۔ ان کے نزدیک محبت ہی وفاداری کا سبق ہے، محبت ہی ان کا سب سے بڑا عقیدہ اور خدا ہے اور یہی محبت ان کی چتا بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، محبت ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے اور اسی محبت میں ان کی ہستی فنا ہونے کے لیے تیار ہے۔ شاعر نے اس بند میں عشق کی وارفتگی، وفاداری اور قربانی کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

تیسرا بند

دو بدن

اوس میں بھیگتے چاندنی میں نہاتے ہوئے

جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر

ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا

تشریح: شاعر دوبارہ ان دو عاشقوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ اوس میں بھیگے ہوئے اور چاندنی میں نہائے ہوئے ہیں۔ شاعر انہیں تازہ اور کھلے ہوئے پھولوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ پچھلے پہر کی ٹھنڈی اور ہلکی ہوا ان کے حسن، تازگی اور رومانوی کیفیت میں مزید اضافہ کر رہی ہے۔ اس بند میں شاعر نے فطرت کے حسین عناصر کے ذریعے عاشقوں کے حسن، جوانی اور محبت کی پاکیزگی کو نمایاں کیا ہے۔

چوتھا بند

صرف ماتم ہوئی

کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر

ایک پل کے لیے رک گئی

ہم نے دیکھا انہیں

تشریح: محبت کے اس حسین منظر میں ایک دردناک اور المیہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کے مطابق ان دونوں عاشقوں کے گرد غم اور ماتم کی کیفیت چھا گئی۔ کالی زلفیں گرم رخساروں سے لپٹی ہوئی ہیں، جس سے محبت کی شدت اور جذبات کی گرمی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وقت ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا ہو اور دیکھنے والوں نے ان عاشقوں کی محبت اور ان کی قربت کے اس منظر کو حیرت سے دیکھا ہو۔ اس بند میں حسن اور غم ایک دوسرے سے مل کر ایک گہرا جذباتی اثر پیدا کرتے ہیں۔

پانچواں بند

دن میں اور رات میں

نور و ظلمات میں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انہیں

مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انہیں

مے کدوں کی دراڑوں نے دیکھا انہیں

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ ان دونوں عاشقوں کی محبت دن اور رات، روشنی اور تاریکی، ہر حالت میں موجود رہی۔ ان کی محبت کسی خاص وقت یا جگہ تک محدود نہیں تھی۔ مسجدوں کے میناروں، مندروں کے دروازوں اور مے کدوں کی دراڑوں تک نے انہیں دیکھا ہے۔ مسجد، مندر اور مے کدہ مختلف مذہبی، تہذیبی اور سماجی علامتیں ہیں۔ شاعر ان کے ذریعے یہ واضح کرتا ہے کہ محبت کسی ایک مذہب، قوم یا عقیدے کی پابند نہیں ہوتی۔ سچی محبت ہر حد اور ہر تقسیم سے بلند ہوتی ہے۔

چھٹا بند

از ازل تا ابد

یہ بتا چارہ گر

تیری زنبیل میں

نسخ؟ کیمیائے محبت بھی ہے

کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے

تشریح: شاعر محبت کو ایک ازلی اور ابدی جذبہ قرار دیتا ہے۔ محبت ابتدا سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی۔ پھر شاعر ایک چارہ گر، یعنی معالج یا علاج کرنے والے سے سوال کرتا ہے کہ کیا اس کے پاس محبت کے درد کا کوئی علاج موجود ہے؟ شاعر پوچھتا ہے کہ کیا تیرے پاس ,, کیمیائے محبت'' کا کوئی نسخہ ہے؟ کیا تیرے پاس الفت اور عشق کے درد کو دور کرنے کی کوئی دوا موجود ہے؟ اس سوال کے ذریعے شاعر محبت کی بے بسی اور اس کے ناقابلِ علاج ہونے کی کیفیت کو نمایاں کرتا ہے۔ گویا محبت ایک ایسا درد ہے جس کا کوئی مکمل علاج ممکن نہیں۔

ساتواں بند

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن

تشریح: نظم کے آخری بند میں شاعر دوبارہ نظم کے ابتدائی منظر کی طرف لوٹتا ہے۔ چنبیلی کا منڈوا، مے کدے سے دور موڑ اور ,, دو بدن'' کی تصویر دوبارہ سامنے آتی ہے، لیکن شاعر بات کو مکمل نہیں کرتا۔ یہ ادھورا پن بہت معنی خیز ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ محبت کی داستان کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ دو بدنوں کی محبت کی کہانی کسی ایک زمانے یا کسی ایک واقعے تک محدود نہیں بلکہ ہر دور میں دہرائی جاتی رہتی ہے۔ شاعر نے نظم کو ادھورے اور علامتی انداز میں ختم کر کے محبت کی لازوال کیفیت کو مزید مؤثر بنا دیا ہے۔

خلاصہ

نظم ,, چارہ گر'' میں مخدوم محی الدین نے محبت کو ایک عظیم، شدید اور لازوال انسانی جذبے کے طور پر پیش کیا ہے۔ محبت انسان کو وفا، قربانی اور فنا کے راستے پر لے جاتی ہے۔ یہ مذہب، قوم، وقت اور جگہ کی پابندیوں سے بلند ہے۔ شاعر کا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا محبت کے درد کا کوئی علاج ممکن ہے؟ نظم کے مجموعی مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ سچی محبت ایک ایسا درد ہے جس کا کوئی حقیقی علاج نہیں۔

یہ نظم دو عاشقوں کی کہانی کے پردے میں انسانی محبت کی ازلی و ابدی داستان بیان کرتی ہے۔ مخدوم محی الدین نے فطرت کی دلکش تصویروں، علامتوں، تکرار اور مختصر مگر پُر اثر زبان کے ذریعے محبت کے حسن، اس کی شدت اور اس کے درد کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

15.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

سوال1: نظم ''چارہ گر''----------ہے۔

(الف) آزاد نظم (ب) نظم معرٰی

(ج) پابند نظم (د) نثری نظم

سوال2: نظم میں دو بدن کہاں دکھائی دیتے ہیں؟

(الف) دریا کے کنارے (ب) باغ کے درمیان

(ج) چنبیلی کے منڈوے تلے (د) پہاڑ کی چوٹی پر

سوال3: شاعر کے مطابق دو بدن کس آگ میں جل گئے؟

(الف) نفرت کی آگ میں (ب) انتقام کی آگ میں

(ج) پیار کی آگ میں (د) جنگ کی آگ میں

سوال4: شاعر نظم کے آخر میں کس سے مخاطب ہوتا ہے؟

(الف) ساقی سے (ب) محبوب سے

(ج) چارہ گر سے (د) مسافر سے

سوال5: شاعر چارہ گر کی زنبیل میں کس چیز کا نسخہ تلاش کرتا ہے؟

(الف) دولت حاصل کرنے کا (ب) کیمیائے محبت کا

(ج) شہرت حاصل کرنے کا (د) بیماری سے بچنے کا

2۔ سبق کا خلاصہ

مخدوم محی الدین کی نظم ''چارہ گر'' ان کی خوب صورت رومانوی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں محبت کو محض ایک شخصی جذبے کے

طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ اسے ایسی ازلی اور ابدی انسانی قوت کی حیثیت دی گئی ہے جو مذہب، معاشرت اور زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے۔ نظم کا آغاز ایک نہایت دل کش اور رومانوی منظر سے ہوتا ہے۔ ایک چنبیلی کے منڈوے کے نیچے اور میکدے سے کچھ فاصلے پر شاعر دو محبت کرنے والوں کو دیکھتا ہے۔ یہ دونوں محبت کی آگ میں اس طرح سرشار ہیں کہ گویا ان کی پوری زندگی کا مرکز محبت ہی ہے۔ ان کے لیے محبت وفا کا نام بھی ہے، ان کا خدا بھی ہے اور یہی محبت ان کے دکھ اور فنا کا سبب بھی بنتی ہے۔

شاعر فطرت کے حسین مناظر کے ذریعے ان دونوں محبت کرنے والوں کی کیفیت کو زیادہ مؤثر بناتا ہے۔ اوس، چاندنی، تازہ پھول، ٹھنڈی ہوا، سیاہ زلفیں اور گرم رخسار جیسے پیکر نظم میں رومانوی فضا پیدا کرتے ہیں۔ دونوں عاشق شاعر کو ایسے تازہ دم پھولوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں جو رات کے آخری پہر اوس میں بھیگ رہے ہوں اور چاندنی میں نہا رہے ہوں۔ لیکن اس حسین منظر کے پس منظر میں ایک گہرا دکھ بھی موجود ہے۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ محبت کرنے والوں کی زندگی صرف خوشی اور مسرت سے عبارت نہیں بلکہ اس کے ساتھ درد، محرومی اور جدائی کا امکان بھی وابستہ ہے۔ اسی لیے چمن کی ٹھنڈی ہوا بھی گویا ان کے غم میں شریک ہو کر ماتم کرنے لگتی ہے۔

نظم کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ شاعر محبت کو مذہبی اور سماجی تقسیم سے بلند کر کے پیش کرتا ہے۔ مسجدوں کے منار، مندروں کے کواڑ اور میکدوں کی دراڑیں سب ان محبت کرنے والوں کے گواہ ہیں۔ اس منظر کے ذریعے شاعر اشارہ کرتا ہے کہ محبت کسی ایک مذہب، طبقے یا سماجی گروہ کی میراث نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر انسانی جذبہ ہے۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر ''چارہ گر'' سے سوال کرتا ہے کہ کیا اس کے پاس محبت کے دکھ اور دل کی بے قراری کا بھی کوئی علاج موجود ہے؟ وہ دریافت کرتا ہے کہ کیا اس کی زنبیل میں کوئی ایسا نسخہ موجود ہے جو محبت کے دکھ کا مداوا کر سکے۔ اس سوال کے ذریعے نظم میں ایک گہری معنویت پیدا ہوتی ہے۔ شاعر دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عشق کا دکھ عام جسمانی بیماری نہیں جس کا علاج کسی دوا سے کیا جا سکے۔ اس طرح ''چارہ گر'' محبت، وفا، حسنِ فطرت، درد، انسانی یکجہتی اور عشق کی لازوال قوت کی خوب صورت ترجمانی کرتی ہے۔ مخدوم نے سادہ مگر پُر تاثیر زبان، خوب صورت پیکروں اور علامتی انداز کے ذریعے محبت کے جذبے کو آفاقی سطح عطا کی ہے۔

15.5: فرہنگ

چنبیلی : ایک خوشبودار سفید پھول

منڈوا : بیلوں یا شاخوں سے بنا ہوا سایہ دار چھپر

میکدہ	:	شراب خانہ
حرفِ وفا	:	وفاداری کی بات، وفا کا اظہار
چتا	:	مردہ جسم جلانے کے لیے لکڑیوں کا ڈھیر
اوس	:	رات کے وقت پودوں پر پڑنے والے پانی کے باریک قطرے
تازہ رُو	:	شاداب، تر و تازہ چہرے والا
تازہ دم	:	تازگی اور توانائی سے بھرپور
پچھلا پہر	:	رات کا آخری حصہ
سبک رُو	:	آہستہ اور لطیف انداز سے چلنے والی
چمن	:	باغ
صرفِ ماتم	:	غم اور ماتم میں مصروف
رخسار	:	گال، چہرہ
ظلمات	:	تاریکیاں، اندھیرے
منار	:	بلند مینار
کواڑ	:	دروازے کے پٹ
ازل تا ابد	:	ابتدا سے ہمیشہ تک
چارہ گر	:	علاج کرنے والا، معالج
زنبیل	:	تھیلا یا دواؤں کا بیگ
مداوائے الفت	:	محبت کے دکھ کا علاج

15.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: مخدوم محی الدین کی نظم ''چارہ گر'' کا مرکزی خیال تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال2: نظم ''چارہ گر'' میں محبت کے تصور کی وضاحت کیجیے۔

سوال3: نظم ''چارہ گر'' میں فطری مناظر اور رومانوی فضا کا جائزہ لیجیے۔

سوال4: ''چارہ گر'' کے عنوان کی معنویت اور اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

سوال5: نظم ''چارہ گر'' کے فنی اور فکری محاسن بیان کیجیے۔

15.7: مشقی سوالات

سوال1: نظم ''چارہ گر'' میں ''دو بدن'' سے کیا مراد ہے؟

سوال2: شاعر نے مسجد، مندر اور میکدے کا ذکر کیوں کیا ہے؟

سوال3: نظم میں ''چارہ گر'' کس کی علامت ہے؟

سوال4: ''نسخۂ کیمیائے محبت'' اور ''مداوائے الفت'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

15.8: جوابات سرگرمی

1۔(ب) مخدوم محی الدین

2۔(ج) چنبیلی کے منڈوے تلے

3۔(ج) پیار کی آگ میں

4۔(ج) چارہ گر سے

5۔(ب) کیمیائے محبت کا

15.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: نظم ''چارہ گر'' میں ''دو بدن'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: نظم میں ''دو بدن'' سے مراد دو محبت کرنے والے ہیں جو ایک دوسرے کی محبت میں پوری طرح سرشار ہیں۔ شاعر نے ان کے نام یا مذہب کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف ''دو بدن'' کہا ہے۔ اس طرزِ اظہار سے ان کی محبت کو آفاقی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ دو بدن دنیا کے کسی بھی خطے، مذہب یا معاشرے سے تعلق رکھنے والے دو محبت کرنے والوں کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے محبت ہی وفا، عقیدہ اور زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ شاعر نے ان دونوں کے ذریعے سچی اور بے لوث محبت کی تصویر پیش کی ہے۔

سوال2: شاعر نے مسجد، مندر اور میکدے کا ذکر کیوں کیا ہے؟

جواب: شاعر نے مسجد، مندر اور میکدے کو علامتی طور پر استعمال کیا ہے۔ مسجد اسلامی مذہبی روایت، مندر ہندو مذہبی روایت اور میکدہ روایتی شاعری میں آزادانہ اور غیر رسمی طرزِ زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ شاعر ان تینوں مقامات کا ذکر کر کے یہ واضح کرتا ہے کہ محبت مذہبی، سماجی اور تہذیبی حدود میں قید نہیں ہوتی۔

محبت کرنے والوں کو مسجدوں کے میناروں، مندروں کے کواڑوں اور میکدوں کی دراڑوں نے یکساں طور پر دیکھا ہے۔ اس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ محبت ایک مشترکہ انسانی جذبہ ہے جو انسانوں کے درمیان قائم کی جانے والی مصنوعی تفریق سے بالاتر ہے۔ یوں مخدوم محبت کے ذریعے انسانی اتحاد، رواداری اور مشترکہ انسانیت کا پیغام دیتے ہیں۔

سوال3: نظم میں ''چارہ گر'' کس کی علامت ہے؟

جواب: لفظ ''چارہ گر'' کے لغوی معنی علاج کرنے والے یا معالج کے ہیں، لیکن نظم میں یہ لفظ علامتی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں چارہ گر سے مراد ایسا شخص یا قوت ہے جو انسان کے باطنی دکھ، عشق کی بے قراری اور محبت کے زخموں کا علاج کر سکے۔

شاعر اس چارہ گر سے سوال کرتا ہے کہ اگر اس کے پاس جسمانی بیماریوں کے علاج موجود ہیں تو کیا محبت کے دکھ کا بھی کوئی علاج ہے؟ اس طرح چارہ گر انسانی دکھوں کے مداوا کی کوشش کرنے والے ہر فرد یا قوت کی علامت بن جاتا ہے۔ شاعر کا سوال دراصل یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ محبت کا درد ایسی کیفیت ہے جسے عام دواؤں سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

سوال4: ''نسخہ کیمیائے محبت'' اور ''مداوائے الفت'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

جواب: ''نسخہ کیمیائے محبت'' ایک خوب صورت استعاراتی ترکیب ہے۔ ''کیمیا'' ایسی شے کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی ماہیت بدل دے۔ شاعر چارہ گر سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے پاس محبت کو کامیاب، پُرسکون اور دکھ سے آزاد بنانے کا بھی کوئی نسخہ موجود ہے۔

اسی طرح ''مداوائے الفت'' سے مراد محبت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے درد، جدائی، محرومی اور بے قراری کا علاج ہے۔ شاعر جانتا ہے کہ عشق کوئی عام جسمانی بیماری نہیں، اس لیے اس کا علاج بھی عام دوا سے ممکن نہیں۔ اس سوال میں ایک گہری معنویت اور ہلکی سی حسرت موجود ہے۔ شاعر گویا پوری انسانیت کی طرف سے سوال کرتا ہے کہ کیا محبت کرنے والوں کے دکھ کا بھی دنیا میں کوئی علاج موجود ہے؟

اسی وجہ سے نظم کا عنوان ''چارہ گر'' نہایت بامعنی ہے کیونکہ پوری نظم محبت کے حسن اور اس کے درد کو بیان کرنے کے بعد اسی بنیادی سوال پر آ کر ختم ہوتی ہے کہ محبت کے زخموں کا حقیقی چارہ گر کون ہے؟

15.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 16 نظم ''سمندر کا بلاوا'' میراجی

ساخت

15.0 اغراض ومقاصد

15.1 تعارف

15.2 نظم ''سمندر کا بلاوا'' کا متن

15.2.1 نظم ''سمندر کا بلاوا'' کی تشریح

15.2.2 نظم ''سمندر کا بلاوا'' کی خصوصیات

15.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

15.4 عمومی جائزہ

15.5 فرہنگ

15.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

15.7 مشقی سوالات

15.8 جوابات سرگرمی

15.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

15.9 امدای کتب

16.0 :اغراض ومقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ جدید اردو نظم کے اہم شاعر میراجی کی شعری شخصیت، ان کے منفرد اسلوب اور ان کی

علامتی شاعری سے واقف ہوسکیں۔نظم ''سمندر کا بلاوا'' کے ذریعے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ میراجی نے انسانی زندگی کے گہرے نفسیاتی، وجودی اور فکری مسائل کو فطرت کی مختلف علامتوں کے ذریعے کس طرح پیش کیا ہے۔اس سبق کے مطالعے سے آپ نظم میں استعمال ہونے والی اہم علامتوں مثلاً گلستاں، پربت، ندی، صحرا اور سمندر کے ظاہری اور باطنی مفاہیم کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ شاعر نے زندگی کی ناپائیداری، وقت کی بے ثباتی، انسانی خواہشات، تنہائی، تجسس، فنا اور اپنے اصل کی طرف واپسی جیسے تصورات کو شعری پیکروں میں کس خوب صورتی سے ڈھالا ہے۔اس نظم کے مطالعے سے آپ کے اندر علامتی شاعری کو سمجھنے، شعری متن کی تہہ تک پہنچنے اور لفظوں کے پس پردہ موجود معنوی جہات کو دریافت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔مزید یہ کہ آپ میراجی کے شعری اسلوب، آزاد طرزِ اظہار، پیکر تراشی اور داخلی کیفیات کی ترجمانی سے بھی واقف ہوسکیں گے۔اس سبق کا مقصد محض نظم کے ظاہری مفہوم کو سمجھنا نہیں بلکہ اس کے اندر پوشیدہ فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلوؤں کا ادراک پیدا کرنا بھی ہے، تاکہ آپ جدید اردو نظم کی فکری وسعت اور فنی انفرادیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

16.1: تعارف

میراجی جدید اردو نظم کے ان ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو نئے موضوعات، نئی علامتوں، جدید نفسیاتی شعور اور منفرد طرزِ اظہار سے روشناس کرایا۔ان کی شاعری روایتی انداز سے مختلف ہے اور اس میں انسانی باطن، لاشعور، خواہش، تنہائی، زندگی و موت، وقت، فطرت اور کائنات کے اسرار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔میراجی نے نظم کو محض خارجی واقعات اور جذبات کے اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے انسان کے داخلی تجربات اور پیچیدہ نفسیاتی کیفیات کا وسیلہ بنایا۔اسی وجہ سے ان کی شاعری میں علامت، استعارہ، پیکر اور اشاریت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔نظم ''سمندر کا بلاوا'' میراجی کی نمائندہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔اس نظم میں شاعر کو ایک مسلسل اور پراسرار پکار سنائی دیتی ہے جو اسے اپنی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے۔شاعر اپنی زندگی اور کائنات کے مختلف مناظر سے گزرتا ہے۔کبھی گلستاں کی رنگینی سامنے آتی ہے، جہاں کلیاں کھلتی اور پھول مرجھاتے ہیں، کبھی پہاڑ اور وادیاں دکھائی دیتی ہیں، کہیں ندی کا بہاؤ ہے اور کہیں وسیع اور بے آب و گیاہ صحرا۔یہ تمام مناظر صرف فطرت کی تصویریں نہیں بلکہ انسانی زندگی کی مختلف کیفیتوں، مراحل اور تجربات کی علامتیں بن جاتے ہیں۔گلستاں زندگی کی خوب صورتی، جوانی اور عارضی مسرتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جبکہ پھولوں کا مرجھانا زندگی کے زوال اور فنا کا احساس پیدا کرتا ہے۔پربت استحکام کے باوجود خاموشی اور اسرار کا پیکر بن جاتا ہے، ندی زندگی کے مسلسل بہاؤ کی علامت محسوس ہوتی ہے اور صحرا تنہائی، ویرانی اور بے ثباتی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ان تمام مناظر سے گزرنے کے باوجود شاعر کے دل میں ایک ایسی پکار موجود رہتی ہے جو اسے کہیں زیادہ گہری اور وسیع حقیقت کی طرف

لے جاتی ہے۔آخر کار یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ پکار سمندر کی ہے۔

نظم میں ''سمندر'' سب سے بڑی اور مرکزی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔سمندر کو لامحدود کائنات، انسانی وجود کے اصل سرچشمے، فنا، ابدیت اور اپنے اصل کی طرف واپسی کی علامت کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔شاعر کے نزدیک زندگی کے تمام تجربات اور تمام راستے بالآخر ایک ایسی حقیقت کی طرف لے جاتے ہیں جو فرد کی محدود ذات سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔اسی لیے سمندر کا بلاوا محض ایک خارجی آواز نہیں بلکہ انسان کے باطن میں موجود اس ازلی پکار کی نمائندگی کرتا ہے جو اسے اپنی حقیقت، اپنے انجام اور اپنے وجود کے سرچشمے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

''سمندر کا بلاوا'' ایک ایسی نظم ہے جس میں فطرت اور انسانی باطن ایک دوسرے سے گہرے طور پر وابستہ نظر آتے ہیں۔میرا جی نے اس نظم میں خارجی مناظر کو داخلی تجربات میں تبدیل کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ نظم اپنے علامتی انداز، فکری گہرائی، نفسیاتی کیفیت اور شعری حسن کے اعتبار سے جدید اردو نظم میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔اس نظم کے مطالعے سے نہ صرف میرا جی کے شعری مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ جدید نظم میں علامت نگاری اور باطنی تجربے کی اہمیت کا بھی واضح اندازہ ہوتا ہے۔

16.2: نظم ''سمندر کا بلاوا'' کا متن

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے مرے
دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے

کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آ رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا

مرے پیارے بچے مجھے تم سے کتنی محبت ہے دیکھو اگر
یوں کیا تو

برا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا خدایا خدایا
کبھی ایک سسکی کبھی اک تبسم کبھی صرف تیوری

مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیات دوروزہ ابد سے ملی ہے

مگر یہ انوکھی ندا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیئے جا رہی ہے

اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری
فقط کان سنتے چلے جا رہے ہیں

یہ اک گلستاں ہے ہوا لہلہاتی ہے کلیاں چٹکتی ہیں
غنچے مہکتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں کھل کھل کے مرجھا کے

گرتے ہیں اک فرش مخمل بناتے ہیں جس پر
مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں

کہ جیسے گلستاں ہی اک آئینہ ہے
اسی آئینے سے ہر اک شکل نکھری سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی پھر نہ ابھری

یہ پربت ہے خاموش ساکن
کبھی کوئی چشمہ ابلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اس پار کیا ہے
مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے دامن میں وادی ہے وادی میں ندی
ہے ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئینہ ہے

اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری مگر ایک پل میں جو مٹنے لگی ہے تو

پھر نہ ابھری

یہ صحرا ہے پھیلا ہوا خشک بے برگ صحرا

بگولے یہاں تند بھوتوں کا عکس مجسم بنے ہیں

مگر میں تو دور ایک پیڑوں کے جھرمٹ پہ اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں

نہ اب کوئی صحرا نہ پربت نہ کوئی گلستاں

اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری

فقط ایک انوکھی صدا کہہ رہی ہے کہ تم کو بلاتے بلاتے مرے دل پہ

گہری تھکن چھا رہی ہے

بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ شاید تھکے گا

تو پھر یہ ندا آئینہ ہے فقط میں تھکا ہوں

نہ صحرا نہ پربت نہ کوئی گلستاں فقط اب سمندر بلاتا ہے مجھ کو

کہ ہر شے سمندر سے آئی سمندر میں جا کر ملے گی

16.2.1: نظم ''سمندر کا بلاوا'' کی تشریح

پہلا بند

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے مرے

دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے

تشریح: نظم کا آغاز ایک پراسرار اور دھیمی آواز سے ہوتا ہے۔ شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان دیکھی ہستی یا قوت برسوں سے اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ یہ آواز اب سرگوشی کی صورت میں کہتی ہے کہ تم آجاؤ کیونکہ تمہیں مسلسل پکارتے پکارتے میرے دل پر تھکن طاری ہوگئی ہے۔ یہاں سرگوشیاں زندگی کے مختلف تجربات، خواہشات اور باطنی آوازوں کی علامت بھی ہوسکتی ہیں جبکہ بلاوا انسان کو اپنی اصل، اپنی منزل یا موت کی طرف بلانے والی ایک گہری اور پراسرار قوت کی علامت ہے۔ شاعر ابتدا ہی میں زندگی اور موت کے فلسفیانہ مسئلے کو ایک علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔

دوسرا بند

کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آ رہی ہے

بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ اس نے زندگی میں مختلف آوازیں اور صدائیں سنی ہیں۔ بعض آوازیں لمحاتی تھیں اور بعض ایک طویل عرصے تک اسے پکارتی رہیں لیکن جو آواز اب اسے سنائی دے رہی ہے، وہ سب سے مختلف اور منفرد ہے۔ یہ آواز ایسی ہے جس کا بلاوا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ زندگی میں خواہشیں، امیدیں اور جذبات انسان کو مسلسل اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اور ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ انسان کو بلانے والی قوتیں ہمیشہ موجود رہیں گی اور شاید کبھی تھکیں گی نہیں۔

تیسرا بند

مرے پیارے بچے مجھے تم سے کتنی محبت ہے دیکھو اگر

یوں کیا تو

برا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا خدایا خدایا

کبھی ایک سسکی کبھی اک تبسم کبھی صرف تیوری

تشریح: اس بند میں زندگی کی مختلف انسانی آوازیں سامنے آتی ہیں۔ کبھی کسی عزیز کی محبت بھری پکار، کبھی بچے سے شفقت کا اظہار، کبھی کسی غلطی پر ناراضی اور کبھی خدا سے فریاد — یہ سب زندگی کے رشتوں اور جذبات کی مختلف صورتیں ہیں۔ سسکی، تبسم اور تیوری انسانی جذبات کی تین مختلف کیفیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں: غم، خوشی اور ناراضی۔ شاعر بتاتا ہے کہ انسان کی زندگی میں کتنی ہی آوازیں اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ محبت، خاندان، دکھ، خوشی اور جذبات سب انسان کو زندگی سے وابستہ رکھتے ہیں۔

چوتھا بند

مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں

انہی سے حیات دوروزہ ابد سے ملی ہے

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ یہ مختلف انسانی آوازیں ہمیشہ سے آتی رہی ہیں اور انہی آوازوں نے انسان کی مختصر زندگی کو معنی اور اہمیت عطا کی ہے۔ حیات دوروزہ سے مراد انسانی زندگی کی عارضی اور مختصر مدت ہے، جبکہ ابد ہمیشہ اور لازوال زمانے کی علامت ہے۔ انسان کی زندگی اگرچہ بہت مختصر ہے، لیکن محبت، تعلقات، خواہشات اور جذبات کی وجہ سے اسے ایک خاص معنویت حاصل ہو جاتی ہے۔

پانچواں بند

مگر یہ انوکھی ندا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے

یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیئے جا رہی ہے

تشریح: اب شاعر اس خاص اور انوکھی آواز کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتا ہے۔ یہ آواز باقی تمام آوازوں سے مختلف ہے، کیونکہ اس میں ایسی طاقت موجود ہے جو زندگی کی دوسری تمام آوازوں کو خاموش کر سکتی ہے۔ یہاں یہ انوکھی ندا موت، فنا یا انسان کی آخری منزل کی علامت ہے۔ موت کی آواز جب انسان کے قریب آتی ہے تو زندگی کے تمام رشتے، خواہشیں، خوشیاں اور غم اپنی اہمیت کھونے لگتے ہیں۔

چھٹا بند

اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری

فقط کان سنتے چلے جا رہے ہیں

تشریح: یہاں شاعر ایک ایسی کیفیت بیان کرتا ہے جس میں انسان زندگی کی خارجی سرگرمیوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں حرکت نہیں، چہرے پر نہ خوشی ہے نہ غصہ، بلکہ انسان مکمل خاموشی اور سکون کی کیفیت میں ہے۔ صرف کان اس پراسرار آواز کو سن رہے ہیں۔ یہ کیفیت اس بات کی علامت ہے کہ شاعر کی تمام توجہ اب زندگی کے ظاہری مظاہر سے ہٹ کر ایک آخری اور گہری حقیقت کی طرف مرکوز ہو گئی ہے۔

ساتواں بند

یہ اک گلستاں ہے ہوا لہلہاتی ہے کلیاں چٹکتی ہیں

غنچے مہکتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں کھل کھل کے مرجھا کے

گرتے ہیں اک فرش مخمل بناتے ہیں جس پر

مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں

تشریح: اس بند میں شاعر ایک خوب صورت باغ کا منظر پیش کرتا ہے۔ ہوا چل رہی ہے، کلیاں چٹک رہی ہیں، غنچے مہک رہے ہیں اور پھول کھل رہے ہیں۔ لیکن پھول اپنی پوری بہار کے بعد مرجھا کر زمین پر گر جاتے ہیں۔ یہ منظر انسانی زندگی کی علامت ہے۔ انسان بھی پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، زندگی کی بہار دیکھتا ہے اور آخر کار فنا ہو جاتا ہے۔ گرے ہوئے پھولوں سے بننے والا مخملی فرش اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک نسل کے ختم ہونے سے دوسری نسل اور نئی زندگی کے لیے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ آرزوؤں کی پریاں انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی علامت ہیں جو زندگی کو خوب صورت بناتی ہیں۔

آٹھواں بند

کہ جیسے گلستاں ہی اک آئینہ ہے

اسی آئینے سے ہر اک شکل نکھری سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی پھر نہ ابھری

تشریح: شاعر گلستان کو ایک آئینے سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس آئینے میں زندگی کی مختلف شکلیں نمودار ہوتی ہیں، نکھرتی اور سنورتی ہیں، لیکن پھر وقت کے ساتھ مٹ جاتی ہیں۔ یہاں آئینہ زندگی اور دنیا کی علامت ہے۔ دنیا میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی شخصیت اور زندگی کو سنوارتے ہیں، لیکن آخر کار موت کے ذریعے فنا ہو جاتے ہیں۔ جو شکل ایک مرتبہ مٹ جاتی ہے، وہ دوبارہ اسی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی۔ اس بند میں زندگی کی ناپائیداری اور فنا کا فلسفہ نمایاں ہے۔

نواں بند

یہ پربت ہے خاموش ساکن

کبھی کوئی چشمہ ابلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اس پار کیا ہے

تشریح: اب شاعر گلستان سے پربت کے منظر کی طرف آتا ہے۔ پربت خاموش، مضبوط اور ساکن ہے، جبکہ اس سے نکلنے والا چشمہ حرکت اور جستجو کی علامت ہے۔ چشمہ سوال کرتا ہے کہ ان چٹانوں کے پار کیا ہے؟ یہ سوال انسانی تجسس اور جستجو کی علامت ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے

موجودہ ماحول اور حالات سے آگے بڑھ کر نئی حقیقتوں کو جاننا چاہتا ہے۔

دسواں بند

مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے دامن میں وادی ہے وادی میں ندی

ہے ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئینہ ہے

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ اسے دور کی جستجو کی ضرورت نہیں، پربت کا دامن ہی اس کے لیے کافی ہے۔ پربت کے دامن میں وادی ہے، وادی میں ندی بہتی ہے اور اس ندی میں چلتی ہوئی ناؤ آئینے کی مانند ہے۔ یہ منظر زندگی کے ایک محدود دائرے کی علامت ہے۔ انسان اپنی دنیا، اپنے ماحول اور اپنے تجربات میں زندگی کے عکس دیکھتا ہے۔ ندی اور ناؤ زندگی کے مسلسل سفر اور وقت کی روانی کی علامت ہیں۔

گیارھواں بند

اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری مگر ایک پل میں جو مٹنے لگی ہے تو

پھر نہ ابھری

تشریح: جس طرح گلستان کے آئینے میں زندگی کی شکلیں نمودار ہو کر مٹ جاتی تھیں، اسی طرح ندی کے آئینے میں بھی تمام شکلیں عارضی ہیں۔ انسان، اس کی خواہشیں، اس کی شخصیت اور اس کے تجربات وقت کے بہاؤ میں ایک لمحے کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر مٹ جاتے ہیں۔ شاعر زندگی کی اسی ناپائیداری کو دوبارہ بیان کرتا ہے۔

بارھواں بند

یہ صحرا ہے پھیلا ہوا خشک بے برگ صحرا

بگولے یہاں تند بھوتوں کا عکس مجسم بنے ہیں

تشریح: اب شاعر ایک وسیع اور سنسان صحرا کا منظر پیش کرتا ہے۔ صحرا خشکی، تنہائی، ویرانی اور زندگی کی بے ثباتی کی علامت ہے۔ صحرا میں اٹھنے والے بگولے ایسے محسوس ہوتے ہیں جیسے کسی خوفناک بھوت کی شکل اختیار کر گئے ہوں۔ یہ منظر انسان کے خوف، تنہائی اور زندگی کی بے معنویت کے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ گلستان زندگی اور حسن کی علامت تھا، پربت استحکام اور جستجو کی، جبکہ صحرا تنہائی اور فنا کی علامت ہے۔

تیرھواں بند

مگر میں تو دور ایک پیڑوں کے جھرمٹ پہ اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں

نہ اب کوئی صحرا نہ پربت نہ کوئی گلستاں

تشریح: شاعر اب گلستان، پربت اور صحرا تینوں مناظر سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی نظریں دور کہیں درختوں کے ایک جھنڈ پر جمی ہوئی ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان زندگی کے مختلف مراحل اور تجربات سے گزر کر اب کسی اور، زیادہ گہری اور آخری حقیقت کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اب دنیا کے خوب صورت باغ، مضبوط پہاڑ اور ویران صحرا سب اس کی نظر میں غیر اہم ہو گئے ہیں۔

چودھواں بند

اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری

فقط ایک انوکھی صدا کہہ رہی ہے کہ تم کو بلاتے بلاتے مرے دل پہ

گہری تھکن چھا رہی ہے

تشریح: یہاں شاعر دوبارہ اسی پراسرار آواز کی طرف آتا ہے جس سے نظم کا آغاز ہوا تھا۔ اب زندگی کی تمام دوسری آوازیں خاموش ہو چکی ہیں۔ نہ آنکھوں میں حرکت ہے، نہ چہرے پر خوشی یا غصے کا اظہار۔ شاعر پوری طرح اس ایک انوکھی صدا میں گم ہو چکا ہے۔ یہ صدا اسے مسلسل اپنی طرف بلا رہی ہے۔

پندرھواں بند

بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ شاید تھکے گا

تو پھر یہ ندا آئینہ ہے فقط میں تھکا ہوں

تشریح: یہ نظم کا نہایت اہم فلسفیانہ موڑ ہے۔ شاعر سوچتا ہے کہ اگر پکارنے والی آواز کبھی نہیں تھکتی تو پھر اس میں تھکن کیسے آ سکتی ہے؟ شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ آواز دراصل ایک آئینہ ہے۔ آواز کی تھکن درحقیقت اس کی اپنی تھکن ہے۔ یعنی شاعر اپنی باطنی کیفیت کو اس آواز پر منسوب کر رہا تھا۔ یہاں شاعر خود شناسی کی ایک گہری منزل پر پہنچتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اکثر اپنے اندر کے احساسات کو خارجی دنیا میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

آخری بند

نہ صحرا نہ پربت نہ کوئی گلستاں فقط اب سمندر بلاتا ہے مجھ کو

کہ ہر شے سمندر سے آئی سمندر میں جا کر ملے گی

تشریح: نظم کے اختتام پر شاعر زندگی کے تمام مناظر — گلستان، پربت اور صحرا — سے آگے بڑھ کر سمندر تک پہنچتا ہے۔ اب اسے صرف سمندر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سمندر یہاں اصل، ازل، کائنات اور انسانی وجود کی آخری منزل کی علامت ہے۔ شاعر کے نزدیک ہر چیز ایک اصل سے وجود میں آتی ہے اور آخر کار اسی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ یہاں سمندر کو انسانی زندگی اور کائنات کی ابتدا اور انتہا کی علامت بنایا گیا ہے۔ انسان زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے، مختلف خواہشوں اور تجربات سے وابستہ رہتا ہے، لیکن آخر کار فنا اور موت کے ذریعے اپنی اصل کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے۔

16.2.2: نظم ''سمندر کا بلاوا'' کی فنی خصوصیات

سمندر کا بلاوا'' بنیادی طور پر انسان کے وجود، زندگی، خواہش، فنا اور موت کے فلسفے کی نظم ہے۔ شاعر زندگی کی مختلف آوازوں، محبتوں اور خواہشوں کو سنتا ہے، لیکن آخر کار اسے ایک ایسی صدا سنائی دیتی ہے جو باقی تمام آوازوں سے زیادہ گہری اور طاقت ور ہے۔ گلستان، پربت اور صحرا انسانی زندگی کے مختلف تجربات اور مراحل کی علامت ہیں جبکہ سمندر انسان کی اصل اور آخری منزل کی علامت ہے۔ نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسان دنیا کی مختلف رنگینیوں، خواہشوں اور تجربات سے گزرتا ہوا آخر کار اپنی اصل کی طرف لوٹتا ہے۔ نظم میں علامت نگاری نہایت اہم ہے اور سمندر، گلستان، پربت اور صحرا گہری علامتی معنویت رکھتے ہیں۔ اس نظم میں زندگی اور موت کا فلسفہ نمایاں ہے۔ فطرت کی خوب صورت اور متنوع تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ نظم میں داخلی مکالمے اور خود کلامی کا انداز موجود ہے۔ آئینہ خود شناسی اور حقیقت کے عکس کی علامت ہے۔ اس نظم میں آزاد نظم کی داخلی موسیقیت اور روانی نمایاں ہے اور تکرار کے ذریعے نظم میں ایک خاص صوتی اور جذباتی اثر پیدا کیا گیا ہے۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ میراجی کی ,, سمندر کا بلاوا'' ایک گہری علامتی اور فلسفیانہ نظم ہے جس میں انسانی زندگی کے عارضی تجربات کے مقابلے میں انسان کی ازلی اور ابدی حقیقت کو تلاش کیا گیا ہے۔ گلستان کی بہار، پربت کی خاموشی اور صحرا کی ویرانی سب عارضی مناظر ہیں، لیکن آخر کار سمندر انسان کو اپنی اصل کی طرف بلاتا ہے۔ شاعر اسی احساس پر نظم ختم کرتا ہے کہ زندگی کی تمام شکلیں فنا ہو جاتی ہیں، مگر وجود کا سفر اپنی اصل کی طرف واپسی میں مکمل ہوتا ہے۔

16.3: سرگرمی: آؤاپنی معلومات جانچیں

سوال1: نظم ''سمندر کا بلاوا'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) ن۔م۔راشد (ب) میراجی

(ج) فیض احمد فیض (د) اختر الایمان

سوال2: نظم کے آخر میں شاعر کو کون بلا رہا ہے؟

(الف) صحرا (ب) پربت

(ج) سمندر (د) گلستاں

سوال3: نظم میں پربت کے دامن میں کیا موجود ہے؟

(الف) صحرا (ب) وادی

(ج) شہر (د) سمندر

سوال4: نظم میں ''بگولے'' کہاں دکھائی دیتے ہیں؟

(الف) گلستاں میں (ب) وادی میں

(ج) صحرا میں (د) سمندر میں

سوال5: ''سمندر کا بلاوا'' میں سمندر بنیادی طور پر کس نوع کی علامت بن کر سامنے آتا ہے؟

(الف) محض تفریح کی (ب) کاروبار کی

(ج) اصل، انجام اور لامحدود حقیقت کی (د) سیاسی جدوجہد کی

16.4: عمومی جائزہ

میراجی کی نظم ''سمندر کا بلاوا'' جدید اردو نظم کی ایک اہم علامتی اور داخلی نوعیت کی نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسانی زندگی، وقت،

آرزو، فنا، وجود اور انسان کے اپنے اصل کی طرف لوٹنے کے احساس کو نہایت مؤثر علامتوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ نظم کی فضا ابتدا ہی سے اسرار اور ایک نامعلوم پکار کے احساس سے معمور ہے۔ شاعر کو مسلسل ایک ایسی آواز سنائی دیتی ہے جو اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ دوسری تمام آوازوں کے مقابلے میں یہ آواز زیادہ گہری، پراسرار اور ہمہ گیر ہے۔

انسانی زندگی میں طرح طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی محبت اور شفقت کی آواز، کبھی ناراضی، کبھی سسکی، کبھی مسکراہٹ اور کبھی تیوری کی صورت میں انسانی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ تمام آوازیں زندگی کے مختلف تجربات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن شاعر کو اب ایک ایسی ندا سنائی دیتی ہے جو دوسری تمام صداؤں پر غالب آتی جا رہی ہے۔ اس کے سامنے عام زندگی کی آوازیں رفتہ رفتہ اپنی اہمیت کھوتی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کے بعد شاعر مختلف قدرتی مناظر کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ پہلے گلستاں کا منظر سامنے آتا ہے جہاں ہوا چل رہی ہے، کلیاں چٹک رہی ہیں، غنچے مہک رہے ہیں اور پھول کھل کر مرجھا رہے ہیں۔ پھولوں کا کھلنا اور پھر مرجھا کر گر جانا زندگی کے عروج اور زوال کی علامت ہے۔ شاعر کو یہ گلستاں ایک آئینہ معلوم ہوتا ہے جس میں زندگی کی شکلیں ابھرتی، سنورتی اور پھر ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہیں۔

پھر پربت، وادی، ندی اور ناؤ کے پیکر سامنے آتے ہیں۔ پربت بظاہر خاموش اور ساکن ہے، لیکن اس کے اندر بھی ایک سوال موجود ہے۔ چشمہ گویا یہ جاننا چاہتا ہے کہ چٹانوں کے دوسری طرف کیا ہے۔ یوں شاعر انسانی تجسس اور نامعلوم حقیقت کی تلاش کو فطری مناظر میں منتقل کر دیتا ہے۔ ندی میں بہتی ہوئی ناؤ بھی آئینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس میں انسانی وجود کی عارضی صورتیں نمایاں ہوتی اور پھر مٹ جاتی ہیں۔ اس کے بعد صحرا کا منظر آتا ہے۔ یہ خشک اور بے برگ صحرا ہے جہاں تیز بگولے خوف ناک اور بھوتوں جیسے پیکر بناتے ہیں۔ تاہم شاعر کی نگاہ ان مناظر سے آگے ایک دوسرے مقام کی طرف لگی ہوئی ہے۔ اب گلستاں، پربت اور صحرا سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور صرف ایک نامعلوم صدا باقی رہ جاتی ہے۔

نظم کے اختتام پر شاعر اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ دراصل اسے نہ گلستاں بلا رہا ہے، نہ پربت اور نہ صحرا، بلکہ سمندر اسے اپنی جانب بلا رہا ہے۔ یہاں سمندر محض پانی کا ایک وسیع ذخیرہ نہیں بلکہ ایک بڑی علامت ہے۔ اسے انسانی وجود کے اصل، لامحدود کائناتی حقیقت، فنا، واپسی اور وحدت کی مختلف سطحوں پر سمجھا جا سکتا ہے۔ نظم کا آخری تصور یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے سرچشمے کی طرف لوٹتی ہے۔ اسی لیے سمندر شاعر کے یہاں ابتدا اور انتہا دونوں کا استعارہ بن جاتا ہے۔ ناقدین نے بھی اس نظم کے سمندر کی مختلف تعبیریں کی ہیں اور اسے محض ایک ہی مفہوم تک محدود نہیں کیا۔ اس طرح ''سمندر کا بلاوا'' زندگی کی ناپائیداری، انسانی آرزوؤں، فنا کے احساس اور اصل حقیقت کی طرف واپسی کی ایک گہری

علامتی نظم ہے۔ میراجی نے خارجی مناظر کو انسان کی داخلی کیفیات کے ساتھ اس طرح مربوط کیا ہے کہ گلستاں، پربت، ندی، صحرا اور سمندر سب انسانی زندگی اور وجود کے مختلف مراحل کی علامت بن جاتے ہیں۔

16.5: فرہنگ

1۔ سرگوشیاں	:	دھیمی آواز میں کہی ہوئی باتیں
2۔ عرصہ	:	مدت، زمانہ
3۔ صدا	:	آواز، پکار
4۔ انوکھی	:	نرالی، غیر معمولی
5۔ ندا	:	پکار، آواز
6۔ آئندہ	:	آنے والا زمانہ
7۔ سسی	:	روتے ہوئے نکلنے والی دبی آواز
8۔ تبسم	:	مسکراہٹ
9۔ تیوری	:	پیشانی پر ناراضی یا غصے کے بل
10۔ حیاتِ دوروزہ	:	مختصر اور عارضی زندگی
11۔ ابد	:	ہمیشہ، لامتناہی زمانہ
12۔ جنبش	:	حرکت
13۔ گلستاں	:	باغ
14۔ غنچے	:	پھول کی بند کلیاں
15۔ فرشِ مخمل	:	مخمل کی مانند نرم بچھونا
16۔ آرزو	:	خواہش، تمنا

17۔ رواں : چلتا ہوا، جاری

18۔ پربت : پہاڑ

19۔ بے برگ : پتوں کے بغیر، خشک

20۔ عکسِ مجسم : کسی شے کی جیتی جاگتی یا مکمل تصویر

16.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال1: میراجی کی نظم ''سمندر کا بلاوا'' کا تنقیدی و تجزیاتی جائزہ پیش کیجیے۔

سوال2: نظم ''سمندر کا بلاوا'' میں سمندر کی علامتی معنویت پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

سوال3: میراجی نے ''سمندر کا بلاوا'' میں گلستاں، پربت، ندی اور صحرا کے پیکروں کو کس طرح انسانی زندگی اور داخلی کیفیات سے وابستہ کیا ہے؟

سوال4: نظم ''سمندر کا بلاوا'' میں فنا، ناپائیداری اور اپنے اصل کی طرف واپسی کے تصور کی وضاحت کیجیے۔

سوال5: ''سمندر کا بلاوا'' کے اسلوب، علامت نگاری، پیکر تراشی اور داخلی فضا کا جائزہ لیجیے۔

16.7: مشقی سوالات

سوال1: نظم ''سمندر کا بلاوا'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

سوال2: نظم میں گلستاں کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے؟

سوال3: شاعر نے صحرا کی تصویر کس طرح پیش کی ہے؟

سوال4: نظم میں ''سمندر'' کس چیز کی علامت ہے؟

16.8: جوابات سرگرمی

1۔(ب) میراجی

2۔(ج) سمندر

3۔(ب)وادی

4۔(ج)صحرا

5۔(ج)اصل،انجام اور لامحدود حقیقت کی

16.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: نظم ''سمندر کا بلاوا'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

جواب : نظم کا مرکزی خیال انسانی زندگی کی ناپائیداری، فنا اور اپنے اصل کی طرف واپسی ہے۔شاعر کو زندگی کی مختلف آوازوں اور تجربات کے درمیان ایک ایسی پراسرار ندا سنائی دیتی ہے جو رفتہ رفتہ باقی تمام آوازوں پر غالب آجاتی ہے۔آخر میں شاعر محسوس کرتا ہے کہ اسے سمندر اپنی طرف بلا رہا ہے۔سمندر یہاں ایک وسیع علامت ہے جو انسان کے اصل، اس کے انجام اور ایک لامحدود حقیقت سے دوبارہ مل جانے کے تصور کو ظاہر کرتی ہے۔اس طرح نظم انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ دنیا کی ظاہری صورتیں عارضی ہیں اور ہر وجود بالآخر اپنے اصل کی طرف لوٹتا ہے۔

سوال2: نظم میں گلستاں کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے؟

جواب : نظم میں گلستاں زندگی کی خوب صورتی، تازگی، خواہشات اور عارضی رونق کی علامت ہے۔گلستاں میں کلیاں چٹکتی، غنچے مہکتے اور پھول کھلتے ہیں، لیکن یہی پھول کچھ عرصے کے بعد مرجھا کر گر جاتے ہیں۔اس منظر کے ذریعے شاعر بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کی خوب صورتی اور جوانی مستقل نہیں۔انسان کی خواہشات اور خوشیاں بھی پھولوں کی طرح ایک مدت تک قائم رہتی ہیں اور پھر ختم ہو جاتی ہیں۔اسی لیے شاعر گلستاں کو ایک آئینے کی طرح دیکھتا ہے جس میں مختلف صورتیں ابھرتی، نکھرتی اور پھر مٹ جاتی ہیں۔

سوال3: شاعر نے صحرا کی تصویر کس طرح پیش کی ہے؟

جواب: شاعر نے صحرا کو خشک، بے برگ، وسیع اور خوف ناک فضا کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہاں تیز بگولے اٹھتے ہیں جو شاعر کو گویا بھوتوں کے مجسم عکس دکھائی دیتے ہیں۔صحرا کا یہ منظر ویرانی، تنہائی، بے ثباتی اور زندگی کے خشک اور دشوار پہلوؤں کی علامت بن جاتا ہے۔تاہم شاعر اس ویران ماحول میں بھی اپنی نظریں دور درختوں کے ایک جھرمٹ پر جمائے رکھتا ہے۔یوں صحرا کی ویرانی کے ساتھ ایک دوسری حقیقت

کی تلاش کا احساس بھی نظم میں موجود رہتا ہے۔

سوال4: نظم میں ''سمندر'' کس چیز کی علامت ہے؟

جواب: نظم میں سمندر سب سے اہم اور مرکزی علامت ہے۔ اسے صرف حقیقی سمندر کے معنی میں نہیں بلکہ انسانی وجود کے سرچشمے، اس کے آخری انجام، فنا، لامحدود حقیقت اور کائناتی وحدت کی علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ نظم کے اختتام تک گلستاں، پربت اور صحرا سب پیچھے رہ جاتے ہیں اور صرف سمندر کی پکار باقی رہتی ہے۔ شاعر کے نزدیک ہر شے کا سفر بالآخر اپنے اصل کی طرف ہے۔ اس لیے سمندر ابتدا اور انتہا دونوں کا احساس پیدا کرتا ہے۔ تاہم نظم کی علامتی ساخت ایسی ہے کہ سمندر کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں؛ بعض ناقدین اسے وجودی اور کائناتی حقیقت کی کلیدی علامت قرار دیتے ہیں۔

یہ مواد آپ کے سابقہ اسباق کی طرح تدریسی یونٹ کے انداز میں تیار کیا گیا ہے۔

16.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 17 ''حسن کوزہ گر'' ن م راشد

ساخت

17.0 اغراض ومقاصد

17.1 تعارف

17.2 نظم ''حسن کوزہ گر'' کا متن

17.2.1 نظم ''حسن کوزہ گر'' کی تشریح

17.2.2 نظم ''حسن کوزہ گر'' کی فنی خصوصیات

17.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

17.4 عمومی جائزہ

17.5 فرہنگ

17.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

17.7 مشقی سوالات

17.8 جوابات سرگرمی

17.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

17.9 امدای کتب

17.0 :اغراض ومقاصد

عزیز متعلم !اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ جدید اردو نظم کے ممتاز شاعر ن۔م۔راشد کی شعری فکر، فنی انفرادیت اور

علامتی طرزِ اظہار سے واقف ہوسکیں۔ نظم ''حسن کوزہ گر'' کے مطالعے سے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ راشد نے محبت، فن، تخلیق، وقت، تنہائی، خواہش اور انسانی وجود جیسے گہرے موضوعات کو علامتوں اور استعارات کے ذریعے کس طرح پیش کیا ہے۔ اس نظم کے ذریعے آپ حسن کوزہ گر اور جہاں زاد کے کرداروں کی معنوی اہمیت کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ کوزہ، مٹی، چاک، جام اور گل دان جیسی اشیا کے علامتی مفاہیم سے بھی واقف ہوسکیں گے۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ ایک فن کار اپنے ذاتی تجربات، محبت، محرومی اور داخلی کرب کو کس طرح تخلیقی توانائی میں تبدیل کرتا ہے اور کس طرح ایک فن پارہ اپنے خالق کی محدود زندگی سے آگے بڑھ کر زمانے میں اپنی شناخت قائم رکھ سکتا ہے۔

اس سبق کا مقصد آپ کے اندر جدید نظم کی پیچیدہ معنوی سطحوں کو سمجھنے، علامت اور استعارے کی پہچان کرنے اور شعری متن کے باطنی مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا بھی ہے۔ نظم کے مطالعے سے آپ عشق اور فن کے باہمی تعلق، فن کار کی تخلیقی جدوجہد اور انسانی زندگی کی ناپائیداری کے مقابلے میں فن کے دوام کے تصور کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔ مزید برآں، آپ ن۔م۔ راشد کے آزاد نظم کے اسلوب، ان کی فکری گہرائی، داخلی مکالمے، پیکر تراشی اور فلسفیانہ اندازِ فکر سے بھی واقف ہوں گے۔ اس طرح یہ سبق نہ صرف ایک اہم جدید نظم کے فہم میں مدد دے گا بلکہ جدید اردو شاعری کے فکری اور فنی رجحانات کو سمجھنے کے لیے بھی آپ کی ادبی بصیرت میں اضافہ کرے گا۔

17.1: تعارف

ن۔م۔ راشد جدید اردو نظم کے ان اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو روایتی موضوعات اور ہیئت سے آگے بڑھاتے ہوئے ایک نئی فکری اور فنی جہت عطا کی۔ ان کی شاعری میں جدید انسان کی تنہائی، محبت، ذات کی تلاش، وقت کا احساس، تہذیبی شعور، وجودی اضطراب اور تخلیقی تجربہ نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ راشد نے آزاد نظم کو اردو شاعری میں مضبوط فنی بنیاد فراہم کی اور ایسی شعری زبان اختیار کی جس میں علامت، استعارہ، فلسفیانہ فکر اور داخلی کیفیت ایک دوسرے کے ساتھ مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''حسن کوزہ گر'' اسی فکری اور تخلیقی مزاج کی ایک نمایاں مثال ہے۔

''حسن کوزہ گر'' ایک طویل علامتی نظم ہے جس کا مرکزی کردار حسن نامی ایک کوزہ گر ہے۔ حسن مٹی کو اپنے ہاتھوں سے مختلف شکلوں میں ڈھالتا اور خوب صورت کوزے، جام، صراحیاں اور گل دان تخلیق کرتا ہے۔ بظاہر وہ ایک عام کوزہ گر ہے، لیکن نظم میں وہ ایک فن کار اور تخلیق کار کی علامت بن جاتا ہے۔ مٹی اس خام مواد کی نمائندگی کرتی ہے جسے فن کار اپنی تخلیقی قوت سے معنی اور صورت عطا کرتا ہے، جبکہ چاک زندگی، وقت اور

تخلیقی عمل کی مسلسل گردش کی علامت بن جاتا ہے۔حسن کے بنائے ہوئے کوزے اس کے فن پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کی ذات، محنت، تجربے اور تخلیقی احساس کو اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔

جہاں زاد نظم کا دوسرا اہم کردار ہے۔وہ حسن کی محبوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسن، کشش، آرزو اور تخلیقی تحریک کی علامت بھی ہے۔حسن اس کی محبت میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ ایک طویل مدت تک اپنے فن سے دور ہو جاتا ہے۔یوں عشق ابتدا میں اس کی تخلیقی قوت کو کمزور کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، لیکن یہی محبت بعد میں اس کے اندر نئی تخلیقی توانائی پیدا کرتی ہے۔اس طرح نظم میں عشق اور فن ایک دوسرے کے مخالف نہیں رہتے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ گہرے تعلق میں سامنے آتے ہیں۔حسن کا ذاتی تجربہ، اس کی محرومی اور اس کی محبت بالآخر اس کے فن کو نئی قوت عطا کرتے ہیں۔نظم میں وقت کا تصور بھی نہایت اہم ہے۔انسان کی زندگی محدود ہے، اس کے تعلقات بدلتے رہتے ہیں اور اس کا جسم فنا ہو جاتا ہے، لیکن فن اپنے خالق کے بعد بھی باقی رہ سکتا ہے۔حسن کے بنائے ہوئے کوزوں کے ٹکڑے صدیوں بعد بھی دریافت کیے جا سکتے ہیں، مگر ان کو بنانے والے فن کار کی پوری داخلی کیفیت، اس کی محبت، اس کی محنت اور اس کا تخلیقی کرب براہِ راست دوبارہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔اس پہلو سے نظم فن اور فن کار کے تعلق کے ساتھ ساتھ اس سوال کو بھی سامنے لاتی ہے کہ ایک تخلیق اپنے خالق سے جدا ہو کر وقت کے ساتھ کس طرح نئی معنویت اختیار کرتی ہے۔

''حسن کوزہ گر'' صرف حسن اور جہاں زاد کی محبت کی داستان نہیں بلکہ یہ فن کار کی تخلیقی زندگی، انسانی تنہائی، خواہش، خود شناسی، فنا اور فن کے دوام کے موضوعات کا ایک گہرا شعری اظہار ہے۔ن۔م۔راشد نے کوزہ گری کے عمل کو انسانی تخلیق کے ایک بڑے استعارے میں تبدیل کر دیا ہے۔حسن کے ہاتھوں مٹی کا کوزے میں ڈھلنا دراصل اسی تخلیقی عمل کی علامت ہے جس کے ذریعے شاعر یا فن کار اپنے منتشر تجربات، جذبات اور خیالات کو ایک مکمل فن پارے کی شکل دیتا ہے۔اسی فکری وسعت، علامتی گہرائی اور فنی حسن کے باعث ''حسن کوزہ گر'' جدید اردو نظم کی اہم اور یادگار تخلیقات میں شمار ہوتی ہے۔

17.2: نظم ''حسن کوزہ گر'' کا متن

جہاں زاد نیچے گلی میں ترے در کے آگے

یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!

تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف

کی دکان پر میں نے دیکھا

تو تیری نگاہوں میں وہ تابنا کی

تھی میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں

جہاں زاد نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!

یہ وہ دور تھا جس میں میں نے

کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب

پلٹ کر نہ دیکھا

وہ کوزے مرے دست چابک کے پتلے

گل و رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں

وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے

حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟

وہ ہم سے خود اپنے عمل سے

خداوند بن کر خداؤں کے مانند ہے روئے گرداں!

جہاں زاد نو سال کا دور یوں مجھ پہ گزرا

کہ جیسے کسی شہر مدفون پر وقت گزرے

تغاروں میں مٹی

کبھی جس کی خوشبو سے وارفتہ ہوتا تھا میں

سنگ بستہ پڑی تھی

صراحی و مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں

مری ہیچ مایہ معیشت کے اظہار فن کے سہارے

شکستہ پڑے تھے

میں خود میں حسن کوزہ گر پا بہ گل خاک بر سر برہنہ

سر چاک ژولیدہ مو سر بہ زانو

کسی غمزدہ دیوتا کی طرح واہمہ کے

گل و لا سے خوابوں کے سیال کوزے بنا تا رہا تھا

جہاں زاد نو سال پہلے

تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی

کہ میں نے حسن کوزہ گر نے

تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں

میں دیکھی ہے وہ تابنا کی

کہ جس سے مرے جسم و جاں ابر و مہتاب کا

رہگزر بن گئے تھے

جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات

وہ رود دجلہ کا ساحل

وہ کشتی وہ ملاح کی بند آنکھیں

کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے

ایک ہی رات وہ کہر باتھی

کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود

اس کی جاں اس کا پیکر

مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا

حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں ہے!

جہاں زاد اس دور میں روز ہر روز

وہ سوختہ بخت آ کر

مجھے دیکھتی چاک پر پا بہ گل سر بہ زانو

تو شانوں سے مجھ کو ہلاتی

(وہی چاک جو سال ہا سال جینے کا تنہا سہارا رہا تھا!)

وہ شانوں سے مجھ کو ہلاتی

حسن کوزہ گر ہوش میں آ

حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر

یہ بچوں کے تنور کیونکر بھریں گے

حسن اے محبت کے مارے

محبت امیروں کی بازی

حسن اپنے دیوار و در پر نظر کر

مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے

کسی ڈوبتے شخص کو زیرِ گرداب کوئی پکارے!

وہ اشکوں کے انبار پھولوں کے انبار تھے ہاں

مگر میں حسن کوزہ گر شہر اوہام کے ان

خرابوں کا مجذوب تھا جن

میں کوئی صدا کوئی جنبش

کسی مرغِ پراں کا سایہ

کسی زندگی کا نشاں تک نہیں تھا!

جہاں زاد میں آج تیری گلی میں

یہاں رات کی سرد گوں تیرگی میں

ترے در کے آگے کھڑا ہوں

سر و مو پریشاں

دریچے سے وہ قاف کی سی طلسمی نگاہیں

مجھے آج پھر جھانکتی ہیں

زمانہ، جہاں زاد وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو

اور فانوس و گلداں

کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انساں

میں انساں ہوں لیکن

یہ نو سال جو غم کے قالب میں گزرے!

حسن کوزہ گر آج اک تودہ خاک ہے جسم

میں نم کا اثر تک نہیں ہے

جہاں زاد بازار میں صبح عطار یوسف

کی دکان پر تیری آنکھیں

پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں

ان آنکھوں کی تابندہ شوخی

سے اٹھی ہے پھر تودہ خاک میں نم کی ہلکی سی لرزش

یہی شاید اس خاک کو گل بنا دے!

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن

تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر

وہی کوزہ گر جس کے کوزے

تھے ہر کاخ و کو اور ہر شہر و قریہ کی نازش

تھے جن سے امیر و گدا کے مساکن درخشاں

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن

تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب

گل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب

معیشت کے اظہار فن کے سہاروں کی جانب

کہ میں اس گل ولا سے اس رنگ وروغن

سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے

دلوں کے خرابے ہوں روشن!

17.2.1: نظم ''حسن کوزہ گر'' کی تشریح

ن۔م۔راشد کی نظم ,, حسن کوزہ گر'' جدید اردو نظم کی ایک نہایت اہم اور علامتی نظم ہے۔اس نظم میں شاعر نے ایک کوزہ گر حسن کی کہانی کے ذریعے محبت، فن، محرومی، معاشی مجبوری، انسانی وجود اور زندگی کی مسلسل تبدیلی جیسے گہرے موضوعات کو پیش کیا ہے۔نظم کا مرکزی کردار حسن کوزہ گر ہے، جو ایک ماہر فن کار ہے۔ وہ مٹی سے خوب صورت کوزے، صراحیاں، جام، سبو اور دوسرے ظروف بناتا ہے۔اس کی زندگی ایک عورت جہاں زاد کی محبت سے اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی، اپنے فن اور اپنے گھر والوں تک سے غافل ہو جاتا ہے۔کئی برسوں کی محرومی اور ناکامی کے بعد جہاں زاد کی نگاہوں میں دوبارہ امید کی ایک چمک دیکھ کر اس کے اندر زندگی اور فن کی نئی قوت پیدا ہونے لگتی ہے۔

جہاں زاد نیچے گلی میں ترے در کے آگے

یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!

نظم کا آغاز ایک انتہائی جذباتی اور ڈرامائی منظر سے ہوتا ہے۔حسن کوزہ گر رات کے وقت جہاں زاد کے گھر کے سامنے کھڑا ہے اور اسے مخاطب کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ,, سوختہ سر'' یعنی دکھوں اور محرومیوں کا مارا ہوا انسان قرار دیتا ہے۔اس انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن ایک طویل عرصے کی ناکامی، محبت کی محرومی اور ذہنی اذیت کے بعد جہاں زاد کے سامنے آیا ہے۔اس کے دل میں جہاں زاد کے لیے محبت ابھی تک زندہ ہے۔

تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف

کی دکان پر میں نے دیکھا

تو تیری نگاہوں میں وہ تابنا کی

تھی میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں

حسن کہتا ہے کہ اس نے صبح بازار میں عطار یوسف کی دکان پر جہاں زاد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اسے ایک ایسی چمک دکھائی دی جس کی تلاش میں وہ گزشتہ نو سال سے بے چین اور دیوانہ وار پھرتا رہا تھا۔ یہاں آنکھوں کی تابنا کی محض ظاہری حسن نہیں بلکہ محبت، امید، زندگی اور روحانی کشش کی علامت ہے۔ حسن کی پوری زندگی اس ایک نگاہ اور اس کی یاد کے گرد گھومتی رہی ہے۔

یہ وہ دور تھا جس میں میں نے

کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب

پلٹ کر نہ دیکھا

حسن کہتا ہے کہ محبت کے اس جنون کے زمانے میں وہ اپنے فن سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے کوزے، جو کبھی اس کی زندگی اور شناخت تھے، اب اس کی توجہ سے محروم ہو گئے۔ یہاں کوزے فن اور عملی زندگی کی علامت ہیں۔ شاعر دکھاتا ہے کہ جب انسان کسی شدید جذبے یا جنون میں گرفتار ہو جاتا ہے تو بعض اوقات اپنی دوسری ذمہ داریوں اور صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

وہ کوزے مرے دست چابک کے پتلے

گل و رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں

حسن اپنے کوزوں کو بے جان مخلوق کہتا ہے۔ اگرچہ وہ ان کو اپنے ہاتھوں سے بناتا اور رنگتا سنوارتا تھا، مگر اب اس کے نزدیک ان میں زندگی اور کشش باقی نہیں رہی۔ یہاں ایک گہرا تضاد موجود ہے۔ پہلے حسن اپنے فن کو زندگی سمجھتا تھا، لیکن محبت کے بعد اس کے لیے فن کی دنیا بے معنی ہو گئی۔ اس کی اصل توجہ ایک زندہ انسانی وجود، یعنی جہاں زاد، کی طرف منتقل ہو گئی۔

وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے

حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟

وہ ہم سے خود اپنے عمل سے

خداوند بن کر خداؤں کے مانند ہے روئے گرداں!

یہاں شاعر نے حسن کے فن کارانہ غرور اور اس کے اپنے فن سے تعلق کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ حسن کے بنائے ہوئے کوزے گویا

آپس میں بات کر رہے ہیں اور اپنے خالق کو تلاش کر رہے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہمارا بنانے والا کہاں چلا گیا؟ وہ ہمیں پیدا کر کے ہم سے منہ موڑ گیا ہے۔ یہاں فن کار اور اس کی تخلیق کے رشتے کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ فن کار اپنے فن کے ذریعے ایک تخلیق کار کی حیثیت اختیار کرتا ہے، لیکن حسن اپنی محبت کے جنون میں اپنی تخلیقات سے دور ہو گیا ہے۔

جہاں زاد نو سال کا دور یوں مجھ پہ گزرا

کہ جیسے کسی شہر مدفون پر وقت گزرے

حسن اپنے نو سالہ دکھ اور محرومی کے زمانے کو ایک ایسے مدفون شہر سے تشبیہ دیتا ہے جس پر زمانہ گزر رہا ہو۔ یہ تشبیہ بتاتی ہے کہ حسن کی زندگی گویا رک گئی تھی۔ وہ زندہ تو تھا، لیکن اس کے اندر زندگی کی حرارت اور حرکت باقی نہیں تھی۔ اس کا وجود ایک دفن شدہ شہر کی طرح ویران اور خاموش ہو گیا تھا۔

تغاروں میں مٹی

کبھی جس کی خوشبو سے وارفتہ ہوتا تھا میں

سنگ بستہ پڑی تھی

وہ مٹی جس سے حسن کو بے پناہ محبت تھی اور جس کی خوشبو اسے مسحور کر دیتی تھی، اب بے استعمال پڑی ہوئی تھی۔ یہاں مٹی فن، تخلیقی صلاحیت اور زندگی کے امکانات کی علامت ہے۔ حسن کے اندر تخلیقی صلاحیت موجود تھی، لیکن محبت کے غم نے اسے بے حرکت کر دیا تھا۔

آٹھویں بند کی تشریح

صراحی و مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں

مری ہیچ مایہ معیشت کے اظہار فن کے سہارے

شکستہ پڑے تھے

حسن کے بنائے ہوئے صراحی، جام، سبو، فانوس اور گلدان ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں۔

ان اشیا کا تعلق اس کی معیشت اور فن دونوں سے ہے۔ وہ انہی چیزوں کو بنا کر اپنی روزی کماتا تھا۔ چنانچہ یہاں شاعر ایک اہم حقیقت

کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فن کار صرف جذباتی انسان نہیں ہوتا بلکہ اسے زندگی گزارنے کے لیے معاشی وسائل بھی درکار ہوتے ہیں۔ ,, معیشت کے اظہارِ فن کے سہارے'' سے مراد یہ ہے کہ حسن کا فن اس کی روزی کا ذریعہ بھی تھا۔

میں خود میں حسن کوزہ گر پا بہ گل خاک بر سر برہنہ

سر چاک ژولیدہ موسر بہ زانو

کسی غمزدہ دیوتا کی طرح

حسن اپنی انتہائی شکستہ اور دردناک حالت بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مٹی میں پھنسا ہوا، خاک آلود، برہنہ سر، بکھرے بالوں اور غم میں ڈوبا ہوا دکھاتا ہے۔ اس کی حالت ایک ایسے شکست خوردہ فن کار کی ہے جس نے زندگی کی تمام توانائی کھو دی ہو۔ غمزدہ دیوتا کی تشبیہ بہت معنی خیز ہے۔ حسن ایک تخلیق کار ہے، اس لیے وہ ایک حد تک ,, خالق'' ہے، لیکن خود اپنی محبت اور محرومی کے سامنے بے بس ہے۔

واہمہ کے

گل ولا سے خوابوں کے سیال کوزے بنا تا رہا تھا

حسن اب حقیقت کی دنیا سے کٹ چکا ہے۔ وہ مٹی کے حقیقی کوزے بنانے کے بجائے اپنے تخیل اور واہمے کی دنیا میں خوابوں کے کوزے بنا رہا ہے۔ یہاں شاعر نے حقیقت اور خواب کے تضاد کو پیش کیا ہے۔ حسن کا فن عملی زندگی سے جدا ہو کر صرف تخیل کی دنیا میں محدود ہو گیا ہے۔

گیارھویں بند کی تشریح

جہاں زاد نو سال پہلے

تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی

کہ میں نے حسن کوزہ گر نے

تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں

میں دیکھی ہے وہ تابناکی

حسن جہاں زاد کو یاد دلاتا ہے کہ نو سال پہلے وہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھی، لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ حسن اس کی آنکھوں کی روشنی سے کس

قدر متاثر ہے۔،، قاف کی سی افق تاب آنکھیں'' ایک انتہائی خوب صورت علامت ہے۔کوہِ قاف مشرقی داستانوں میں ایک پراسرار، دور اور طلسماتی دنیا کی علامت ہے۔ جہاں زاد کی آنکھیں بھی حسن کے لیے ایک ایسی ہی پراسرار اور سحر انگیز دنیا ہیں۔

کہ جس سے مرے جسم و جاں ابر و مہتاب کا

رہگزر بن گئے تھے

جہاں زاد کی آنکھوں کی روشنی نے حسن کے جسم اور روح کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا تھا جو بادلوں اور چاندنی سے بھری ہوئی تھی۔اس سے مراد یہ ہے کہ محبت نے حسن کے وجود کو عام زندگی سے بلند کر دیا تھا۔اس کی روح ایک خواب ناک اور رومانی دنیا میں داخل ہوگئی تھی۔

تیرھویں بند کی تشریح

جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات

وہ رودِ دجلہ کا ساحل

وہ کشتی وہ ملاح کی بند آنکھیں

یہاں شاعر ایک یادگار رومانوی منظر پیش کرتا ہے۔ بغداد کی رات، دریائے دجلہ کا ساحل، کشتی اور سویا ہوا ملاح سب مل کر ایک خواب ناک فضا پیدا کرتے ہیں۔ یہ منظر حسن کی زندگی کا وہ لمحہ ہے جس میں اس نے محبت کو اپنی پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

چودھویں بند کی تشریح

کسی خستہ جاں رنج برکوزہ گر کے لیے

ایک ہی رات وہ کہربا تھی

حسن کے لیے وہ ایک رات کہربا یعنی مقناطیسی کشش رکھنے والی قوت تھی۔اس ایک تجربے نے اس کی پوری زندگی بدل دی۔محبت کا ایک لمحہ بعض اوقات انسان کی پوری شخصیت اور زندگی پر مستقل اثر چھوڑ دیتا ہے۔

پندرھویں بند کی تشریح

مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا

حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں ہے!

محبت کی وہ ایک رات دریا کی ایسی لہر ثابت ہوئی جس میں حسن ڈوب گیا اور پھر باہر نہ نکل سکا۔

یہاں دریا کی لہر محبت کے شدید اور بے قابو جذبے کی علامت ہے۔ حسن محبت کے اس تجربے میں اس قدر ڈوب گیا کہ اس کی سابقہ زندگی، فن اور حقیقت سب پیچھے رہ گئے۔

جہاں زاد اس دور میں روز ہر روز

وہ سوختہ بخت آ کر

مجھے دیکھتی چاک پر پا بہ گل سر بہ زانو

یہاں حسن اپنی بیوی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ روزانہ اسے چاک کے سامنے مٹی میں ہاتھ ڈالے، غمگین اور بے حال دیکھتی تھی۔

حسن کی بیوی ایک ایسی عورت ہے جو زندگی کی عملی ضرورتوں کو سمجھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ محبت کے خوابوں سے گھر نہیں چلتا۔

حسن کوزہ گر ہوش میں آ

حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر

یہ بچوں کے تنور کیونکر بھریں گے

حسن کی بیوی اسے حقیقت کی طرف واپس بلاتی ہے۔ وہ اسے یاد دلاتی ہے کہ گھر ویران ہو رہا ہے اور بچوں کی ضروریات پوری کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

,, بچوں کے تنور'' سے مراد بچوں کا پیٹ اور ان کی خوراک ہے۔

یہاں شاعر نے محبت اور معاشی زندگی کے درمیان ایک بنیادی کشمکش پیش کی ہے۔

اٹھارھویں بند کی تشریح

حسن اے محبت کے مارے

محبت امیروں کی بازی

حسن کی بیوی کا یہ جملہ نظم کے اہم ترین خیالات میں سے ایک ہے۔

وہ کہتی ہے کہ محبت اور عشق کے خواب غریب انسان کے لیے ایک عیش ہیں۔ غریب انسان کو پہلے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرنی

پڑتی ہیں۔ یہاں ن۔م۔ راشد نے طبقاتی اور معاشی حقیقت کو نہایت شدت سے بیان کیا ہے۔ محبت کے بلند جذبات اور زندگی کی معاشی ضروریات کے درمیان شدید تضاد موجود ہے۔

انیسویں بند کی تشریح

مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے

کسی ڈوبتے شخص کو زیرِ گرداب کوئی پکارے!

حسن اپنی بیوی کی آواز سنتا ضرور ہے، لیکن اس کا اثر اس پر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ حقیقت کی طرف واپس آ سکے۔ وہ خود محبت کے گرداب میں ڈوبا ہوا ہے اور بیوی کی آواز اسے بچانے کی کوشش کر رہی ہے، جیسے کوئی شخص پانی میں ڈوبنے والے کو پکار رہا ہو۔

بیسویں بند کی تشریح

وہ اشکوں کے انبار پھولوں کے انبار تھے ہاں

مگر میں حسن کوزہ گر شہرِ اوہام کے ان

خرابوں کا مجذوب تھا

حسن کی بیوی کے آنسو اور اس کی محبت دونوں موجود تھے، لیکن حسن ان سب سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ ''شہرِ اوہام'' یعنی وہم اور خیال کی دنیا کے کھنڈرات میں گم تھا۔ یہاں شاعر دکھاتا ہے کہ شدید جذبات انسان کو بعض اوقات حقیقت سے اتنا دور لے جاتے ہیں کہ وہ اپنے قریب موجود محبت اور رشتوں کی قدر بھی نہیں کر پاتا۔

جن میں کوئی صدا کوئی جنبش

کسی مرغِ پراں کا سایہ

کسی زندگی کا نشاں تک نہیں تھا!

شہرِ اوہام کو مکمل ویرانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ وہاں نہ آواز ہے، نہ حرکت اور نہ زندگی کی کوئی علامت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حسن کی تخیلی دنیا بظاہر خوب صورت اور رومانوی تھی، لیکن حقیقت میں وہ زندگی سے خالی تھی۔

جہاں زاد میں آج تیری گلی میں

یہاں رات کی سرد گوں تیرگی میں

ترے در کے آگے کھڑا ہوں

اب نظم دوبارہ موجودہ لمحے میں واپس آتی ہے۔حسن کئی سال بعد جہاں زاد کے دروازے کے سامنے کھڑا ہے۔رات کی تاریکی حسن کی زندگی کی تاریکی اوراس کی محرومی کی علامت ہے۔

سرومو پریشاں

دریچے سے وہ قاف کی سی طلسمی نگاہیں

مجھے آج پھر جھانکتی ہیں

جہاں زاد کی آنکھیں دوبارہ حسن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔یہاں آنکھیں ایک بار پھر محبت، امید، زندگی اور تخلیقی تحریک کی علامت بن جاتی ہیں۔

زمانہ، جہاں زاد وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو

اور فانوس و گلداں

کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انساں

یہ نظم کا ایک نہایت فلسفیانہ حصہ ہے۔

حسن کہتا ہے کہ زمانہ ایک چاک ہے اور انسان اس چاک پر بننے اور بگڑنے والے مٹی کے برتن ہیں۔

جیسے کوزہ گر چاک پر مٹی کو شکل دیتا ہے، ویسے ہی زمانہ انسانوں کی شخصیت اور زندگی کو تشکیل دیتا اور بدلتا رہتا ہے۔

یہاں چاک = زمانہ اور کوزے = انسان کی بڑی علامت سامنے آتی ہے۔

پچیسویں بند کی تشریح

میں انساں ہوں لیکن

یہ نو سال جو غم کے قالب میں گزرے!

حسن اپنی انسانیت اور اپنی شکست کو محسوس کرتا ہے۔نو سال کے غم نے اس کی شخصیت کو بدل دیا ہے۔

,, غم کا قالب'' اس بات کی علامت ہے کہ غم نے اس کی پوری زندگی کو ایک مخصوص شکل دے دی ہے۔

چھبیسویں بند کی تشریح

حسن کوزہ گر آج اک تودہ خاک ہے جسم

میں نم کا اثر تک نہیں ہے

حسن اپنے آپ کو خشک مٹی کا ایک ڈھیر قرار دیتا ہے۔

مٹی میں نمی نہ ہو تو اسے گوندھ کر کوئی شکل نہیں دی جا سکتی۔اسی طرح حسن کی زندگی میں بھی اب جذبات، توانائی اور تخلیقی قوت ختم ہو چکی ہے۔

یہ خشک مٹی مایوسی، مردہ پن اور تخلیقی جمود کی علامت ہے۔

ستائیسویں بند کی تشریح

ان آنکھوں کی تابندہ شوخی

سے اٹھی ہے پھر تودہ خاک میں نم کی ہلکی سی لرزش

یہی شاید اس خاک کو گل بنا دے!

جہاں زاد کی آنکھوں کو دوبارہ دیکھ کر حسن کے اندر زندگی کی ایک نئی حرکت پیدا ہوتی ہے۔

خشک مٹی میں نمی آنے لگتی ہے۔شاعر یہاں نم اور گل کے ذریعے تخلیقی بیداری کی علامت پیش کرتا ہے۔

یعنی محبت نے حسن کے مردہ وجود میں دوبارہ زندگی کی امید پیدا کر دی ہے۔

اٹھائیسویں بند کی تشریح

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن

تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر

وہی کوزہ گر

حسن کہتا ہے کہ انسانی خواہش اور تمنا کی کوئی حد نہیں۔اگر جہاں زاد چاہے تو وہ دوبارہ اپنے فن کی دنیا میں لوٹ سکتا ہے۔

یہاں محبت اب صرف تباہی کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ تخلیقی توانائی کا ذریعہ بننے لگتی ہے۔

انتیسویں بند کی تشریح

وہی کوزہ گر جس کے کوزے

تھے ہر کاخ وکو اور ہر شہر وقریہ کی نازش

تھے جن سے امیر وگدا کے مساکن درخشاں

حسن اپنے ماضی کے عظیم فن کو یاد کرتا ہے۔اس کے بنائے ہوئے کوزے ہر جگہ مشہور تھے اور امیر وغریب سب ان سے اپنے گھر سجاتے تھے۔

یہاں فن کی عوامی اور انسانی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

آخری بند کی تشریح

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن

تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب

حسن اپنے چھوڑے ہوئے فن کی طرف واپس جانے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔

,, مہجور کوزے'' اس کے وہ فن پارے ہیں جنہیں اس نے اپنی محبت اور جنون کی وجہ سے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

گل ولا کے سوکھے تغاروں کی جانب

معیشت کے اظہار فن کے سہاروں کی جانب

وہ دوبارہ مٹی، رنگ اور روغن کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ساتھ ہی وہ فن کے معاشی پہلو کو بھی تسلیم کرتا ہے۔

اب حسن صرف خوابوں میں رہنے والا عاشق نہیں بلکہ وہ دوبارہ حقیقت، فن اور زندگی کے درمیان تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔

کہ میں اس گل ولا سے اس رنگ وروغن

سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے

دلوں کے خرابے ہوں روشن!

نظم کے اختتام پر حسن ایک نئے عزم کا اظہار کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے دوبارہ ایسے شاہکار تخلیق کرے گا جو لوگوں کے ویران دلوں کو روشن کر دیں گے۔

یہاں شرارے=فن کی روشنی اور تخلیقی قوت

اور دلوں کے خرابے=انسانی روح کی ویرانی کی علامت ہیں۔

نظم ایک انتہائی امید افزا انداز میں ختم ہوتی ہے۔

17.2.2: نظم ''حسن کوزہ گر'' کی فنی خصوصیات

,, حسن کوزہ گر'' کا بنیادی موضوع محبت اور فن کے تعلق کو بیان کرنا ہے۔ شاعر دکھاتا ہے کہ شدید محبت انسان کو اپنی عملی زندگی اور ذمہ داریوں سے دور کر سکتی ہے، لیکن یہی محبت اگر تخلیقی شعور سے وابستہ ہو جائے تو انسان کے اندر نئی زندگی اور نئی تخلیقی قوت بھی پیدا کر سکتی ہے۔ حسن کی زندگی میں محبت پہلے اسے تباہ کرتی ہے، اس کے فن کو ماند کر دیتی ہے اور اسے حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔ لیکن نظم کے آخر میں جہاں زاد کی نگاہیں اس کے اندر دوبارہ زندگی اور فن کی قوت بیدار کر دیتی ہیں۔ اس طرح نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسانی زندگی مسلسل بننے اور بگڑنے کا عمل ہے۔ محبت، غم اور محرومی انسان کو توڑ بھی سکتے ہیں، لیکن یہی تجربات اسے دوبارہ تخلیق اور زندگی کی طرف بھی لے جا سکتے ہیں۔

اہم علامتیں

1۔ حسن کوزہ گر: حسن ایک عام کوزہ گر ہونے کے ساتھ ساتھ فن کار اور حساس انسان کی علامت ہے۔

2۔ کوزے: کوزے فن پاروں، انسانی زندگی اور انسان کی تخلیق شدہ دنیا کی علامت ہیں۔

3۔ چاک: چاک زمانے اور زندگی کے مسلسل عمل کی علامت ہے۔

4۔ مٹی: مٹی انسانی وجود اور تخلیقی صلاحیت کی علامت ہے۔

5 ۔ نمی: نمی زندگی، جذبے، امید اور تخلیقی توانائی کی علامت ہے۔

6۔ جہاں زاد کی آنکھیں: یہ محبت، حسن، امید اور تخلیقی تحریک کی علامت ہیں۔

7۔ دریا: دریا محبت اور جذبات کی بے پناہ اور بے قابو قوت کی علامت ہے۔

8۔ شہرِ اوہام: یہ حقیقت سے کٹی ہوئی تخیلی اور غیر حقیقی زندگی کی علامت ہے۔

نظم میں تقریباً ہر بڑی شے علامتی معنی رکھتی ہے۔ چاک، مٹی، کوزے، دریا اور آنکھیں سب گہرے مفہوم رکھتے ہیں۔ پوری نظم ایک مکالمے کی کیفیت رکھتی ہے۔ حسن براہِ راست جہاں زاد سے مخاطب ہے، جس سے نظم میں ڈرامائیت پیدا ہوتی ہے۔ بغداد، دجلہ، کوہِ قاف اور جہاں زاد جیسے عناصر نظم میں مشرقی داستانوں کی پراسرار اور طلسماتی فضا پیدا کرتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد نے انتہائی جاندار تصویریں پیش کی ہیں، مثلاً:

بغداد کی خواب ناک رات

دجلہ کا ساحل

کشتی اور بند آنکھوں والا ملاح

خشک مٹی کا ڈھیر

چاک پر بیٹھا ہوا کوزہ گر

,, جہاں زاد'' اور ,, حسن کوزہ گر'' کی تکرار نظم میں ایک خاص موسیقی اور جذباتی شدت پیدا کرتی ہے۔ نظم میں حسن کی داخلی کیفیت، محبت کا جنون، محرومی، مایوسی اور دوبارہ امید پیدا ہونے کے مختلف مراحل بڑی نفسیاتی گہرائی سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسن کوزہ گر'' ن۔م۔ راشد کی ایک گہری، علامتی اور فلسفیانہ نظم ہے۔ اس میں ایک عاشق اور فن کار کی داخلی زندگی کو کوزہ گری کے استعارے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ حسن پہلے محبت میں گرفتار ہو کر اپنے فن اور زندگی سے دور ہو جاتا ہے۔ نو سال کی محرومی اسے ایک خشک مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان کر دیتی ہے، لیکن جہاں زاد کی آنکھوں میں دوبارہ امید اور محبت کی چمک دیکھ کر اس کے اندر زندگی کی نمی واپس آنے لگتی ہے۔ اس نظم کا سب سے اہم پیغام یہ ہے کہ انسان بھی مٹی کی طرح ہے۔ حالات اور زمانہ اسے بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں، لیکن محبت، امید اور تخلیقی جذبہ اس خشک مٹی میں دوبارہ نمی پیدا کر کے اسے ایک نئی شکل دے سکتا ہے۔

17.3: سرگرمی! آوخود کو جانچیں۔

سوال1: نظم ''حسن کوزہ گر'' کس نوعیت کی ہے؟

(الف) پابند (ب) آزاد

(ج) معرٰی (د) نثری

سوال2: اس نظم میں حسن کا پیشہ کیا ہے؟

(الف) مصوری (ب) کوزہ گری

(ج) موسیقی (د) خطاطی

سوال3: نظم میں حسن کی محبوبہ کا نام کیا ہے؟

(الف) سلمٰی (ب) جہاں زاد

(ج) زہرہ (د) شیریں

سوال4: حسن کوزہ گر نے جہاں زاد کی محبت میں کتنے برس اپنی کوزہ گری سے غفلت برتی؟

(الف) پانچ برس (ب) سات برس

(ج) نو برس (د) دس برس

سوال5: نظم ''حسن کوزہ گر'' کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

(الف) سیاسی انقلاب (ب) جنگ وجدل

(ج) محبت، فن اور تخلیقی عمل (د) قدرتی مناظر

17.4: عمومی جائزہ۔

''حسن کوزہ گر'' ن۔م۔راشد کی ایک اہم، طویل اور علامتی نظم ہے جس میں محبت، فن، تخلیق، تنہائی، وقت اور انسانی وجود کے مسائل کو

گہری فکری سطح پر پیش کیا گیا ہے۔ نظم کا مرکزی کردار حسن ایک کوزہ گر ہے اور جہاں زاد اس کی محبوبہ ہے۔ حسن کی کوزہ گری محض ایک پیشہ نہیں بلکہ اس کے فن، تخلیقی صلاحیت اور شخصیت کی علامت ہے۔ اسی طرح مٹی، چاک، کوزے، جام، سبو اور گل دان محض اشیا نہیں بلکہ فن کار کے تخلیقی تجربے اور اس کی داخلی دنیا کی علامتیں بن جاتے ہیں۔

نظم کے پہلے حصے میں حسن جہاں زاد کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی گزشتہ زندگی کو یاد کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ جہاں زاد کی محبت نے اسے اس شدت سے اپنی گرفت میں لیا کہ وہ نو برس تک اپنے فن اور کوزوں سے تقریباً بے نیاز رہا۔ ایک زمانہ تھا جب مٹی کی خوشبو اسے سرشار کر دیتی تھی اور اس کے ہاتھوں سے خوب صورت کوزے تخلیق ہوتے تھے، لیکن عشق کے غلبے نے اس کے تخلیقی عمل کو روک دیا۔ اس کے کوزے، صراحیاں، مینا، جام اور گل دان شکستہ پڑے رہے اور حسن اپنی ہی دنیا سے کٹ گیا۔ حسن کے لیے جہاں زاد صرف ایک محبوبہ نہیں بلکہ حسن، آرزو اور تخلیقی تحریک کا سرچشمہ بھی ہے۔ اس کی آنکھوں کی تابناکی حسن کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کرتی ہے۔ ایک طرف عشق اسے اپنے فن سے دور کر دیتا ہے، لیکن دوسری طرف یہی عشق بالآخر اس کی تخلیقی قوت کو دوبارہ بیدار کرنے کا سبب بنتا ہے۔ حسن محسوس کرتا ہے کہ اس کے وجود کی خشک مٹی میں دوبارہ نمی پیدا ہو رہی ہے اور شاید وہ ایک مرتبہ پھر اپنے فن کی طرف لوٹ سکے۔

نظم کے دوسرے حصے میں حسن اپنے عشق اور اپنے باطن کا زیادہ گہرا جائزہ لیتا ہے۔ وہ جہاں زاد کو ایک آئینے کی مانند دیکھتا ہے جس میں اسے بالآخر اپنی ہی صورت اور اپنی تنہائی دکھائی دیتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ انسان محبت میں بھی بہت حد تک اپنی ہی ذات، اپنی خواہش اور اپنی داخلی تشنگی کی جستجو کرتا ہے۔ یہاں راشد عشق کو محض رومانوی جذبے کے طور پر نہیں بلکہ خود شناسی اور باطنی تجربے کے وسیلے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وقت بھی نظم کا ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ حسن کے لیے وقت مسلسل حرکت کرنے والی قوت ہے۔ انسان بدلتے ہیں، اشیا ٹوٹتی ہیں، کوزے بنتے اور بگڑتے ہیں، لیکن انسانی تخلیقی خواہش اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اسی لیے کوزہ گری زندگی اور تخلیق کے مسلسل عمل کی علامت بن جاتی ہے۔ فن کار مٹی کو شکل دیتا ہے، لیکن اسی عمل میں وہ اپنی ذات کو بھی تشکیل دیتا ہے۔

نظم کے تیسرے حصے میں حسن اور جہاں زاد کے تعلق کو مزید گہرائی حاصل ہوتی ہے۔ محبت یہاں محض جسمانی یا جذباتی تعلق نہیں رہتی بلکہ انسان کی ایک گہری وجودی تشنگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حسن کے اندر تخلیق، محبت اور زندگی کی خواہش ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ چوتھے حصے میں نظم کا دائرہ فرد سے نکل کر تاریخ اور تہذیب تک پھیل جاتا ہے۔ ہزاروں برس بعد کسی مدفون شہر سے حسن کے بنائے ہوئے جام، مینا اور گل دان کے ٹکڑے دریافت ہوتے ہیں۔ لوگ ان ٹکڑوں کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن وہ اس فن کار کے جذبات، محبت، مشقت، پسینے اور

تخلیقی کرب کو مکمل طور پر نہیں جان سکتے جس نے انہیں تخلیق کیا تھا۔ یوں راشد یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ فن اپنے خالق کی محدود زندگی سے آگے نکل جاتا ہے اور زمانوں تک باقی رہ سکتا ہے۔

''حسن کوزہ گر'' میں کوزہ گر دراصل فن کار کی علامت ہے، مٹی خام تجربے اور انسانی زندگی کی، چاک وقت اور تخلیقی عمل کی، کوزے فن پاروں کی اور جہاں زاد حسن، محبت اور تخلیقی تحریک کی علامت بن جاتی ہے۔ پوری نظم میں عشق اور فن کا باہمی رشتہ نمایاں ہے۔ حسن ابتدا میں عشق کے سبب اپنے فن سے دور ہوتا ہے لیکن آخر کار وہ اسی تجرب؟ عشق کو اپنی نئی تخلیقی توانائی میں تبدیل کرتا ہے۔ اس طرح ''حسن کوزہ گر'' محض ایک عاشق اور محبوبہ کی کہانی نہیں بلکہ فن کار کے تخلیقی سفر، انسانی تنہائی، محبت، خود شناسی، وقت اور فن کی بقا کی ایک گہری علامتی داستان ہے۔

17.5: فرہنگ

1۔ سوختہ سر : مصیبت زدہ، عشق میں جلا ہوا

2۔ تابناکی : چمک، روشنی

3۔ رنجور : غم زدہ، بیمار حال

4۔ دستِ چابک : ماہر اور تیز ہاتھ

5۔ روئے گرداں : منہ پھیرنے والا

6۔ شہرِ مدفون : زمین میں دبا ہوا شہر

7۔ تغار : مٹی گوندھنے کا بڑا برتن

8۔ وارفتہ : بے خود، فریفتہ

9۔ سنگ بستہ : پتھر کی طرح سخت

10۔ صراحی : لمبی گردن والا برتن

11۔ مینا : شراب یا پانی رکھنے کا شیشے کا برتن

12۔ سبو : گھڑا، شراب یا پانی رکھنے کا برتن

13۔ ہیچ مایہ : کم قدر، معمولی

14۔ پابہ گل : مٹی میں پاؤں رکھے ہوئے؛ گرفتار

15۔ ژولیدہ مو : بکھرے ہوئے بالوں والا

16۔ واہمہ : خیال، اندیشہ

17۔ خستہ جاں : تھکا ماندہ، دکھوں کا مارا

18۔ نوائے حزیں : غم بھری آواز

19۔ تودہ خاک : مٹی کا ڈھیر

20۔ مہجور : جدا کیا ہوا، متروک، دور پڑا ہوا

17.6: خود جانچ امتحانی سوالات

سوال1: ن۔م۔راشد کی نظم ''حسن کوزہ گر'' کا تنقیدی و تجزیاتی جائزہ پیش کیجیے۔

سوال2: ''حسن کوزہ گر'' میں عشق اور فن کے باہمی تعلق کی وضاحت کیجیے۔

سوال3: نظم ''حسن کوزہ گر'' میں حسن، جہاں زاد، کوزوں، مٹی اور چاک کی علامتی معنویت پر روشنی ڈالیے۔

سوال4: ''حسن کوزہ گر'' میں وقت، تخلیق اور فن کی بقا کے تصور کو واضح کیجیے۔

سوال5: ''حسن کوزہ گر'' کو جدید اردو نظم کی ایک اہم علامتی نظم ثابت کیجیے۔

17.7: مشقی سوالات

سوال1: حسن کوزہ گر کون ہے اور اس کی شخصیت نظم میں کس چیز کی علامت ہے؟

سوال2: جہاں زاد کا حسن کی زندگی اور فن پر کیا اثر پڑتا ہے؟

سوال3: نظم میں کوزوں اور چاک کی علامتی اہمیت کیا ہے؟

سوال4: نظم ''حسن کوزہ گر'' کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

17.8: جوابات سرگرمی

1۔(ب)ن۔م۔راشد

2۔(ب)کوزہ گری

3۔(ب)جہاں زاد

4۔(ج)نو برس

5۔(ج)محبت،فن اور تخلیقی عمل

17.8 مشقی سوالات کے جوابات

سول 1: حسن کوزہ گر کون ہے اور اس کی شخصیت نظم میں کس چیز کی علامت ہے؟

جواب: حسن نظم کا مرکزی کردار اور پیشے کے اعتبار سے ایک کوزہ گر ہے۔ وہ مٹی سے مختلف برتن، جام، سبو اور گل دان تیار کرتا ہے، لیکن علامتی سطح پر حسن محض ایک کمہار نہیں بلکہ ہر تخلیق کار اور فن کار کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس طرح کوزہ گر بے شکل مٹی کو اپنے ہاتھوں سے ایک خوب صورت صورت دیتا ہے، اسی طرح فن کار اپنے احساسات، تجربات اور تخیل کو فن پارے میں ڈھالتا ہے۔ حسن کی زندگی میں عشق، تنہائی، محرومی اور تخلیقی کرب موجود ہیں اور یہی تجربات آخر کار اس کے فن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے حسن تخلیقی انسان، اس کی جدوجہد اور فن کے لازوال سفر کی علامت ہے۔

سوال 2: جہاں زاد کا حسن کی زندگی اور فن پر کیا اثر پڑتا ہے؟

جواب: جہاں زاد حسن کی محبوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے حسن، آرزو اور تخلیقی تحریک کی علامت بھی ہے۔ حسن اس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہو جاتا ہے کہ ایک عرصے تک اپنے فن اور کوزہ گری سے غافل رہتا ہے۔ اس طرح عشق ابتدا میں اس کی تخلیقی قوت کو مفلوج کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے بعد جہاں زاد ہی کی یاد اور اس کی آنکھوں کی تابنا کی حسن کے اندر تخلیقی زندگی کو دوبارہ جگاتی ہے۔ اس کے وجود کی خشک مٹی میں گویا پھر سے نمی آ جاتی ہے۔ یوں جہاں زاد ایک ایسی قوت بن جاتی ہے جو حسن کو خود شناسی بھی عطا کرتی ہے اور اسے دوبارہ اپنے فن کی طرف لوٹنے کی تحریک بھی دیتی ہے۔

سوال3: نظم میں کوزوں اور چاک کی علامتی اہمیت کیا ہے؟

جواب: نظم میں کوزے فن پاروں کی علامت ہیں۔ حسن جس طرح مٹی کو اپنے ہاتھوں سے مختلف شکلوں میں ڈھالتا ہے، اسی طرح ایک شاعر یا فن کار اپنے تجربات اور جذبات کو فن کی صورت دیتا ہے۔ کوزوں کا بننا، ٹوٹنا اور ان کے ریزوں کا صدیوں بعد بھی باقی رہنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کی زندگی محدود ہے لیکن اس کا فن زمانے سے آگے جا سکتا ہے۔ چاک مسلسل گردش کرتا ہے، اس لیے اسے وقت، زندگی اور تخلیق کے مسلسل عمل کی علامت سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان اور تہذیبیں بدلتی رہتی ہیں مگر تخلیقی عمل جاری رہتا ہے۔

سوال4: نظم ''حسن کوزہ گر'' کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

جواب: ''حسن کوزہ گر'' کا مرکزی خیال عشق، فن، تخلیق اور انسانی وجود کے باہمی رشتے کی تلاش ہے۔ نظم میں حسن ایک فن کار کی نمائندگی کرتا ہے جو محبت کے شدید تجربے سے گزرتا ہے۔ عشق اسے پہلے اپنے فن سے دور لے جاتا ہے لیکن یہی تجربہ بعد میں اس کے اندر نئی تخلیقی توانائی پیدا کرتا ہے۔ حسن کو احساس ہوتا ہے کہ فن کار اپنی محبت، محرومی، تنہائی، خواہش اور کرب کو فن پارے میں منتقل کر کے اسے دوام بخش سکتا ہے۔ نظم یہ تصور بھی پیش کرتی ہے کہ انسانی زندگی عارضی ہے مگر فن اپنے خالق کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ہزاروں برس بعد حسن کے بنائے ہوئے کوزوں کے ریزے تو مل سکتے ہیں، لیکن اس کے تخلیقی لمحوں، محبت، محنت اور داخلی کرب کو پوری طرح دوبارہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح ن۔م۔ راشد نے فن کو انسانی تجربے کی ایک ایسی صورت قرار دیا ہے جو فرد کی محدود زندگی کو وقت کی وسعت سے جوڑ دیتی ہے۔ ''حسن کوزہ گر'' اسی لیے ایک عاشق کی داستان کے ساتھ ساتھ فن کار، تخلیق اور فن کی بقا کی داستان بھی ہے۔

17.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر18 نظم ''بازآمد'' اختر الایمان

ساخت

18.0 اغراض ومقاصد
18.1 تعارف
18.2 نظم ''بازآمد'' کا متن
18.2.1 نظم ''بازآمد'' کی تشریح
18.2.2 نظم ''بازآمد'' کی فنی خصوصیات
18.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں
18.4 عمومی جائزہ
18.5 فرہنگ
18.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
18.7 مشقی سوالات
18.8 جوابات سرگرمی
18.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔
18.9 امدای کتب

18.0 :اغراض ومقاصد

عزیز متعلم !اس سبق کے مطالعے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ آپ جدید اردو نظم کے اہم شاعر اختر الایمان کی شعری شخصیت، ان کے

مخصوص طرزِ احساس اوران کی نظم ''بازآمد'' کے فکری وفنی پہلوؤں سے واقف ہوسکیں۔اس نظم کے مطالعے سے آپ کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ اختر الایمان نے ذاتی تجربات، یادِ ماضی، وقت کے گزرنے، تنہائی، محرومی اورانسانی زندگی کی بے ثباتی کو کس طرح شعری پیکر عطا کیا ہے۔آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ شاعر کے یہاں ماضی محض ایک گزرے ہوئے زمانے کا نام نہیں بلکہ انسانی شخصیت اور موجودہ زندگی کو تشکیل دینے والی ایک مؤثر قوت ہے۔اس سبق کا مقصد آپ کو نظم کے مرکزی خیال، اس کے عنوان کی معنویت اور ماضی وحال کے باہمی تعلق سے آگاہ کرنا بھی ہے۔نظم کے مطالعے کے بعد آپ اس بات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے کہ گزرے ہوئے تجربات انسان کے ذہن اور شخصیت پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور وقت کی گردش کس طرح انسان، رشتوں، مقامات اور حالات میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔آپ نظم میں پائی جانے والی داخلی کشمکش، خودکلامی، احساسِ تنہائی اور یادوں کی بازیافت کی کیفیات کا تجزیہ بھی کرسکیں گے۔

اس سبق کے ذریعے آپ اختر الایمان کے شعری اسلوب کی انفرادیت سے بھی واقف ہوں گے۔خصوصاً ان کے یہاں روزمرہ زندگی کے واقعات، سادہ اور فطری زبان، علامتی اظہار، داخلی مکالمہ اور مختلف مناظر کے امتزاج کی اہمیت آپ کے سامنے واضح ہوگی۔اس نظم کے مطالعے سے آپ جدید اردو نظم میں استعمال ہونے والی مونتاژ کی تکنیک کو بھی سمجھ سکیں گے، جس کے ذریعے شاعر مختلف یادوں، تصویروں اور زمانی کیفیتوں کو یکجا کر کے ایک مربوط شعری تاثر پیدا کرتا ہے۔یوں یہ سبق نہ صرف اختر الایمان کی نظم ''بازآمد'' کی تفہیم میں مدد دے گا بلکہ آپ کے اندر جدید نظم کے مطالعے، شعری متن کے تجزیے اور انسانی جذبات وتجربات کو ادبی زاوی؟ نظر سے سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا کرے گا۔

18.1: تعارف

اختر الایمان جدید اردو نظم کے ان نمایاں شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو نظم کو روایتی شعری اظہار سے آگے بڑھاتے ہوئے اسے جدید انسان کے داخلی تجربات، نفسیاتی کشمکش، تنہائی، یاد، وقت اور روزمرہ زندگی کی پیچیدگیوں سے ہم آہنگ کیا۔ان کی شاعری میں زندگی کا مشاہدہ نہایت گہرا اور حقیقت پسندانہ ہے۔وہ بلند آہنگ جذباتی اظہار کے بجائے انسانی زندگی کے بظاہر معمولی واقعات، یادوں، رشتوں اور تجربات کو شاعری کا موضوع بناتے ہیں اور انہی کے ذریعے بڑے انسانی اور فلسفیانہ سوالات پیدا کرتے ہیں۔

''بازآمد'' اختر الایمان کی ایک اہم نظم ہے۔لفظ ''بازآمد'' کے معنی ہیں واپس آنا، لوٹنا یا دوبارہ کسی شے کی طرف رجوع کرنا۔اس نظم میں واپسی کا مفہوم محض کسی مقام کی طرف جسمانی طور پر لوٹنے تک محدود نہیں رہتا بلکہ شاعر ذہنی اور جذباتی سطح پر اپنے ماضی کی طرف واپس جاتا ہے۔

گزرے ہوئے دن، پرانے واقعات، لوگ اور مختلف تجربات اس کے ذہن میں ایک ایک کر کے ابھرتے ہیں۔ شاعر ان یادوں کو موجودہ زندگی کے تناظر میں دیکھتا ہے اور یوں ماضی اور حال کے درمیان ایک معنی خیز مکالمہ قائم ہوتا ہے۔

انسان کی زندگی میں یادوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انسان اپنے گزرے ہوئے تجربات کو مکمل طور پر فراموش نہیں کر سکتا۔ بسا اوقات کوئی معمولی واقعہ، جگہ، آواز یا منظر اچانک ماضی کے پورے زمانے کو ذہن میں زندہ کر دیتا ہے۔ ''بازآمد'' میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔ شاعر کی یادیں اس کے حال میں داخل ہو کر اسے اس زندگی کا احساس دلاتی ہیں جو کبھی اس کا حصہ تھی مگر اب وقت کی گردش میں پیچھے رہ چکی ہے۔ اسی لیے نظم میں ایک طرف ماضی سے جذباتی وابستگی پائی جاتی ہے اور دوسری طرف وقت کی بے رحمی، تبدیلی اور محرومی کا شعور بھی موجود ہے۔

اختر الایمان کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک عمومی انسانی تجربہ بن جاتا ہے۔ ''بازآمد'' میں بھی شاعر کی یادیں بظاہر اس کی اپنی ہیں، لیکن ان میں ہر انسان اپنے ماضی کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر گزرے ہوئے زمانے، بچھڑے ہوئے لوگوں اور تبدیل شدہ حالات کو یاد کرتا ہے۔ یہی کیفیت اس نظم کو ذاتی تجربے سے بلند کر کے آفاقی انسانی تجربے کی سطح تک پہنچاتی ہے۔

نظم کی فنی ساخت بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مختلف یادیں اور مناظر یکے بعد دیگرے ذہن کے پردے پر اس انداز میں ابھرتے ہیں جیسے فلم کے مختلف مناظر کو جوڑ کر ایک مکمل تصویر بنائی جا رہی ہو۔ اس طرزِ اظہار کو مونتاژ کی تکنیک سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس تکنیک کے استعمال سے شاعر ماضی اور حال، یاد اور حقیقت، احساس اور تجربے کے مختلف ٹکڑوں کو باہم مربوط کرتا ہے۔ یہی فنی انداز نظم کو ایک منفرد داخلی فضا اور گہری تاثیری قوت عطا کرتا ہے۔ ''بازآمد'' کا مطالعہ ہمیں یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ وقت کبھی رکتا نہیں۔ حالات بدلتے ہیں، رشتوں کی نوعیت تبدیل ہوتی ہے اور زندگی نئے تجربات کی طرف بڑھتی رہتی ہے، لیکن انسان کا ذہن اپنے ماضی کے نقوش محفوظ رکھتا ہے۔ اختر الایمان نے اسی انسانی کیفیت کو نہایت سادگی، گہرائی اور فنی مہارت سے اس نظم میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بازآمد'' جدید اردو نظم میں یاد، وقت، داخلی تجربے اور انسانی تنہائی کی ایک اہم اور معنی خیز شعری تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے۔

18.2: نظم ''بازآمد'' کا متن

تتلیاں ناچتی ہیں

پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں

جیسے اک بات ہے جو
کان میں کہنی ہے خاموشی سے

اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات
دھوپ میں تیزی نہیں

ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے
دست شفقت ہے بڑی عمر کی محبوبہ کا

اور مرے شانوں کو اس طرح ہلا جاتا ہے
جیسے میں نیند میں ہوں

عورتیں چرخے لیے بیٹھی ہیں
کچھ کپاس اوٹتی ہیں

کچھ سلائی کے کسی کام میں مصروف ہیں یوں
جیسے یہ کام ہے دراصل ہر اک شے کی اساس

ایک سے ایک چہل کرتی ہے
کوئی کہتی ہے مری چوڑیاں کھنکیں تو کھنکھاری مری ساس

کوئی کہتی ہے بھری چاندنی آتی نہیں راس
رات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر

بات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر

لذت وصل ہے آزار، کوئی کہتی ہے

میں تو بن جاتی ہوں بیمار، کوئی کہتی ہے
میں بھی گھس آتا ہوں اس شیش محل میں دیکھو

سب ہنسی روک کے کہتی ہیں نکالو اس کو

اک پرندہ کسی اک پیڑ کی ٹہنی پہ چہکتا ہے کہیں
ایک گاتا ہوا یوں جاتا ہے دھرتی سے فلک کی جانب

پوری قوت سے کوئی گیند اچھالے جیسے
اک پھدکتا ہے سر شاخ پہ جس طرح کوئی

آمد فصل بہاری کی خوشی میں ناچے
گوندنی بوجھ سے اپنے ہی جھکی پڑتی ہے

نازنیں جیسے ہے کوئی یہ بھری محفل میں
اور کل ہاتھ ہوئے ہیں پیلے

کوئلیں کوکتی ہیں
جامنیں پکی ہیں، آموں پہ بہار آئی ہے
ارغنوں بجتا ہے یکجائی کا
نیم کے پیڑوں میں جھولے ہیں جدھر دیکھو ادھر

ساونی گاتی ہیں سب لڑکیاں آواز ملا کر ہر سو

اوراس آواز سے گونج اٹھی ہے بستی ساری

میں کبھی ایک کبھی دوسرے جھولے کے قریں جاتا ہوں

ایک ہی کم ہے، وہی چہرہ نہیں

آخرش پوچھ ہی لیتا ہوں کسی سے بڑھ کر

کیوں حبیبہ نہیں آئی اب تک؟

کھلکھلا پڑتی ہیں سب لڑکیاں سن کر یہ نام

لو یہ سپنے میں ہیں، اک کہتی ہے

باؤلی سپنا نہیں، شہر سے آئے ہیں ابھی

دوسری ٹوکتی ہے

بات سے بات نکل چلتی ہے

ٹھاٹ کی آئی تھی بارات، چنبیلی نے کہا

بینڈ باجا بھی تھا، دیپا بولی

اور دلہن پہ ہوا کتنا بکھیر

کچھ نہ کچھ کہتی رہیں سب ہی مگر میں نے صرف

اتنا پوچھا وہ ندی بہتی ہے اب بھی، کہ نہیں

جس سے وابستہ ہیں ہم اور یہ بستی ساری؟

کیوں نہیں بہتی، چنبیلی نے کہا

اور وہ برگد کا گھنا پیڑ کنارے اس کے؟

وہ بھی قائم ہے ابھی تک یونہی

وعدہ کر کے جو حبیبہ نہیں آتی تھی کبھی

آنکھیں دھوتا تھا ندی میں جا کر

اور برگد کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

ماہ و سال آتے، چلے جاتے ہیں

فصل پک جاتی ہے، کٹ جاتی ہے

کوئی روتا نہیں اس موقع پر

حلقہ در حلقہ نہ آہن کو تپا کر ڈھالیں

کوئی زنجیر نہ ہو!

زیست در زیست کا یہ سلسلہ باقی نہ رہے!

بھیڑ ہے بچوں کی چھوٹی سی گلی میں دیکھو

ایک نے گیند جو پھینکی تو لگی آ کے مجھے

میں نے جا پکڑا اسے، دیکھی ہوئی صورت تھی

کس کا ہے میں نے کسی سے پوچھا؟

یہ حبیبہ کا ہے، رمضانی قصائی بولا

بھولی صورت پہ ہنسی آ گئی اس کی مجھ کو

وہ بھی ہنسنے لگا، ہم دونوں یونہی ہنستے رہے!

دیر تک ہنستے رہے!

تتلیاں ناچتی ہیں

پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں

جیسے اک بات ہے جو

کان میں کہنی ہے خاموشی سے

اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات!

18.2.1: نظم ''بازآمد'' کی تشریح

اختر الایمان کی یہ نظم یاد، ماضی، وطن، بچپن، محبت اور زندگی کے مسلسل بہاؤ کی ایک نہایت دل آویز نظم ہے۔ شاعر ایک طویل عرصے کے بعد اپنے پرانے ماحول اور بستی میں واپس آتا ہے۔ اس واپسی کے دوران اسے اپنا بچپن، نوجوانی، دوست، محبوبہ اور بستی کی پرانی زندگی یاد آتی ہے۔ نظم میں ماضی اور حال، حقیقت اور خواب اور ذاتی یاد اور اجتماعی زندگی ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔

تتلیاں ناچتی ہیں

پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں

جیسے اک بات ہے جو

کان میں کہنی ہے خاموشی سے

اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات

نظم کا آغاز ایک انتہائی خوش گوار اور دل کش قدرتی منظر سے ہوتا ہے۔ تتلیاں ایک پھول سے دوسرے پھول پر منڈلا رہی ہیں۔ شاعر کے تخیل میں ان کی یہ حرکت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے وہ ایک دوسرے کے کان میں کوئی راز یا دلچسپ بات کہہ رہی ہوں۔ پھولوں کا کھلنا شاعر کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس راز کو سن کر مسکرا رہے ہوں۔ یہ منظر صرف فطرت نگاری نہیں بلکہ شاعر کے ماضی کی دنیا میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے۔ فطرت یہاں زندہ اور متحرک ہے اور شاعر کے ذہن میں بچپن کی بھولی بسری یادوں کو جگا رہی ہے۔

دھوپ اور ہوا کا نرم لمس

دھوپ میں تیزی نہیں

ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے

دست شفقت ہے بڑی عمر کی محبوبہ کا

اور مرے شانوں کو اس طرح ہلا جاتا ہے

جیسے میں نیند میں ہوں

یہاں شاعر فضا کی نرمی اور سکون کو بیان کرتا ہے۔ دھوپ میں شدت نہیں اور ہوا کے جھونکے بھی نہایت نرم اور محبت بھرے ہیں۔ شاعر ہوا کے لمس کو ایک عمر رسیدہ محبوبہ کے شفقت بھرے ہاتھ سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ تشبیہ بہت معنی خیز ہے۔ شاعر اپنے ماضی کو صرف یاد نہیں کر رہا بلکہ اسے ایک ایسی محبت محسوس کر رہا ہے جو وقت گزرنے کے باوجود اس کے دل میں موجود ہے۔ ہوا اسے یوں ہلاتی ہے جیسے وہ خواب کی حالت میں ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کے لیے یہ واپسی حقیقت اور خواب کے درمیان ایک کیفیت بن گئی ہے۔

عورتوں کی گھریلو دنیا

عورتیں چرخے لیے بیٹھی ہیں

کچھ کپاس اوٹتی ہیں

کچھ سلائی کے کسی کام میں مصروف ہیں یوں

جیسے یہ کام ہے دراصل ہر اک شے کی اساس

شاعر بستی کی عورتوں کو اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف دیکھتا ہے۔ کوئی کپاس تیار کر رہی ہے اور کوئی سلائی کر رہی ہے۔ شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہ معمولی دکھائی دینے والے کام دراصل پوری زندگی کی بنیاد ہیں۔ یہاں شاعر نے عام دیہی اور گھریلو زندگی کی عظمت کو نمایاں کیا ہے۔ زندگی بڑی بڑی باتوں سے نہیں بلکہ انہی چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے کاموں سے قائم رہتی ہے۔

عورتوں کی باتیں اور زندگی کی بے ساختگی

کوئی کہتی ہے مری چوڑیاں کھنکیں تو کھنکھاری مری ساس

کوئی کہتی ہے بھری چاندنی آتی نہیں راس

رات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر

یہاں عورتوں کی گفتگو میں زندگی کی سادگی اور بے ساختگی نمایاں ہے۔کوئی ساس اور چوڑیوں کی بات کرتی ہے،کوئی چاندنی راتوں کے بارے میں اپنی کیفیت بیان کرتی ہے اور کوئی ہنستے ہوئے رات کے قصے سناتی ہے۔یہ گفتگو بستی کی زندہ،رنگین اور بے تکلف زندگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔شاعر نے معمولی گھریلو باتوں کو بھی بڑی خوب صورتی سے شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

شاعر کی آمد اور عورتوں کا ردعمل

میں بھی گھس آتا ہوں اس شیش محل میں دیکھو

سب ہنسی روک کے کہتی ہیں نکالو اس کو

شاعر خود کو اس عورتوں کی دنیا میں داخل کرتا ہے۔عورتیں اس کی آمد پر مذاقاً اسے نکالنے کی بات کرتی ہیں۔اس منظر میں شرارت، بے تکلفی اور پرانی شناسائی کا احساس ہے۔یہاں شاعر اپنے ماضی کی بستی میں ایک اجنبی نہیں بلکہ ایک پرانے شناسا فرد کے طور پر موجود ہے۔گویا برسوں گزرنے کے باوجود اس ماحول کی کچھ اپنائیت باقی ہے۔

پرندے اور بہار کی زندگی

اک پرندہ کسی اک پیڑ کی ٹہنی پہ چہکتا ہے کہیں

ایک گاتا ہوا یوں جاتا ہے دھرتی سے فلک کی جانب

پوری قوت سے کوئی گیند اچھالے جیسے

شاعر پرندوں کی آواز اور پرواز کو دیکھتا ہے۔ایک پرندہ ٹہنی پر چہک رہا ہے اور دوسرا پوری قوت سے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہے۔شاعر اس کی پرواز کو ایسے محسوس کرتا ہے جیسے کسی نے پوری طاقت سے گیند آسمان کی طرف اچھال دی ہو۔یہ منظر زندگی کی توانائی، حرکت اور آزادی کی علامت ہے۔

گوندنی اور بہار

گوندنی بوجھ سے اپنے ہی جھکی پڑتی ہے

نازنیں جیسے ہے کوئی یہ بھری محفل میں

اور کل ہاتھ ہوئے ہیں پیلے

گوندنی کا پودا اپنے پھل یا پھول کے بوجھ سے جھکا ہوا ہے۔شاعر اسے ایک نازنین عورت سے تشبیہ دیتا ہے جس کے ہاتھ ابھی مہندی سے پیلے ہوئے ہوں۔ یہاں فطرت اور انسانی زندگی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔اختر الایمان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہی ہے کہ وہ فطرت کے مناظر میں انسانی جذبات اور انسانی زندگی کے استعارے تلاش کرتے ہیں۔

ساون، جھولے اور اجتماعی خوشی

نیم کے پیڑوں میں جھولے ہیں جدھر دیکھو ادھر

ساونی گاتی ہیں سب لڑکیاں آواز ملا کر ہر سو

اور اس آواز سے گونج اٹھی ہے بستی ساری

یہ منظر برصغیر کی دیہی تہذیب اور ساون کے موسم کی ایک حسین تصویر ہے۔نیم کے درختوں پر جھولے پڑے ہوئے ہیں اور لڑکیاں مل کر ساون کے گیت گا رہی ہیں۔ یہ پورا منظر خوشی، جوانی، فطرت اور اجتماعی زندگی کی علامت ہے۔شاعر اس خوشی میں شامل تو ہے، مگر اس کے دل میں ایک کمی موجود ہے۔

حبیبہ کی عدم موجودگی

میں کبھی ایک کبھی دوسرے جھولے کے قریں جاتا ہوں

ایک ہی کم ہے، وہی چہرہ نہیں

یہاں نظم کا جذباتی مرکز سامنے آتا ہے۔شاعر سب کچھ دیکھ رہا ہے: پرانی بستی، جھولے، لڑکیاں اور ساون کی خوشی؛ لیکن ایک چہرہ موجود نہیں، اور وہ ہے حبیبہ کا چہرہ۔ یہ ایک چہرہ شاعر کے ماضی، محبت اور نوجوانی کی علامت بن جاتا ہے۔بستی کی تمام رونقوں کے باوجود شاعر کے لیے ماضی مکمل نہیں کیونکہ حبیبہ موجود نہیں۔

حبیبہ کے بارے میں سوال

آخرش پوچھ ہی لیتا ہوں کسی سے بڑھ کر

کیوں حبیبہ نہیں آئی اب تک؟

شاعر آخرکار اپنے دل کی بات زبان پر لے آتا ہے۔لڑکیاں اس سوال پر ہنس پڑتی ہیں۔کوئی شاعر کو خواب میں سمجھتی ہے اور کوئی کہتی

ہے کہ وہ ابھی شہر سے آئے ہیں، اس لیے پرانے حالات سے بے خبر ہیں۔ یہاں شاعر اور بستی کے لوگوں کے درمیان وقت کے فرق کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ شاعر ذہنی طور پر ماضی میں زندہ ہے، جبکہ بستی کی زندگی آگے بڑھ چکی ہے۔

شادی اور بدلتی ہوئی زندگی

ٹھاٹ کی آئی تھی بارات، چنبیلی نے کہا

بینڈ باجا بھی تھا، دیپا بولی

اور دلہن پہ ہوا کتنا بکھیر

لڑکیاں حبیبہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کی شادی کا ذکر کرتی ہیں۔ حبیبہ اب شاعر کے ماضی کی محبوبہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی بسر کرنے والی عورت ہے۔ شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ وقت گزر چکا ہے اور زندگی آگے بڑھ گئی ہے۔ ماضی کو اسی شکل میں واپس نہیں لایا جا سکتا۔

ندی اور برگد: ماضی کی تلاش

اتنا پوچھا وہ ندی بہتی ہے اب بھی، کہ نہیں

جس سے وابستہ ہیں ہم اور یہ بستی ساری؟

حبیبہ کے بارے میں سننے کے بعد شاعر اچانک ندی کے بارے میں پوچھتا ہے۔ یہ ندی صرف ایک جغرافیائی مقام نہیں بلکہ شاعر کے بچپن، جوانی اور پوری بستی کی زندگی کی علامت ہے۔

ندی کا مسلسل بہنا وقت اور زندگی کے تسلسل کی علامت ہے۔

اور وہ برگد کا گھنا پیڑ کنارے اس کے؟

وہ بھی قائم ہے ابھی تک یونہی

ندی کے کنارے موجود برگد کا درخت بھی شاعر کے ماضی کی یاد سے وابستہ ہے۔ ندی اور برگد دونوں شاعر کے لیے وقت کے گزرنے کے باوجود باقی رہ جانے والی چیزوں کی علامت ہیں۔

حبیبہ کا انتظار

وعدہ کر کے جو حبیبہ نہیں آتی تھی کبھی

آنکھیں دھوتا تھا ندی میں جا کر

اور برگد کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

یہ شاعر کے نوجوانی کے زمانے کی ایک نہایت دردانگیز یاد ہے۔ حبیبہ وعدہ کرنے کے باوجود کبھی نہیں آتی تھی۔ شاعر اس کے انتظار میں ندی کے کنارے جاتا، آنکھیں دھوتا اور برگد کی چھاؤں میں سو جاتا تھا۔ یہاں محبت کا جذبہ کسی ڈرامائی اظہار کے بجائے انتہائی سادہ اور خاموش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی سادگی اس منظر کو زیادہ مؤثر بناتی ہے۔

وقت کا فلسفہ

ماہ و سال آتے، چلے جاتے ہیں

فصل پک جاتی ہے، کٹ جاتی ہے

کوئی روتا نہیں اس موقع پر

یہ نظم کا ایک اہم فلسفیانہ حصہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مہینے اور سال گزرتے رہتے ہیں۔ فصل پکتی ہے اور پھر کاٹ لی جاتی ہے، لیکن کوئی اس پر ماتم نہیں کرتا۔ انسانی زندگی بھی اسی طرح تبدیلی اور فنا کے عمل سے گزرتی ہے۔ بچپن جوانی میں، جوانی بڑھاپے میں اور زندگی موت میں تبدیل ہوتی ہے۔ لیکن زندگی کا سلسلہ پھر بھی جاری رہتا ہے۔

زنجیر سے آزادی کی خواہش

حلقہ در حلقہ نہ آہن کو تپا کر ڈھالیں

کوئی زنجیر نہ ہو!

زیست در زیست کا یہ سلسلہ باقی نہ رہے!

یہ اشعار نظم میں ایک گہرا فکری موڑ پیدا کرتے ہیں۔ شاعر زندگی کے اس مسلسل سلسلے اور اس کی پابندیوں پر غور کرتا ہے۔ نسل در نسل زندگی کے ساتھ دکھ، جدائی، انتظار اور محرومیاں بھی منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ شاعر کی خواہش ہے کہ انسان کسی ایسی زنجیر میں گرفتار نہ رہے جو اسے مسلسل اسی دکھ بھرے چکر میں باندھے رکھے۔

حبیبہ کا بیٹا

بھیڑ ہے بچوں کی چھوٹی سی گلی میں دیکھو

ایک نے گیند جو پھینکی تو لگی آ کے مجھے

میں نے جا پکڑا اسے، دیکھی ہوئی صورت تھی

نظم کے اختتام کی طرف شاعر بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ایک بچے کی گیند شاعر کو لگتی ہے۔ شاعر اسے پکڑتا ہے اور اس کے چہرے میں کوئی جانی پہچانی صورت دیکھتا ہے۔ یہ منظر شاعر کے ماضی اور حال کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔

کس کا ہے میں نے کسی سے پوچھا؟

یہ حبیبہ کا ہے، رمضانی قصائی بولا

جب شاعر کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچہ حبیبہ کا ہے تو اسے اس بچے کے چہرے میں شاید حبیبہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

بھولی صورت پہ ہنسی آ گئی اس کی مجھ کو

وہ بھی ہنسنے لگا، ہم دونوں یونہی ہنستے رہے!

دیر تک ہنستے رہے!

یہ نظم کا نہایت معنی خیز اور جذباتی اختتام ہے۔ شاعر ماضی کو واپس نہیں پا سکتا، حبیبہ اس کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی، لیکن زندگی ختم بھی نہیں ہوئی۔ حبیبہ کی زندگی آگے بڑھ چکی ہے اور اب اس کا ایک بچہ ہے۔ شاعر اور بچہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ یہ ہنسی دراصل وقت کی شکست پر زندگی کی فتح ہے۔ شاعر اپنے ماضی کے غم کو قبول کر لیتا ہے۔ محرومی کے باوجود زندگی کی خوب صورتی باقی رہتی ہے۔

نظم کے آغاز کی طرف واپسی

تتلیاں ناچتی ہیں

پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں

جیسے اک بات ہے جو

کان میں کہنی ہے خاموشی سے

اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات!

نظم دوبارہ اسی منظر پر ختم ہوتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی۔اس تکرار سے نظم کو ایک دائرہ نما ساخت حاصل ہوتی ہے۔

شروع میں بھی زندگی جاری تھی، تتلیاں ناچ رہی تھیں اور پھول مسکرا رہے تھے۔شاعر نے پورے ماضی کے سفر، محبت، جدائی اور وقت کے فلسفے سے گزرنے کے بعد بھی یہی دیکھا کہ زندگی اپنی پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔

18.2.2:نظم ''بازآمد'' کی فنی خصوصیات

اس نظم کا بنیادی موضوع ماضی کی یاد، گزرتا ہوا وقت، محبت کی محرومی اور زندگی کا مسلسل بہاؤ ہے۔شاعر برسوں بعد اپنے پرانے ماحول میں واپس آتا ہے۔اسے محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی چیزیں بدل گئی ہیں، حبیبہ اب اس کی زندگی کا حصہ نہیں، لیکن ندی بہہ رہی ہے، برگد قائم ہے، بچے کھیل رہے ہیں، لڑکیاں گا رہی ہیں، پھول کھل رہے ہیں اور تتلیاں ناچ رہی ہیں۔نظم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسان بدل جاتے ہیں، رشتے بدل جاتے ہیں، محبتیں ادھوری رہ جاتی ہیں، لیکن زندگی کبھی نہیں رکتی۔یہ نظم پابند شاعری کی روایتی ہیئت سے آزاد ہے لیکن اس میں داخلی موسیقیت اور روانی موجود ہے۔اس نظم میں بہترین منظر نگاری ہے۔ساون، جھولے، نیم، ندی، برگد، پرندے، تتلیاں اور پھول انتہائی جاندار تصویریں پیدا کرتے ہیں۔تشبیہات واستعارات کے عمدہ نمونے بھی اس نظم میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثال کے طور پہ یہ مصرعہ دیکھیں۔

ہوا کا جھونکا جیسے بڑی عمر کی محبوبہ کا دستِ شفقت ہو۔

یہ ایک نہایت منفرد اور مؤثر تشبیہ ہے۔

علامت نگاری

ندی: وقت اور زندگی کا تسلسل ہے

برگد: ماضی اور یادوں کا استحکام ہے

تتلیاں اور پھول: زندگی کی تازگی اور خوشی کو ظاہر کرتی ہیں۔

حبیبہ کا بچہ: نسلوں اور زندگی کے مسلسل سفر کی علامت ہے۔

"بازآمد۔" اختر الایمان کی ایک نہایت اہم نظم ہے جس میں ایک شخص اپنی بستی اور ماضی کی دنیا میں واپس آ کر اپنی محبت، بچپن اور گزرے ہوئے زمانے کو تلاش کرتا ہے۔اسے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور رشتے وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں مگر زندگی کا سلسلہ نہیں رکتا۔نظم

کے آخر میں تتلیوں اور پھولوں کا دوبارہ منظر اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ غم، جدائی اور وقت کے گزرنے کے باوجود زندگی ہمیشہ مسکراتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔ نظم میں شاعر کا ماضی مسلسل حال کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ نظم میں عورتوں اور لڑکیوں کے مکالمے اسے ایک زندہ اور ڈرامائی کیفیت عطا کرتے ہیں۔ نظم کا اختتام اسی منظر پر ہوتا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ اس سے زندگی کے دائمی اور مسلسل بہاؤ کا تصور مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔

18.3: سرگرمی! آؤ اپنی معلومات کو جانچیں۔

سوال1: اختر الایمان کا شمار اردو کے کس عہد کے اہم شعرا میں ہوتا ہے؟

(الف) کلاسیکی عہد (ب) جدید عہد

(ج) دکنی عہد (د) قدیم مثنوی کے عہد

سوال2: نظم ''بازآمد'' کا بنیادی تعلق کس کیفیت سے ہے؟

(الف) ماضی کی یاد اور بازیافت (ب) جنگ و جدل

(ج) قومی سیاست (د) مذہبی مناظرے

سوال3: ''بازآمد'' کے لغوی معنی کیا ہیں؟

(الف) روانگی (ب) واپسی یا دوبارہ آنا

(ج) جدائی (د) خاموشی

سوال4: اختر الایمان کی نظموں میں عام طور پر کس اسلوب کی نمایاں جھلک ملتی ہے؟

(الف) داستانوی اسلوب (ب) شخصی تجربے اور داخلی کیفیات

(ج) قصیدہ گوئی (د) رزمیہ انداز

سوال5: نظم ''بازآمد'' میں ماضی اور حال کے امتزاج سے کون سی کیفیت پیدا ہوتی ہے؟

(الف) طنز و مزاح (ب) یاد، اداسی اور خود احتسابی

(ج) جوشِ فتح (د) مدح و ستائش

18.4:عمومی جائزہ

اختر الایمان کی نظم ''بازآمد'' جدید اردو نظم کی ایک اہم تخلیق ہے جس میں شاعر اپنے ماضی، یادوں، تجربات اور موجودہ زندگی کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم کرتا ہے۔ ''بازآمد'' کے معنی دوبارہ لوٹنے یا واپس آنے کے ہیں۔ اس نظم میں یہ واپسی محض کسی مقام کی طرف جسمانی واپسی نہیں بلکہ ماضی کی دنیا، پرانی یادوں اور گزرے ہوئے زمانے کی طرف ذہنی اور جذباتی بازگشت ہے۔ شاعر جب ماضی کی طرف دیکھتا ہے تو اسے زندگی کے وہ مناظر، لوگ اور واقعات یاد آتے ہیں جو کبھی اس کی ذات کا حصہ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ وہ دنیا جو کبھی زندہ اور متحرک تھی اب یاد بن گئی ہے۔ اس احساس سے نظم میں اداسی، تنہائی اور محرومی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شاعر ماضی کو حال کے تناظر میں دیکھتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ انسانی زندگی مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزرتی رہتی ہے اور گزرے ہوئے لمحوں کو اسی صورت میں واپس نہیں لایا جا سکتا۔

اس نظم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ شاعر مختلف یادوں اور مناظر کو یکے بعد دیگرے اس طرح پیش کرتا ہے جیسے ذہن کے پردے پر تصاویر ابھر رہی ہوں۔ اس انداز میں فلمی مونتاژ سے مشابہت محسوس ہوتی ہے۔ مختلف زمانوں، مقامات اور کیفیات کے مناظر مل کر شاعر کی داخلی زندگی کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ اختر الایمان کی شاعری میں ذاتی تجربہ وسیع انسانی تجربے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ''بازآمد'' میں بھی شاعر کی انفرادی یادیں صرف اس کی اپنی نہیں رہتیں بلکہ ہر اس انسان کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں جو کبھی اپنے ماضی کو یاد کر کے وقت کے گزرنے، رشتوں کے بدلنے اور زندگی کی ناپائیداری کا احساس کرتا ہے۔ اس نظم میں ماضی کی یاد کے ساتھ ساتھ حال کا شعور بھی پوری شدت سے موجود ہے۔ شاعر ماضی میں گم نہیں ہو جاتا بلکہ ماضی اور حال کا تقابل کرتے ہوئے اپنی زندگی اور اپنے وجود کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ''بازآمد'' یاد، وقت، تنہائی، خود شناسی اور انسانی زندگی کی بے ثباتی کی ایک بامعنی اور اثر انگیز نظم ہے۔

18.5 فرہنگ

بازآمد — واپسی، دوبارہ آنا

مونتاژ — مختلف مناظر یا تصویروں کو جوڑ کر ایک مکمل تاثر پیدا کرنے کی تکنیک

بازگشت — پلٹ کر آنے والی آواز یا یاد

نقوش — نشان، یادگار اثرات

ماضی — گزرا ہوا زمانہ

حال — موجودہ زمانہ

یادداشت — یاد رکھنے کی قوت، حافظہ

کیفیت — حالت، احساس

محرومی — کسی چیز سے محروم ہونے کی حالت

تنہائی — اکیلا پن

اضطراب — بے چینی

احساس — شعور، محسوس کرنے کی کیفیت

تخیل — تصور کرنے کی قوت

بازیافت — دوبارہ حاصل کرنا، از سرِ نو دریافت

داخلیت — باطنی یا اندرونی کیفیت

ناسٹلجیا — ماضی کی یاد سے پیدا ہونے والی جذباتی کیفیت

بے ثباتی — ناپائیداری، قائم نہ رہنے کی حالت

خود احتسابی — اپنے اعمال اور زندگی کا جائزہ لینا

تسلسل — لگاتار جاری رہنے کی حالت

تاثر — اثر، ذہنی یا جذباتی کیفیت

18.6: خود جانچ امتحانی سوالات

سوال 1: اختر الایمان کی نظم ''بازآمد'' کے مرکزی خیال پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

سوال 2: نظم ''بازآمد'' میں ماضی اور حال کے باہمی تعلق کی وضاحت کیجیے۔

سوال3: ''بازآمد'' میں اختر الایمان کے شخصی اور داخلی تجربات کا جائزہ لیجیے۔

سوال4: نظم ''بازآمد'' کے فنی محاسن اور اسلوبِ بیان پر تفصیلی بحث کیجیے۔

سوال5: ''بازآمد'' میں مونتاژ کی تکنیک کس طرح نظم کے مجموعی تاثر کو مؤثر بناتی ہے؟ وضاحت کیجیے۔

18.7: مشقی سوالات

سوال1: ''بازآمد'' کے عنوان کی معنویت بیان کیجیے۔

سوال2: نظم میں یادِ ماضی کی کیفیت کس طرح نمایاں ہوتی ہے؟

سوال3: اختر الایمان کے نزدیک وقت اور انسانی زندگی کا باہمی تعلق کیا ہے؟

سوال4: نظم ''بازآمد'' میں تنہائی اور محرومی کے احساس کی وضاحت کیجیے۔

سوال5: نظم ''بازآمد'' کی زبان اور اسلوب کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

18.8: جوابات سرگرمی۔

1۔ (ب) جدید عہد

2۔ (الف) ماضی کی یاد اور بازیافت

3۔ (ب) واپسی یا دوبارہ آنا

4۔ (ب) شخصی تجربے اور داخلی کیفیات

5۔ (ب) یاد، اداسی اور خود احتسابی

18.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

سوال1: ''بازآمد'' کے عنوان کی معنویت بیان کیجیے۔

''بازآمد'' کے معنی دوبارہ آنے یا واپس لوٹنے کے ہیں۔ نظم کے تناظر میں اس سے مراد شاعر کا اپنے ماضی، یادوں، گزرے ہوئے

واقعات اور زندگی کے سابقہ تجربات کی طرف ذہنی اور جذباتی طور پر لوٹتا ہے۔ شاعر ماضی کے مختلف مناظر کو یاد کرتا ہے اور انہیں حال کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ اس لیے نظم کا عنوان اس کے مرکزی خیال کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔

سوال 2: نظم میں یادِ ماضی کی کیفیت کس طرح نمایاں ہوتی ہے؟

نظم ''بازآمد'' میں یادِ ماضی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ شاعر کے ذہن میں گزرے ہوئے زمانے کے لوگ، مقامات اور واقعات بار بار ابھرتے ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ وابستہ خوشی، اداسی، محرومی اور تنہائی کے احساسات نظم کو گہری جذباتی تاثیر عطا کرتے ہیں۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ ماضی واپس نہیں آ سکتا، لیکن اس کی یادیں انسان کے ذہن میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

سوال 3: اختر الایمان کے نزدیک وقت اور انسانی زندگی کا باہمی تعلق کیا ہے؟

اختر الایمان کے یہاں وقت ایک مسلسل حرکت کرنے والی قوت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وقت کے گزرنے سے انسان، رشتے، حالات اور ماحول سب بدل جاتے ہیں۔ انسان ماضی کو اپنی یادوں کے ذریعے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن وہ گزرے ہوئے وقت کو حقیقی صورت میں واپس نہیں لا سکتا۔ نظم اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ انسانی زندگی وقت کے مسلسل بہاؤ کے تابع ہے۔

سوال 4: نظم ''بازآمد'' میں تنہائی اور محرومی کے احساس کی وضاحت کیجیے۔

نظم میں شاعر جب ماضی کے خوش گوار یا معنی خیز لمحات کو یاد کرتا ہے تو اسے موجودہ زندگی میں ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ پرانے رشتوں، گزرے ہوئے زمانے اور تبدیل شدہ حالات کا شعور تنہائی اور محرومی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ تنہائی صرف جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی بھی ہے۔ اسی وجہ سے نظم میں ایک گہرا درد اور اداسی محسوس ہوتی ہے۔

سوال 5: نظم ''بازآمد'' کی زبان اور اسلوب کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

''بازآمد'' کی زبان سادہ، فطری، علامتی اور تاثراتی ہے۔ اختر الایمان نے روزمرہ زندگی کے تجربات اور مناظر کو شعری زبان میں بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ نظم میں داخلی خود کلامی، یادوں کی بازیافت، ماضی اور حال کا امتزاج اور مناظر کی مسلسل تبدیلی اہم اسلوبی خصوصیات ہیں۔ مختلف تصویروں اور یادوں کو یکجا کرنے کی وجہ سے نظم میں مونتاژ جیسی فنی تکنیک بھی نمایاں ہوتی ہے، جو نظم کے مجموعی تاثر کو زیادہ گہرا اور مؤثر بناتی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسی سبق ''اختر الایمان کی نظم بازآمد'' کے اغراض و مقاصد اور قدرے طویل تعارف بھی اسی تدریسی انداز میں لکھ سکتا ہوں۔

18.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	—	خلیل الرحمٰن اعظمی
2۔ ترقی پسند ادب	—	علی سردار جعفری
3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ	—	مظفر حنفی
4۔ جدید اردو ادب	—	آل احمد سرور
5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم	—	پروفیسر حنیف نقوی
6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب	—	ابواللیث صدیقی
7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت	—	مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد
8۔ آزادی کے بعد اردو نظم	—	مرتب: مظہر امام
9۔ منتخب نظمیں	—	ڈاکٹر ابنِ کنول
10۔ منتخب نظمیں	—	اتر پردیش اردو اکادمی

سبق نمبر 19 نظم ''عہد حاضر کی دل ربا مخلوق''، شہر یار

ساخت

19.0 اغراض ومقاصد

19.1 تعارف

19.2 نظم ''عہد حاضر کی دل ربا مخلوق '' کا متن

19.2.1 نظم ''عہد حاضر کی دل ربا مخلوق'' کی تشریح

19.2.2 نظم ''عہد حاضر کی دل ربا مخلوق'' کی خصوصیات

19.3 سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

19.4 عمومی جائزہ

19.5 فرہنگ

19.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

19.7 مشقی سوالات

19.8 جوابات سرگرمی

19.8.1 مشقی سوالات کے جوابات۔

19.9 امدای کتب

اغراض ومقاصد

اس نظم کے متن کی تدریس اور تنقیدی مطالعے کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ آپ اردو زبان وادب کے نامور جدید شاعر شہریار کی نظم ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' کے موضوع، اسلوب، فکری جہات اور علامتی پہلوؤں سے واقف ہوسکیں۔ اس نظم کے ذریعے آپ جدید شہری زندگی کے مختلف مناظر، مادی ترقی، معاشرتی ناہمواری، انسانی تنہائی، بے حسی، محرومی اور صارفیت کے اثرات کو سمجھ سکیں گے۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ شاعر نے سڑک، عمارت، ہوٹل، سینما، گاڑی، فقیر، بازار اور روزمرہ استعمال کی اشیا کو محض ظاہری اشیا کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ انہیں جدید تہذیب کی مختلف کیفیات اور انسانی زندگی کے تضادات کی علامت بنایا ہے۔ اس سبق کے مطالعے سے آپ میں نظم کے متن کو تنقیدی اور تجزیاتی انداز میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ آپ نظم میں استعمال ہونے والی علامات، استعارات، پیکروں اور تصویری زبان کو سمجھ سکیں گے اور یہ جان سکیں گے کہ جدید شاعر کس طرح عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے مناظر کے ذریعے بڑے سماجی اور انسانی مسائل کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ عہدِ حاضر کی مادّی ترقی اور انسانی جذبات کے درمیان پیدا ہونے والے فاصلے کو بھی محسوس کرسکیں گے۔

اس نظم کی تدریس کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ آپ شہریار کے شعری اسلوب، ان کی سادہ مگر معنی خیز زبان اور جدید حسیت سے واقف ہوں۔ آپ نظم کے مرکزی خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے، اس کے عنوان کی معنویت واضح کرنے اور جدید شہری زندگی کے بارے میں شاعر کے مشاہدات کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔ اس طرح یہ سبق نہ صرف آپ کے ادبی ذوق میں اضافہ کرے گا بلکہ موجودہ معاشرتی زندگی کو گہرائی سے سمجھنے میں بھی مددگار ثابت ہوگا۔

19.1: تعارف

شہریار جدید اردو شاعری کے ان نمایاں شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کے داخلی کرب، تنہائی، خواب، محرومی، معاشرتی تبدیلیوں اور جدید تہذیب کے مسائل کو نہایت سادہ، دل نشیں اور علامتی پیرایے میں اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں جدید انسان کی ذہنی کیفیت، شہری زندگی کی بے ہنگم مصروفیات، بدلتے ہوئے انسانی رشتے اور مادّی زندگی کے دباؤ بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ان کا شعری اسلوب غیر ضروری لفظی آرائش سے پاک، مگر معنی اور احساس کی گہرائی سے بھرپور ہے۔

نظم ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' میں شہریار نے جدید شہری زندگی کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جس میں ظاہری چمک دمک کے ساتھ

ساتھ اندرونی اداسی، بے حسی اور محرومی بھی نمایاں ہے۔ شہر میں بلند عمارتیں، روشن بازار، سینما گھر، ہوٹل، نئی گاڑیاں اور مختلف اشیائے ضرورت موجود ہیں، لیکن ان سب کے درمیان انسان کی داخلی زندگی سکون اور اطمینان سے محروم دکھائی دیتی ہے۔ شاعر نے جدید تہذیب کی اسی دوہری کیفیت کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کا آغاز ایک لمبی، کالی اور بے جان سڑک کے منظر سے ہوتا ہے۔ یہ سڑک محض ایک راستہ نہیں بلکہ جدید شہری زندگی کی بے حسی اور تنہائی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس کے اطراف موجود روشنیاں، عمارتیں، پوسٹر، کاریں اور لوگوں کی سرگرمیاں بظاہر زندگی اور ترقی کا احساس پیدا کرتی ہیں، لیکن شاعر ان مناظر کے پس منظر میں موجود انسانی محرومی اور طبقاتی فرق کو بھی سامنے لاتا ہے۔ چمچماتی گاڑیوں کے قریب فقیروں کی موجودگی جدید معاشرے کے معاشی تضاد کی ایک مؤثر تصویر بن جاتی ہے۔

نظم کے آخری حصے میں ایک ایسی عورت کا تصور سامنے آتا ہے جو روزمرہ زندگی کی مختلف چیزوں کا حساب کر رہی ہے۔ شاعر مادی اشیا کے ساتھ آرزو، غم، امید اور محرومی جیسے انسانی جذبات کو بھی ایک ہی سلسلے میں رکھتا ہے۔ اس طرح یہ کردار عہدِ حاضر کے انسان کی نمائندہ صورت بن جاتا ہے، جو بازار، ضرورت، خواہش، مصروفیت اور حساب کتاب کے درمیان اپنی داخلی دنیا سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لیے ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' محض شہری زندگی کی منظر کشی نہیں بلکہ جدید انسان اور جدید تہذیب کا ایک گہرا فکری مطالعہ ہے۔ شہریار نے اس نظم کے ذریعے یہ احساس دلایا ہے کہ مادی ترقی اور ظاہری آسائشوں کے باوجود انسان کے اندر تنہائی، بے اطمینانی اور محرومی باقی رہ سکتی ہے۔ یہی فکری گہرائی اس نظم کو جدید اردو نظم میں ایک اہم مقام عطا کرتی ہے۔

19.2: نظم ''عہدِ حاضر کی دل ربا مخلوق'' کا متن

زرد بلبوں کے بازوؤں میں اسیر
سخت بے جان لمبی کالی سڑک

اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشتہ تقدیر

بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بلیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام

ہوٹلوں سینما گھروں کے قریب
چمچاتی ہوئی نئی کاریں

اور پنواڑیوں کی دوکانیں
اور کچھ ٹولیاں فقیروں کی

پرس والوں کے انتظار میں ہیں
ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن

آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر
کتنے دل کش دکھائی دیتے ہیں

بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی

آرزو غم امید محرومی
نیند کی گولیاں گلاب کے پھول

کیلے امردو سنترے چاول
پینٹ گڑیا شمیز چوہے دان

ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دل ربا مخلوق!

عہد حاضر کی دل ربا مخلوق

شہریار

زرد بلبوں کے بازوؤں میں اسیر
سخت بے جان لمبی کالی سڑک

اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشت ؟ تقدیر

بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بلیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام

ہوٹلوں سینما گھروں کے قریب
چمچاتی ہوئی نئی کاریں

اور پنواڑیوں کی دوکانیں
اور کچھ ٹولیاں فقیروں کی

پرس والوں کے انتظار میں ہیں
ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن

آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر
کتنے دل کش دکھائی دیتے ہیں

بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی

آرزو غم امید محرومی
نیند کی گولیاں گلاب کے پھول

کیلے امردو سنترے چاول
پینٹ گڑیا شمیز چوہے دان

ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دل ربا مخلوق!

18.2.1: نظم ''عہد حاضر کی دل ربا مخلوق'' کی تشریح

یہ نظم شہریار کی اہم نظموں میں سے ہے جس میں جدید شہری زندگی کی مصنوعی چمک، تنہائی، بے حسی، معاشی ناہمواری اور انسان کی مشینی زندگی کو نہایت علامتی اور تصویری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے شہر کی رات اور اس میں موجود مختلف مناظر کے ذریعے عہدِ حاضر کے انسان کی داخلی کیفیت کو نمایاں کیا ہے۔

(۱) زرد بلبوں کے بازوؤں میں اسیر
سخت بے جان لمبی کالی سڑک

اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشت تقدیر

تشریح: شاعر شہر کی ایک لمبی، سیاہ اور خاموش سڑک کا منظر پیش کرتا ہے۔ سڑک کے کناروں پر لگے ہوئے زرد بلب ایسے محسوس ہوتے ہیں جیسے ان کے بازوؤں نے سڑک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو۔ سڑک کو انسانی صفات دے کر شاعر اسے ایک زندہ وجود بنا دیتا ہے۔ یہ سڑک اپنی دھندلی اور بے نور آنکھوں سے اپنی تقدیر کو پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس منظر میں جدید شہری زندگی کی بے روحی اور بے بسی نمایاں ہے۔ سڑک سخت اور بے جان ہے، روشنی موجود ہونے کے باوجود ماحول تاریک اور افسردہ ہے۔ گویا جدید انسان بھی ظاہری روشنیوں کے باوجود اپنی زندگی کے مستقبل اور تقدیر کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہے۔

(۲)

بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بلیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام
ہوٹلوں سینما گھروں کے قریب
چمچاتی ہوئی نئی کاریں
اور پنواڑیوں کی دوکانیں
اور کچھ ٹولیاں فقیروں کی
پرس والوں کے انتظار میں ہیں

تشریح: ان اشعار میں شاعر شہر کے مختلف طبقوں اور متضاد زندگیوں کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بند اور تاریک کمروں میں بلیاں آرام سے دودھ پی رہی ہیں، جبکہ باہر شہر کی زندگی اپنی پوری رفتار سے جاری ہے۔ ہوٹلوں اور سینما گھروں کے قریب نئی اور چمکتی ہوئی کاریں موجود ہیں جو دولت، آسائش اور شہری تہذیب کی ظاہری چمک کی علامت ہیں۔ دوسری طرف پنواڑیوں کی معمولی دکانیں اور فقیروں کی ٹولیاں بھی موجود ہیں جو خوش حال لوگوں کے انتظار میں ہیں۔ یہاں شاعر نے امیری اور غریبی کے تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ ایک طرف آسائش اور تفریح ہے اور دوسری طرف غربت اور محتاجی۔ یہی جدید شہری معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے۔

(۳)

ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن
آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر
کتنے دل کش دکھائی دیتے ہیں

تشریح: شاعر نے بلند و بالا عمارتوں کو انسانی جسم اور پوسٹروں کو ان کا لباس قرار دیا ہے۔ ان عمارتوں پر لگے ہوئے آدھے پھٹے اور بوسیدہ پوسٹر ایک عجیب دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ یہاں ایک گہرا طنز بھی موجود ہے۔ جدید شہر کی بڑی اور مضبوط عمارتیں، جو ترقی اور طاقت کی علامت ہیں، ان کے جسموں پر پھٹے ہوئے اشتہارات موجود ہیں۔ اس سے شہری زندگی کی مصنوعی خوب صورتی اور اندرونی شکستگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ شہر ظاہراً حسین اور ترقی یافتہ ہے، لیکن اس کے اندر زوال اور بے ترتیبی موجود ہے۔

(۴)

بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزو غم امید محرومی
نیند کی گولیاں گلاب کے پھول
کیلے امردو سنترے چاول
پینٹ گڑیا شمیز چوہے دان
ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دل ربا مخلوق!

تشریح: نظم کے آخری حصے میں شاعر جدید انسان، خصوصاً شہری زندگی گزارنے والی عورت یا انسان کی ایک نہایت مؤثر تصویر پیش کرتا ہے۔ بس کی بے حس اور سخت نشستوں پر بیٹھا ہوا انسان دن بھر کے بازار سے خریدی ہوئی چیزوں کا حساب کر رہا ہے۔ ان چیزوں میں صرف ضروریاتِ زندگی ہی شامل نہیں بلکہ آرزو، غم، امید اور محرومی بھی شامل ہیں۔

یہ ایک انتہائی معنی خیز علامت ہے۔شاعر بتاتا ہے کہ جدید انسان کی زندگی بازار سے اس حد تک وابستہ ہوگئی ہے کہ اس کے جذبات بھی گویا خرید وفروخت کی چیزیں بن گئے ہیں۔نیند کی گولیاں ذہنی اضطراب اور بے سکونی کی علامت ہیں، گلاب کے پھول حسن اور محبت کی علامت ہیں، جبکہ پھل، چاول اور کپڑے روزمرہ زندگی کی ضروریات کو ظاہر کرتے ہیں۔گڑیا، چوہے دان اور دیگر اشیا انسانی زندگی کی چھوٹی بڑی ضرورتوں اور مصروفیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔آخر میں شاعر طنزیہ انداز میں اسے "عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق" کہتا ہے۔بظاہر یہ انسان دل کش اور جدید زندگی کا نمائندہ ہے، لیکن حقیقت میں وہ خواہشوں، محرومیوں، ضروریات اور بازار کی گرفت میں الجھا ہوا ایک بے چین وجود ہے۔

19.2.2: نظم ''عہد حاضر کی دل ربا مخلوق'' کی خصوصیات

اس نظم کا مرکزی خیال عہدِ حاضر کی شہری اور مشینی زندگی کی تصویر کشی ہے۔شاعر نے شہر کی چمک دمک کے پیچھے چھپی ہوئی تنہائی، بے حسی، طبقاتی تفاوت، محرومی اور ذہنی اضطراب کو نمایاں کیا ہے۔جدید انسان ظاہراً ترقی یافتہ اور آسائشوں سے گھرا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن اندر سے وہ بے سکونی، محرومی اور الجھن کا شکار ہے۔شاعر کے نزدیک جدید شہری تہذیب نے انسان کو سہولتیں تو فراہم کی ہیں، مگر اس سے اس کی زندگی زیادہ مصنوعی، بے روح اور پریشان ہوگئی ہے۔

فنی خصوصیات: نظم آزاد نظم کے انداز میں لکھی گئی ہے۔شہریار نے جدید شہر کی زندگی کی علامتی اور تصویری عکاسی کی ہے۔نظم میں تشخیص کا خوب صورت استعمال ہے، مثلاً سڑک کو آنکھوں والا اور تقدیر پڑھنے والا وجود قرار دیا گیا ہے۔استعارہ اور علامت کا استعمال نمایاں ہے۔نظم میں شہری زندگی کے مختلف مناظر ایک فلمی مونتاژ کی طرح یکے بعد دیگرے سامنے آتے ہیں۔امیری اور غریبی کے تضاد کے ذریعے معاشرتی حقیقت نگاری پیدا کی گئی ہے۔آخری مصرع "عہد حاضر کی دل ربا مخلوق!" میں گہرا طنز پوشیدہ ہے۔زبان سادہ ہونے کے باوجود معنی کی کئی پرتیں رکھتی ہے۔نظم جدید انسان کی جذباتی تنہائی اور بازاریت کو مؤثر انداز میں پیش کرتی ہے۔

مختصراً، یہ نظم جدید شہری تہذیب کی چمکتی ہوئی مگر اندر سے افسردہ اور بے روح دنیا کا ایک مؤثر مرقع ہے، جس میں انسان اپنی خواہشوں، محرومیوں اور روزمرہ ضروریات کا حساب کرتے کرتے خود ایک مشینی وجود بن گیا ہے۔شہریار کی یہ نظم جدید شہری زندگی، مادّی تہذیب، تنہائی، محرومی اور مشینی طرزِ حیات کی عکاسی کرتی ہے۔نظم میں شہر کی سڑکوں، عمارتوں، ہوٹلوں، سینما گھروں، بازاروں، گاڑیوں اور روزمرہ استعمال کی مختلف اشیا کے ذریعے عہدِ حاضر کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔نظم کا متن اور عنوان شہریار سے منسوب مستند ماخذ میں بھی موجود ہے۔

19.3: سرگرمی: آؤ اپنی معلومات جانچیں

1۔ ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) ن۔م۔راشد (ب) میراجی

(ج) شہریار (د) اختر الایمان

2۔ نظم میں سڑک کو کس حالت میں دکھایا گیا ہے؟

(الف) روشن اور خوب صورت (ب) بے جان اور کالی

(ج) سنسان اور سفید (د) سرسبز اور کشادہ

3۔ نظم میں فقیر کس کے انتظار میں ہیں؟

(الف) مسافروں کے (ب) گاڑیوں کے

(ج) پرس والوں کے (د) دکانداروں کے

4۔ نظم میں آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر کیا دکھائی دیتا ہے؟

(الف) پھول (ب) ادھ پھٹے پوسٹر

(ج) روشنیاں (د) کھڑکیاں

5۔ نظم کے آخر میں عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق کیا کر رہی ہے؟

(الف) سو رہی ہے (ب) سفر کر رہی ہے

(ج) ایک ایک شے کا حساب کر رہی ہے (د) کتاب پڑھ رہی ہے

19.4: عمومی جائزہ

''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' شہریار کی ایک معنی خیز جدید نظم ہے جس میں شاعر نے عصرِ حاضر کی شہری زندگی کی ظاہری چمک دمک اور

اس کے اندر موجود بے حسی، تنہائی، محرومی اور ذہنی دباؤ کو تصویری انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کے آغاز میں شاعر ایک لمبی، کالی اور بے جان سڑک کا منظر پیش کرتا ہے جو زرد بلبوں کی روشنی میں اپنی دھندلی آنکھوں سے گویا اپنا نوشتہ؟ تقدیر پڑھ رہی ہے۔ اس منظر سے جدید شہر کی اداسی اور بے روح فضا نمایاں ہوتی ہے۔ نظم میں بند کمروں کے اندھیرے، ہوٹل، سینما گھر، نئی چمکتی کاریں، پانواڑیوں کی دکانیں اور فقیروں کی ٹولیاں شہری معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ شاعر نے جدید شہر کی ظاہری خوب صورتی کے ساتھ اس کے تضادات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ایک طرف چمچماتی نئی کاریں اور بڑی آہنی عمارتیں ہیں، دوسری طرف فقیروں کے گروہ ہیں جو صاحبِ حیثیت لوگوں کے منتظر ہیں۔ عمارتوں پر لگے ہوئے ادھ پھٹے پوسٹر بھی جدید تہذیب کی ظاہری آرائش اور داخلی شکستگی کی علامت بن جاتے ہیں۔

نظم کے آخری حصے میں شاعر بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی ایک ایسی عورت کا نقشہ پیش کرتا ہے جو دن بھر بازار سے خریدی گئی مادی اشیا کے ساتھ ساتھ گویا اپنی آرزو، غم، امید اور محرومی کا بھی حساب کر رہی ہے۔ اس کے پاس نیند کی گولیاں، پھول، پھل، چاول، کپڑے، گڑیا اور دوسری گھریلو چیزیں ہیں۔ شاعر اس کردار کو طنزیہ اور علامتی انداز میں ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' قرار دیتا ہے۔ یہ عورت دراصل صرف ایک فرد نہیں بلکہ جدید شہری انسان، بالخصوص متوسط طبقے کی زندگی کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ جدید انسان بازار، ضروریات، خواہشات، آسائشوں اور محرومیوں کے درمیان اس قدر الجھ گیا ہے کہ اس کی داخلی زندگی بھی خرید و فروخت اور حساب کتاب کا حصہ بن گئی ہے۔ شہریار نے بہت کم الفاظ میں جدید تہذیب کی بے حسی، صارفیت، معاشرتی تفاوت، تنہائی اور انسانی رشتوں کے کمزور ہوتے ہوئے احساس کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔

19.5: فرہنگ

1۔ زرد : پیلا

2۔ اسیر : قیدی، گرفتار

3۔ بے نور : روشنی سے محروم

4۔ دھندلی : غیر واضح، مدھم

5۔ نوشتہ تقدیر : قسمت میں لکھی ہوئی بات

6۔ گھپ : بہت گہرا، انتہائی تاریک

7۔ چمچماتی : بہت زیادہ چمکتی ہوئی

8۔ پانواڑی : پان فروخت کرنے والا

9۔ ٹولیاں : چھوٹے چھوٹے گروہ

10۔ فقیر : محتاج، بھکاری

11۔ ادھ پھٹے : آدھے پھٹے ہوئے

12۔ پیراہن : لباس، پوشاک

13۔ آہنی : لوہے کا، سخت

14۔ دلکش : خوب صورت، دل کو بھانے والا

15۔ بے حس : احساس سے عاری

16۔ نشست : بیٹھنے کی جگہ، سیٹ

17۔ آرزو : خواہش، تمنا

18۔ محرومی : کسی چیز سے محروم رہنے کی کیفیت

19۔ شمیض : قمیض نماز نانہ لباس یا زیر جامہ

20۔ شے : چیز

19.6: نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ شہریار کی نظم ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' کا مرکزی خیال تفصیل سے بیان کیجیے۔

2۔ اس نظم میں جدید شہری زندگی کی بے حسی اور تنہائی کی عکاسی کس طرح کی گئی ہے؟

3۔ نظم میں پیش کیے گئے شہر کے مناظر کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی علامتی اہمیت بیان کیجیے۔

4۔ ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' میں صارفیت اور مادی تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ نظم کے عنوان ''عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق'' کی معنویت واضح کیجیے۔

19.7: مشقی سوالات

1۔ نظم میں سڑک کی تصویر کس انداز سے پیش کی گئی ہے؟

2۔ شاعر نے نئی کاروں اور فقیروں کو ایک ہی منظر میں پیش کر کے کس معاشرتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟

3۔ آہنی بلڈنگوں پر لگے ادھ پھٹے پوسٹر کس کیفیت کی علامت ہیں؟

4۔ نظم کے آخری حصے میں عورت کن مادی اور جذباتی چیزوں کا حساب کرتی دکھائی دیتی ہے؟

19.8: جوابات سرگرمی

1۔ (ج) شہریار

2۔ (ب) بے جان اور کالی

3۔ (ج) پرس والوں کے

4۔ (ب) ادھ پھٹے پوسٹر

5۔ (ج) ایک ایک شے کا حساب کر رہی ہے

19.8.1: مشقی سوالات کے جوابات۔

1۔ نظم میں سڑک کی تصویر کس انداز سے پیش کی گئی ہے؟

جواب: نظم میں سڑک کو محض آمد و رفت کے راستے کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ اسے ایک جیتے جاگتے کردار کی صورت دی گئی ہے۔ شاعر اسے سخت، بے جان، لمبی اور کالی سڑک قرار دیتا ہے جو زرد بلبوں کی روشنی میں اپنی بے نور اور دھندلی آنکھوں سے اپنا نوشتہ؟ تقدیر پڑھ رہی ہے۔ اس منظر کے ذریعے شاعر جدید شہری زندگی کی اداسی، بے روحی اور تنہائی کو ظاہر کرتا ہے۔ سڑک کا بے جان ہونا دراصل جدید انسان کی داخلی بے حسی کی بھی علامت ہے۔

2۔ شاعر نے نئی کاروں اور فقیروں کو ایک ہی منظر میں پیش کر کے کس معاشرتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟

جواب: شاعر نے ایک طرف ہوٹلوں اور سینما گھروں کے قریب چمچماتی نئی کاریں دکھائی ہیں اور دوسری طرف فقیروں کی ٹولیاں صاحبِ حیثیت لوگوں کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ اس تضاد کے ذریعے معاشرے میں موجود معاشی ناہمواری کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک طبقہ آسائشوں اور جدید سہولیات سے لطف اندوز ہو رہا ہے جبکہ دوسرا طبقہ بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہے۔ یوں شاعر جدید تہذیب کی چمک دمک کے پس منظر میں موجود غربت اور محرومی کو بے نقاب کرتا ہے۔

3۔ آہنی بلڈنگوں پر لگے ادھ پھٹے پوسٹر کس کیفیت کی علامت ہیں؟

جواب: آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر لگے ادھ پھٹے پوسٹر جدید شہری تہذیب کی ظاہری خوب صورتی اور باطنی شکستگی کی علامت ہیں۔ بلند و بالا عمارتیں ترقی، طاقت اور مادّی خوش حالی کا اظہار کرتی ہیں، لیکن ان پر موجود پھٹے ہوئے پوسٹر اس ترقی کے پیچھے چھپی بے ترتیبی، زوال اور بے حسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شاعر اس منظر کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جدید شہر بظاہر دلکش ہے لیکن اس کی داخلی زندگی کئی طرح کے تضادات سے بھری ہوئی ہے۔

4۔ نظم کے آخری حصے میں عورت کن مادی اور جذباتی چیزوں کا حساب کرتی دکھائی دیتی ہے؟

جواب: نظم کے آخری حصے میں بس کی نشست پر بیٹھی عورت دن بھر بازار سے حاصل ہونے والی چیزوں کا حساب کرتی دکھائی دیتی ہے۔ شاعر مادی اشیا کے ساتھ آرزو، غم، امید اور محرومی جیسے جذبات کو بھی شامل کرتا ہے۔ نیند کی گولیاں، گلاب کے پھول، کیلے، امرود، سنترے، چاول، پینٹ، گڑیا، شمیض اور چوہے دان جیسی مختلف چیزیں اس کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ اس فہرست میں جذبات اور اشیا کو ایک ساتھ رکھ کر شاعر نے بڑی خوب صورتی سے بتایا ہے کہ جدید زندگی میں انسانی خواہشات اور احساسات بھی گویا بازار اور حساب کتاب کا حصہ بن گئے ہیں۔

19.9 :امدای کتب

1۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری

3۔ جدیدیت، تفہیم و تجزیہ — مظفر حنفی

4۔ جدید اردو ادب — آل احمد سرور

5۔ اردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم — پروفیسر حنیف نقوی

6۔ انجمنِ پنجاب اور اردو ادب — ابواللیث صدیقی

7۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — مرتب: ڈاکٹر ندیم احمد

8۔ آزادی کے بعد اردو نظم — مرتب: مظہر امام

9۔ منتخب نظمیں — ڈاکٹر ابنِ کنول

10۔ منتخب نظمیں — اتر پردیش اردو اکادمی

ماڈل سوالیہ پرچہ

For

MA URDU Semester-III

Course Code:URD 303 **Time Allowed 2½ Hours**

Course Title: Study of Nazm-e-Jadeed **M.M:70**

نوٹ: تمام سوالات کے جواب دیجیے۔سوال نمبر 1 تا 6 میں دی گئی داخلی پسند میں سے کسی ایک سوال کا جواب دیجیے۔سوال نمبر 7 کے تمام معروضی سوالات حل کرنا لازمی ہیں۔

سوال نمبر1: جدید اردو نظم کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی اہم فکری اور فنی خصوصیات بیان کیجیے۔ 7

یا

انجمنِ پنجاب لاہور نے جدید اردو نظم کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال نمبر2: ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد بیان کرتے ہوئے جدید اردو نظم کے ارتقا میں اس تحریک کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔ 7

یا

نظیر اکبر آبادی کی نظم ,, آدمی نامہ'' کے مرکزی خیال، موضوع اور فنی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر3: حالی کی نظم ,, مناجاتِ بیوہ'' کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے موضوع، سماجی شعور، جذبات نگاری اور زبان و بیان کی خصوصیات پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔ 14

یا

اکبر الہ آبادی کی نظم ''کرزن سبھا'' اور علامہ اقبال کی نظم ''خضرِ راہ'' کے متن کا مطالعہ کرتے ہوئے دونوں نظموں کے فکری و فنی پہلوؤں کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر4: حلقہ اربابِ ذوق، جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے جدید اردو نظم کے موضوعات، اسلوب اور طرزِ اظہار کو کس طرح متاثر کیا؟

تفصیلی جائزہ لیجیے۔ 14

یا

اردو نظم میں ہیئت کے نئے تجربات کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد نظم، نظمِ معرّیٰ، ہائیکو، ترائیلے اور ترینی کی خصوصیات اور اردو شاعری میں ان کی اہمیت واضح کیجیے۔

سوال نمبر 5: فیض احمد فیضؔ کی نظم ,, صبحِ آزادی'' کے مرکزی خیال اور فکری وفنی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔ 7

یا

مخدوم محی الدین کی نظم ,, چارہ گر'' کے موضوع، علامتوں اور شعری اسلوب پر مختصر مگر جامع نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر 6: ن۔م۔راشد کی نظم ,, حسن کوزہ گر'' میں علامت، کردار اور جدید انسانی احساسات کی عکاسی پر روشنی ڈالیے۔ 7

یا

اختر الایمان کی نظم ''باز آمد'' یا شہریار کی نظم ''عہدِ حاضر کی دلربا مخلوق'' میں سے کسی ایک نظم کے مرکزی خیال اور فنی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر 7: معروضی سوالات 14

درج ذیل سوالات میں درست جواب کا انتخاب کیجیے۔ ہر سوال 1 نمبر کا ہے۔

1۔ نظم ''آدمی نامہ'' کس ہیئت میں ہے؟

(الف) مربع (ب) مخمس

(ج) مسدس (د) مثمن

2۔ ''مناجاتِ بیوہ'' کس شاعر کی نظم ہے؟

(الف) حالیؔ (ب) جوشؔ ملیح آبادی

(ج) فیض احمد فیضؔ (د) میراجی

3۔ ''کرزن سبھا'' کے خالق کون ہیں؟

(الف) علامہ اقبالؔ (ب) اکبرالہ آبادی

(ج) نظیرؔ اکبرآبادی (د) ن۔م۔راشدؔ

4۔ نظم ''خضرِ راہ'' اقبالؔ کے کس شعری مجموعے میں شامل ہے؟

(الف) بانگ درا (ب) بال جبریل

(ج) ضربِ کلیم (د) ارمغان حجاز

5۔ نظم ''کسان'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) جوش ملیح آبادی (ب) فیض احمد فیض

(ج) اختر الایمان (د) شہریار

6۔ انجمنِ پنجاب کا جدید اردو نظم کے ارتقا میں بنیادی تعلق کس شہر سے ہے؟

(الف) دہلی (ب) لکھنؤ

(ج) لاہور (د) حیدرآباد

7۔ حلقہ اربابِ ذوق کا آغاز کس شہر میں ہوا؟

(الف) لاہور (ب) دہلی

(ج) علی گڑھ (د) پٹنہ

8۔ ''صبحِ آزادی'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) مخدوم محی الدین (ب) فیض احمد فیض

(ج) میراجی (د) ن۔م۔راشد

9۔ ''چارہ گر'' کس شاعر کی نظم ہے؟

(الف) شہریار (ب) اختر الایمان

(ج) مخدوم محی الدین (د) جوش ملیح آبادی

10۔ ''سمندر کا بلاوا'' کے خالق کون ہیں؟

(الف) میراجی (ب) ن۔م۔راشد

(ج) فیض احمد فیض (د) اختر الایمان

11۔ ''حسن کوزہ گر'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) میراجی (ب) ن۔م۔راشد

(ج) شہریار (د) مخدوم محی الدین

12۔ ''بازآمد'' کس شاعر کی نظم ہے؟

(الف) اختر الایمان (ب) ن۔م۔راشد

(ج) میراجی (د) فیض احمد فیض

13۔ ''عہدِ حاضر کی دلربا مخلوق'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) اختر الایمان (ب) شہریار

(ج) جوش ملیح آبادی (د) حالی

14۔ ہائیکو، ترائیلے اور ترویني کا تعلق بنیادی طور پر کس پہلو سے ہے؟

(الف) داستان نگاری سے (ب) نظم کی ہیئت کے تجربات سے

(ج) مرثیہ نگاری سے (د) قصیدہ نگاری سے

M.A SEMESTER - III (STUDY OF NAZM-E-JADEED) COURSE CODE URD-303

Course Contributors and Content Editing:

Dr. Ajaz Hussain Shah
Assistant Professor,
Govt.PG College Rajouri

Dr. Parshotam Paul Singh
Assistant professor,
Department of Urdu. CDOE.
University of Jammu

Content Editing/ Proofreading

Dr. Parshotam Paul Singh
Assistant professor,
Department of Urdu. CDOE.
University Of Jammu, Jammu.

© Centre for Distance & online Education, University of Jammu, 2026

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the CDOE, University of Jammu.
* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the CDOE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By : Rahul Army Printers/ 2026/100 Nos.

CENTRE FOR DISTANCE & ONLINE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU

SELF LEARNING MATERIAL

FOR

M.A. URDU

SEMESTER - III

SESSION - 2025 ON WARDS

SUBJECT: Study of Nazm-E-Jadeed — UNIT I-IV

COURSE CODE URD - 303 — LESSONS: 1-19

PROF. (DR.) SHOHAB INAYAT MALIK
COORDINATOR P.G. URDU

DR. PARSHOTAM PAUL SINGH
TEACHER INCHARGE Urdu

http:/www.distanceeducationju.in

Printed and published on behalf of the centre for Distance & Online Education, University of Jammu by the Director, CDOE, University of Jammu.